مزاح بخیر

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

اگر آپ ٹھیک فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو اس مسئلے پر بیوی سے مشورہ کریں اور وہ جو مشورہ دے اس کے الٹ کریں، یہ انتساب ان بیویوں کے نام جو مشکل صورت حال میں صحیح فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

فہرست

مزاح بخیر

گل دستہ

بابا جمہورا

ملا نصیر الدین

مسلح افواج کے سربراہ

پان کا بادشاہ

اصغر اعظم

مولانا دستار نیازی

شی مین

شکاری

گل خان

پکاسو کی بیوہ

عروس العلماء

ملا دو پیازہ

مس پریشانی

سٹیل مین

مسز مسلم لیگ

IqbalCyberLibrary
All rights reserved
©2002-2006

سندھی گاندھی

شوہر اعظم

علامہ فی الفور

مریض الملت مہاجر حسین

خندہ پیش آنیاں

خندہ پیش آنیاں

ازبک بک

گم سم

مشتم

ارال سی۔ سی تھرو

بہوؤں کی بغاوت

ویشائی ریاستیں

زن افشاں

شر۔آب

جمیلہ حقوق

Clock- wise

مس اردو

مہ شکل۔مشکل

لوہے کی عورت

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

م ح ب ت

مزاج پرسی

بابائے لطیفہ

ماہر امراض طوطا چشم

بیگم ڈول اور بیگم ڈانواں ڈول

بیوٹی سنڈروم

مولانا زلزلہ

(مسلح شاعری

آلات موسیقی

حسین ہونا منع ہے)

ضرورت سر رشتہ

انتظاریہ

خواجہ سگ پرست

بیمارستان

ملکہ غزل

Holyoays inn

و۔زیر بیان

حواشاری

ا۔دبی حکومت

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

و۔ ردی

علم فی کلوگرام

دولہو کا ملک

اواستان

سراسر گذشت

سربرہنان مملکت

دیوار خواتین

نعلین در بغلین

ملکہ افسانہ

مساۃ قومی یکجہتی

فرزند جیل

حقہ شاہی

کتا فیم

ورلڈ گپ

نوک جوک

شراب الملک

جنون ایلیا

مہاتما یدھ

wise and otherwise

پاکستان میرج پارٹی

سپاہ سنگیت

عارضی عارضہ

چندہ ماموں

آپریشن کلین شو

مولانا مسلسل

قابلیت اور کابلیت

دفع 62!

زنان دان

دلداریاں

Bitter Half

لنگوٹی ازم

حلوہ بمقابلہ جلوہ

See Port

آ......داب

باپ رے باپ

جلوس پیا

جوا......نی

خوشامدید

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006 اقبال اکادمی سائبر لائبریری

دختر مشرق (فلمی) دختر مشرق (غیر فلمی)

4پائی

زیبا نازیبا

ا.....حوالات

پولیس مقابلہ حسن

قلم درازیاں

آٹو زبائیو گرافی

مسرت شاہین بمقابلہ فضل الرحمٰن

ادبی سونگھ بوجھ

غل دستہ

بابا جمہورا

بابا جمہورا کو میں بزرگ سیاست دان اس لیے نہیں کہتا کہ وہ خود بزرگ ہوں تو ہوں، اس کی سیاست میں ابھی لڑکپن ہے۔ اس وقت سے سیاست میں ہیں جب انہوں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سیاست میں نو وارد ہیں۔ اتنے بڑے سیاست دان ہیں کہ اکیلے اپنی پارٹی میں پورے نہیں آسکتے۔ سو دوسری پارٹیوں سے اشتراک کر کے اپنے رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں اقلیتوں کا رہنما مانتے ہیں۔ ویسے ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد دیکھ لیں تو آپ بھی مان جائیں گے۔

ہمارے ہاں آج کل اگر آپ اپنا شجرِ نسب اور سارا خاندانی کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہیں، سیاست میں آ جائیں۔ مخالفین خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کے دادا پڑ دادا کیا کیا کرتے رہے۔ نوابزادہ صاحب نے سیاست کو عبادت بنا دیا ہے، جس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ وہ سیاست کو کیا سمجھتے ہیں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عبادت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی میں ان کی پیدائش کے علاوہ کوئی غیر سیاسی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہ تو صبح اٹھ کر ایک سیب بھی یوں کھاتے ہیں جیسے اپنی صحت کے لیے نہیں، جمہوریت

کی صحت کے لیے کھا رہے ہوں۔ ان کی تو چھینک تک غیر سیاسی نہیں ہوتی۔ تشدد کے اس قدر خلاف کہ سکول میں ضرب سے کنی کتراتے۔ تقسیم تو کبھی کی ہی نہیں۔ البتہ جمع ایسی کرتے کہ حساب کا ماسٹر بے حساب داد دیتا۔ ذہین اتنے کہ جس روز ماسٹر شیو بڑھائے بغیر استری کے کپڑے پہن کر کلاس میں آتا، انہیں فوراً پتہ چل جاتا کہ آج ماسٹر صاحب اردو شاعری پڑھائیں گے۔ مزاج ایسا جمہوری کہ ایچی سن کالج میں کرکٹ کھیلتے وقت فیلڈنگ کے دوران اسی گیند کو پکڑنے بھاگتے جس کی طرف سب سے زیادہ کھلاڑی بھاگتے۔

پیر پگاڑہ نواب زادہ کو نابالغ سیاست کہتے ہیں۔ ان کے بقول نواب زادہ کا مطلب ہی نواب کا لڑکا ہوتا ہے۔ اصغر خان فرماتے ہیں نواب زادہ صاحب ۸۰ فیصد شاعری اور ۲۰ فیصد سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے سیاست اور اپنی شاعری کی کتاب کا نام جمہوریت رکھا۔ ایک صاحب سے کہا۔ دیکھیں یہ نام ٹھیک ہے یا بدل دوں؟ اس نے ان کی شاعری پڑھ کر کہا نام تو ٹھیک ہے 'شاعری بدل دیں'۔

حقہ اور نواب زادہ صاحب اس قدر لازم وملزوم ہیں کہ دونوں کی شخصیت ٹوپی کی بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مادر ملت فاطمہ جناح نے ایک بار کہا تھا نواب زادہ نصر اللہ حقے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ ان کے پاس حقہ نہ بھی ہو تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ حقے کی نَے منہ میں یوں دبائے ہوتے ہیں جیسے مخالف کی گردن۔ وہ حکم عدولی برداشت کر لیتے ہیں مگر حقہ عدولی نہیں۔ حقہ وہ ساتھی ہے جو اس وقت بولتا ہے۔ جب آپ چاہتے ہیں۔ مارشل لاء کے دنوں میں جب کوئی نہیں بولتا، حقہ پھر بھی بولتا ہے۔ حقہ اجتماعیت کی علامت ہے اور سگریٹ الگ الگ کرنے کی۔

وہ سیاست کا حقہ ہے جس کے گرد کئی پارٹیاں کش لگا رہی ہیں۔ ان کی پسندیدہ موسیقی تازہ حقے کی آواز ہے۔ وہ حقہ نہ بھی پی رہے ہوں، پھر بھی دھواں دیتے ہیں۔ سگار بھی پیتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سگار صرف پیے جا سکتے ہیں کھانے جانے سے تو رہے۔

کھانے میں مچھلی پسند ہے۔ مچھلی اور سیاست دانوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں سانس لینے کے لیے منہ کھولتے ہیں۔ البتہ ایک مچھلی پورے جل کر گندا کر دیتی ہے مگر دو سیاست مل کر بھی یہ نہیں کر سکتے، البتہ نہ مل کر کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کے لیے کوششیں کرنے والوں کو جو پھل ملتا ہے۔ وہ نواب صاحب کے باغ کے آم ہوتے ہیں جو عام نہیں ہیں۔ ہمیں تو آم میں یہی خوبی لگتی ہے کہ یہ کھایا بھی جا سکتا ہے اور پیا بھی۔ انہیں سنترہ بھی اچھا لگتا ہے مگر ہمیں تو یہ سنتری کا ندکر لگتا ہے۔

نواب زادہ صاحب کئی دہائیوں سے وہی کر رہے ہیں، جس کی دہائی آج دے رہے ہیں، وہ ہے اتحاد بنانا۔ ہر حکومت کے خلاف اتحاد بناتے ہیں۔ جس حکومت کے خلاف اتحاد نہ بنائیں، اس میں اتحاد نہیں رہتا۔ ان کا بنایا اتحاد اتنا پائیدار ہوتا ہے کہ اب تو لوگ انہیں اپنے بچوں کی شادیوں پر بھی بلانے لگے ہیں تا کہ نو مود اتحاد اٹوٹ ہو۔ ان کی طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کہتا ہے: تین دن تک نہار منہ اتحاد بنائیں، انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ ہاتھوں اور لوگوں کو جوڑتے رہتے ہیں۔ قوالی پسند ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اس میں بہت سے لوگ اتحاد کر کے یوں گاتے ہیں کہ کسی ایک کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی۔ قوالی بندہ فاصلے

سے سننے تو بہت مزہ آتا ہے۔ یعنی اتنے فاصلے سے جہاں تک آواز نہ آتی ہو۔

سیاست کو انہوں نے کبھی دکان نہیں سمجھا۔ ویسے بھی سیاست میں دکان تو کیا، ایک کان کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ زبان چاہیے اور ان کی زبان ایسی ہے کہ اتنی ان کی منہ میں نہیں رہتی، جتنی صحافیوں کے کانوں میں رہتی ہے۔ ان کی تقریر بہرے بھی سمجھ جاتے ہیں کیونکہ اتنا منہ سے نہیں، جتنا ہاتھوں سے بولتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب سوچ کر دیتے ہیں۔ نام تک پوچھیں تو سوچ میں پڑ جائیں گے۔ گفتگو کا ایسا انداز کہ بندہ بات سننے سے پہلے ہی کنونس ہو جائے۔ شاید کنونس ہونے کی وجہ بھی یہی ہو۔ ویسے ہم ایک ایسے سیاست دان کو جانتے ہیں جو روز کنوینسنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد آخر ان سے ایک خاتون کنونس ہو ہی گئیں۔ اب وہ ماشاءاللہ ان کے بچوں کی ماں ہے۔ نواب صاحب کی تقریر کا آغاز اور انجام تقریر کو دلکش بنا دیتا ہے۔ تقریر اور بھی دلکش بن سکتی ہے بشرطیکہ اختتام آغاز سے پہلے کا ہو۔

وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جو عوام کے نمائندہ نہیں، سیاست دانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے سیاست دان جو کام سب سے زیادہ کرتے ہیں، وہ غور ہے۔ نواب صاحب پوزیشن بنا کر نہیں، اپوزیشن بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ پیدائشی حزب اختلاف ہیں۔ اب تو ان کی اس عادت کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ اگر وہ کسی بات پر فوراً متفق ہو جائیں تو لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔ گھڑسواری کرتے ہیں۔ اب بھی کرسی پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دائیں ٹانگ سے کرسی کو ایڑ لگا

رہے ہوتے ہیں۔ٹانگ اس قدر پسند ہے کہ کھانے میں مچھلی کا بھی لیگ پیس ہی مانگتے ہیں۔ مارک ٹوئن نے کہا ہے صحت مند رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ کھاؤ جو آپ پسند نہیں، وہ پیو جو آپ نہیں چاہتے اور وہ کرو جو آپ ویسے کبھی نہ کرتے۔ اس حساب سے انہوں نے کبھی صحت مند رہنے کی کوشش نہیں کی۔ پرانی چیزیں دیکھنا پسند ہیں، اس لیے کمرے میں شیشہ ضرور رکھتے ہیں۔ اپنی چیزیں نہیں بدلتے۔ان کا وہ برش جس سے شیو کرتے وقت صابن لگاتے ہیں، اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔ جمہوریت میں مارشل لاء کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ مارشل لاء میں جمہوریت کی راہ بناتے ہیں اور ہمیشہ راہ میں ہی رہتے ہیں۔حکومت میں بھی نہیں رہے کیونکہ کبھی عہدہ ان سے بڑا ہوتا ہے اور کبھی وہ عہدے سے بڑے نکلتے ہیں۔مظفر گڑھ جو کبھی ان کا گڑھ تھا، اب ان کے لیے گڑھا بن گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے جنازے پر نہ گئے مگر غفار خان کے جنازے پر گئے، جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سرحدی گاندھی غفار خان کے جنازے پہ یقین کرنے گئے تھے کہ واقعی سرحدی گاندھی غفار خان مر گئے ہیں۔

مزاج ایسا کہ سردیوں میں گرمیاں اور گرمیوں میں سردی چاہتے ہیں۔صحافی ان کے پاس خبر لینے یوں جاتے ہیں جیسے ان کی خبر لینے جا رہے ہوں۔بھینس پالنے کا شوق ہے۔سنا ہے جو بھینس پالتے ہیں، وہ اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ اس قدر وضع دار کہ جس جگہ ایک بار پاؤ پھسلا۔ جب بھی وہاں سے گزرے، پھسل کر ہی گزرے۔ان کی پوری زندگی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاست بچوں کا کھیل نہیں، بوڑھوں کا ہے۔

ملاّ نصر الدین

ساری دنیا انہیں پیر سمجھتی ہے مگر وہ خود کو پیر نہیں، جوان سمجھتے ہیں۔ دیکھنے میں سیاست دان نہیں لگتے اور بولنے میں پیر نہیں لگتے۔ قد اتنا ہی بڑا، جتنے لمبے ہاتھ رکھتے ہیں۔ چلتے ہوئے پاؤں یوں احتیاط سے زمین پر رکھتے ہیں کہ کہیں بے احتیاطی سے مریدوں کی آنکھیں نیچے نہ آجائیں۔ اتنا خود نہیں چلتے، جتنا دماغ چلتا ہے۔ دور سے یہی پتہ چلتا ہے کہ چل رہے ہیں۔ یہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا، آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں۔ سیاست میں ان کا وہی مقام ہے جو اردو میں علامتی افسانے کا۔ خاندان کے پہلے صبغۃ اللہ اول کے سر پر پگ باندھی گئی اور وہ پہلے پارگاہ پیر کہلائے۔ یہ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جس کی چشم بھی چراغ ہے۔ بچپن ہی سے پردے کے اس قدر حق میں تھے کہ 1944ء میں جب کراچی ریلوے اسٹیشن سے انگلینڈ روانہ ہوئے تو پردے کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جا رہے ہیں یا جا رہی ہیں۔ 1952ء میں یوں پاکستان کو واپس آئے، جیسے پاکستان کو واپس لائے ہوں۔ کسی نے کہا ''انگلینڈ وہ جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ دھند ہوتی ہے'' کہا: ''اتنی دھند تھی کہ جگہ نظر ہی نہ آئی''۔

پہلے کالعدم مسلم لیگ کے صدر بنے، پھر مسلم لگی کے کالعدم صدر بنے۔ پھر مسلم لیگ بن گئے۔ اب اس لیے دوڑ رہے ہوتے ہیں اور سانس مسلم لیگ کی پھولنے لگتی ہے۔ وہ بڑے پائے کے سیاست دان ہیں، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ''چھوٹے پائے'' کے سیاست دان ہوتے ہی نہیں، حالانکہ

چھوٹے پائے مہنگے ہوتے ہیں۔وہ پاکستانی سیاست کی اقوام متحدہ ہیں اور اقوام متحدہ وہ جگہ ہے جہاں دو چھوٹے ملکوں کا مسئلہ ہو تو مسئلہ غائب ہو جاتا ہے۔ چھوٹی اور بڑی قوم کا مسئلہ ہو تو چھوٹی قوم غائب ہو جاتی ہے۔اور اگر دو بڑی قوموں کا مسئلہ ہو تو اقوام متحدہ غائب۔

خود کو جی ایچ کیو کی کیو میں کھڑا کرتے ہیں۔جی ایچ کیو انہیں اتنا پسند ہے کہ ہمیں تو ''جی ایچ کیو'' سے مراد ''جی حضوری کرنا'' لگتا ہے۔وہ مسلم لیگ کے خادم نہیں، خاوند ہیں اور مسلم لیگ ان کی بیوہ ہے۔ان کے بیان پڑھ کر لگتا ہے جیسے ان کا تعلق محکمہ بندی سے ہے۔شاید وہ اس لیے بار بار منصوبہ بندی پر زور دیتے ہیں کہ ابھی سات ماہ بھی ہوتے اور نئی مسلم لیگ کی ولادت ہو جاتی ہے۔

دوران گفتگو جہاں پتہ چلے کہ دوسرا ان کی بات سمجھ رہا ہے فوراً بات بدل دیتے ہیں۔آدھا دن وہ کہتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں اور باقی آدھا دن وہ سنتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔فقرہ یوں ادا کرتے ہیں جیسے بل ادا کر رہے ہوں۔جس موضوع پر دوسرے ہائے ہائے کر رہے ہوں۔یہ ہائے کہہ کر گزر جاتے ہیں۔کسی کی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔مگر چاہتے ہیں ان کی بات پرواہ کی جائے۔لوگ ان کو ملنے سے پہلے وضو کرتے ہیں۔وضو تو دوسرے سیاست دانوں سے ملنے والوں کو بھی کرنا پڑتا ہے۔مگر ملنے کے بعد۔جانوروں کی حرکتوں سے بہت محظوظ ہوتے ہیں، اس لیے کسی کی حرکت سے محظوظ ہوں تو بندہ پریشان ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ان کے پاس کئی گھوڑے ہیں جو اکثر ریس اور الیکشن جیتتے رہتے ہیں۔اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتے، آخر بندہ چوبیس گھنٹے ایک ہی بات

سن کر خوش تو نہیں ہو سکتا۔

مرید اپنی نگاہیں ان کے پاؤں سے اوپر نہیں لے جاتے، اس لیے اگر کوئی مرید کہے کہ میں نے پیر سائیں کو ننگے دیکھا تو مطلب ہو گا، ننگے پاؤں دیکھا۔ پیر صاحب منفرد بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ پیر صاحب آپ نے ایک جوتا اتارہ ہوا ہے تو ہیں گے: "نہیں ہم نے ایک جوتا پہنا ہوا ہے۔" ان کی تو چائے میں چینی کم ہو تو کہیں گے: اس چینی میں چائے زیادہ ہے۔ وہ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں وہ سر ہاتھ میں رکھ لیتا ہے، جب وہ پیر جو گوٹھ سے لاہور آتے تو پیر جو گوٹھ بھی لاہور آ جاتا ہے۔ ان دنوں لاہور کہاں جاتا ہے؟ اس کا پکا پتہ نہیں۔ مرید انہیں اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرنے دیتے۔ اس لیے پیر صاحب کے ہر کام میں کسی اور کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ان سے حور کا ذکر پوچھو تو شاید حر کہیں۔ جی ایم سید کے بقول پیر صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔ گویا وہ پیر صاحب کو سیاست دان نہیں مانتے۔ ویسے پیر صاحب کے الیکشن کے نتائج سے تو ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ ووٹر ان کا انتخاب نہیں کرتے، یہ ووٹروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وہ پیر ہیں جو دن میں اتنی بار ماشاء اللہ نہیں کہتے، جتنی بار مارشل لاء کہتے ہیں۔ برتھ ڈے ضرور مناتے ہیں۔ دوسرے سیاست دان شاید اس لیے نہیں مناتے کہ برتھ ڈے تو ڈے کو پیدا ہونے والے ہی منا سکتے ہیں۔

ان کی باتوں میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ سننے والا اپنا سر بھاری محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کا ہر فقرہ کئی کئی کلو کا ہوتا ہے۔ فقرے تو دوسرے سیاست دانوں کے بھی

کئی کئی کلو کے ہوتے ہیں، جی ہاں کئی کئی کلومیٹر کے۔ دوسروں کے تو بیانوں کی بھی اتنی کالمی سرخی نہیں لگتی جتنے کالمی سرخی ان کی خاموشی کی ہوتی ہے۔ ستاروں کے علم پر ایسا عبور ہے کہ فلمی ستاروں کی گردش تک کی پس و پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔

بہت اچھے کرکٹر ہیں۔ بحیثیت امپائر کئی بار سنچریاں بنائیں۔ فوٹوگرافی کا شوق ہے۔ کہتے ہیں: میں ہمیشہ خوبصورت تصویریں بناتا ہوں، حالانکہ وہ خوبصورت کی تصویریں بناتے ہیں۔ مخالفین تک پیر صاحب کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی حریف پرویز علی شاہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے متعدد بار پیر صاحب کو ہرایا۔ یہی کہتے ہیں، پیر صاحب نے مجھے ہر بار جتوایا۔ صحافی بھی ان سے سوال کر رہے ہوں تو یہ انہیں یوں دیکھتے ہیں جیسے پیر سوالی کو۔

پیر صاحب کو فرشتے بہت پسند ہیں۔ فرشتوں میں یہی خوبی ہے کہ وہ سوچتے سمجھتے نہیں، بس جو کہ جائے، کرتے ہیں۔ پیر صاحب کو زمینی فرشتے الیکشن ہرواتے ہیں۔ زمین اور آسمانی فرشتوں میں وہی فرق ہے جو زمینی اور آسمانی بجلی میں ہے۔ آسمانی بجلی وہ ہوتی ہے۔ جس کا بل نہیں آتا۔ پیر صاحب اس وقت کے تعلیم یافتہ ہیں جب ایک میٹرک پڑھا لکھا آج کے دس میٹرکوں کے برابر ہوتا تھا۔ یہی، اس زمانے کا تو ایک ان پڑھ آج کے دس ان پڑھوں سے زیادہ ان پڑھ ہوتا تھا۔

پیر صاحب کسی سیاست دان کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جس کو سنجیدگی سے لیں، وہ مذاق بن جاتا ہے۔ وہ اتنے شگفتہ مزاج ہیں کہ ان کے کمرے کے گلدان میں

پلاسٹک کے پودوں پر بھی پھول کھلنے لگتے ہیں جب کہ ان کے مرید اور کالعدم وزیراعظم محمد خان جونیجو ایسے تھے کہ ان کے کمرے میں تو پلاسٹک کے پھول بھی مرجھا جاتے۔ پیر صاحب کی چھٹی حس جانے والے حکمرانوں کا بتاتی ہے جب کہ باقی پانچ حسیں آنے والے کا۔ وہ کہتے ہیں: ''حکمرانوں کو آئین کی نہیں، آئینے کی ضرورت ہے'' ٹھیک کہتے ہیں۔ خضاب اور زیڈ اِل بندہ آئین کی مدد تو نہیں لگا سکتا۔ ان کی طبیعت میں اتنی مستقل مزاجی نہیں، جتنی مستقل مزاحی ہے۔ سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح نہیں بلکہ غیر سنجیدہ بات کو سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح ہے۔ سوچتا ہوں اگر سیاست میں سنجیدگی آ گئی تو پیر صاحب کیا کریں گے؟

☆

مُسلح افواج کے سربراہ

پیر پگاڑہ تو فرماتے ہیں جماعت اسلامی دراصل مسلم لیگ ہی کا اردو ترجمہ ہے۔بہر حال یہ فرق ہے کہ جماعت میں ایک امیر ہوتا ہے۔اور مسلم لیگ میں سبھی ہوتے ہیں۔ جماعت کے امیروں میں نمبر ایک مولانا مودودی ہیں۔میاں طفیل محمد دو نمبر امیر ہیں اور قاضی حسین احمد تیسرے درجے کے ہیں۔ قاضی حسین احمد اور میاں طفیل محمد صاحب کے مزاج میں وہی فرق ہے جو اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی میں ہے۔مولانا مودودی تو چھڑی ہاتھ میں یوں پکڑتے تھے جیسے قلم پکڑا ہو۔میاں صاحب کو پتہ نہیں ہوتا کہ قلم پکڑا ہے یا چھڑی جب کہ قاضی حسین احمد تو قلم بھی یوں پکڑتے ہیں جیسے چھڑی پکڑی ہو۔ ہر امیر کے دور میں جماعت کی رفتار رہی جو امیر کے اپنے چلنے کی تھی ......میاں صاحب تو ایسے ہیں کہ جب تک بندہ رک نہ جائے، پتہ نہیں چلتا وہ چل رہے ہیں۔ قاضی صاحب رکے بھی ہوں تو ہم سے تیز ہوتے ہیں۔لگتا ہے وہ زمین کے اوپر نہیں چلتے زمین ان کے نیچے چلتی ہے۔

میاں طفیل محمد صاحب اس عمر میں ہیں جس میں کسی بندے کو یہ خوش خبری دی جاسکتی ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی جنگ ہوگی۔وہ امارت میں ہی دوسرے نمبر پر نہیں آئے۔بچپن میں کسی لڑکے سے لڑائی ہو جاتی تو اس میں بھی دوسرے نمبر پر آتے۔پہلے پٹھان کوٹ اور پینٹ کون بھاتا تھا۔ٹائی لگاتے پھر ایسی داڑھی رکھی کہ ٹائی لگاتے تو ناٹ، ناٹ ویزایبل ہوتی۔پتلون بھی پہنتے تھے۔مگر بعد میں

پہننا چھوڑ دی کہ پتلون سینے کے گرد ٹائٹ لگتی تھی۔ دوران گفتگو پنجابی کے لفظ یوں استعمال کرتے ہیں۔ تقریر کر رہے ہیں تو وہ اردو بول رہے ہوتے ہیں اور لوگ پنجابی سن رہے ہوتے ہیں۔ ہر کام اصلاح کے لیے کرتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی کتاب ''کشف المحجوب'' کا ترجمہ کیا۔ کہتے ہیں، نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اصلاح بھی کر دی۔

لاطینی کہاوت ہے پینٹر اور وکیل بہت جلد سیاہ کو سفید کر دیتے ہیں۔ مگر یہ ایسے وکیل تھے کہ ان کے موکل کے مخالفوں کو وکیل کرنے کی ضرورت ہی پڑتی۔ یار رہے ان دنوں وکیل کیے جاتے تھے۔ آج کل تو بعض اوقات جج ہی کر لیے جاتے ہیں۔ چارلس ڈکنز سے کسی نے پوچھا: اچھا وکیل بننے کے کیا چاہیے؟ اس نے کہا برے لوگ، سو میاں صاحب اچھا وکیل نہ بن سکے۔ یوسفی لکھتے ہیں وکیل وکالت چھوڑ دے اور سچ بولنے لگے۔ پھر بھی لوگ اسے وکیل ہی کہتے ہیں۔ لیکن میاں صاحب جب وکالت کرتے تھے تب بھی لوگ انہیں میاں ہی کہتے تھے۔ پھر بار کو یوں چھوڑا جیسے ڈاکٹر کے کہنے پر Clrrohtic ''بار'' جانا چھوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ بے اختیار سچ بول دیتے ہیں حالانکہ وہ با اختیار سچ بولتے ہیں۔ آپ کی بات اس قدر توجہ سے سنیں گے کہ آپ کا بات ختم کرنے کو دل نہ چاہے گا۔ طبیعت میں اس قدر عاجزی کہ بندہ عاجز آ جاتا ہے۔ وہ جتنے بھولے ہیں اتنا بھولا ہونے کے لیے بڑا کچھ بھولنا پڑتا ہے۔ جماعت کی بہتری کے لیے انہوں نے جو کام کیے، ان میں سے ایک جماعت کی امارت سے معذرت کرنا ہے۔ گھر کا ماحول ایسا کہ ان کے بچوں سے پوچھو: ''کس جماعت میں پڑھ رہے ہو؟'' تو

کہیں گے: ''جماعت اسلامی میں۔'' بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی آپ ان سے ہمدردی کرنے جائیں تو آپ کو یوں تسلیاں دے رہے ہوں گے جیسے انہیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔

تھامس فلر کا کہنا ہے: آج کل سچ سب سے بڑی خبر ہے۔ اور میاں صاحب بڑی خبرناک شخصیت ہیں۔ جمہوریت پر ہمیں یہ اعتراض ہے کہ جمہوریت آتی ہے۔ مارشل لاء میں یہ خوبی ہے کہ وہ آتا ہے آتی نہیں اور میاں صاحب عورت کی حکمرانی کے قائل نہیں۔ بڑی سے بڑی کامیابی پر بھی خدا سے دعا مانگتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں: اللہ میاں اس بار معاف کردو۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا لہجہ ایسا نرم کہ اگر کسی رند سے غصے میں پوچھیں کہ تم شراب پیتے ہو؟ تو اسے سمجھ نہ آئے گی کہ سوال پوچھ رہے ہیں یا دعوت دے رہے ہیں۔ جس کی بے عزتی کریں، اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ دوسرے سمجھتے ہیں عزت کر رہے ہیں۔ انہیں کسی بات پر کم ہی غصہ آتا ہے اور جب غصہ آتا ہے تو کم ہے تو کم ہی پتہ چلتا ہے کہ کس بات پر آیا۔ ایسے ٹھنڈے کہ گرمیوں میں بھی ان کے پاس چادر لے کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ کام بھی اچھے طریقے سے کرتے ہیں جو کام صرف طریقے سے کیے جاتے ہیں۔ پہلے رس گلے چینی میں ڈبو کر کھاتے، اب چینی بھی دھو کر کھاتے ہیں۔ وہ غلط وقت پر صحیح بات کرتے ہیں لیکن صحیح وقت پر غلط بات نہیں کرتے۔ البتہ وہ کسی کو اسلامی ذہن کا بندہ کہیں تو اس سے مراد جماعت اسلامی ذہن کا بندہ ہوگا۔

مولانا مودودی جماعت کی سیاست میں لائے، قاضی حسین احمد سیاست کو

جماعت میں لائے ۔ سیاست میں ان کی سوچ الگ ہے۔ سوچ الگ نہ ہو تو خود الگ ہو جاتے ہیں۔ قاضی صاحب وہ وکیل ہیں جو عدالت میں کیس یوں لڑتے ہیں جیسے عدالت پر مقدمہ چلا رہے ہوں۔ شروع ہی سے اس قدر تیز تھے کہ سکول میں ان کی جو تاریخ پیدائش درج ہے اس سے دو سال قبل پیدا بھی ہو چکے تھے۔ ان کے بزرگ کام کے قاضی تھے۔ ''زیارت کاکا'' گاؤں میں ان کا خاندان گاؤں کا استاد تھا۔ ان کے سامنے سب ''کاکے'' تھے۔ ان کے گھر کے اردگرد دوسروں کے گھر یوں ہی تھے جیسے دیہاتی سکول کے بچے استاد کے اردگرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ تعلق اس خاندان سے جہاں نوجوانوں کے چہرے پر داڑھی نہ ہونا بے پردگی میں شمار ہوتا ہے۔ 1970ء میں جماعت کے نظم میں ضبط ہوئے۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ سے جماعت میں نہ آئے بلکہ اسلامی جمعیت طلبہ ان سے جماعت میں آئی۔

بچپن ہی سے جغرافیے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ کوئی پوچھتا بتاؤ فلاں ملک کہاں ہے؟ تو جھٹ بتا دیتے ؟ جغرافیے کی کتاب کے فلاں صفحے پر۔ ''بچپن میں دنیا کا نقشہ یوں دیکھتے جیسے اپنا ناک نقشہ دیکھ رہے ہوں۔ پھر جغرافیے کے استاد ہوئے اور جغرافیے کے استاد کے لیے جغرافیے سے اہم کوئی مضمون نہیں ہوتا کیونکہ جغرافیے کے نہ ہونے سے ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر وہ استاد نہیں رہ سکتا۔ نوجوانی میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کو بھی جغرافیے کا اتنا شوق تھا کہ ایک صاحب انہیں ادکارہ مسرت نذیر کی ہسٹری بتا رہے تھے تو یوسفی صاحب نے کہا: قبلہ ہسٹری کو چھوڑیں، مجھے ان کا جغرافیہ بتائیں۔'' خواتین کے معاملے میں قاضی صاحب کا

رویہ اتنا سخت نہیں جتنا مولانا عبدالستار نیازی صاحب کا ہے۔ کہ انہوں نے تو عورت سے شادی تک نہیں۔ بہرحال قاضی صاحب سے مس گائیڈ ڈمیزائل کا پوچھیں تو کہیں گے: وہ میزائل جسے کسی مس نے گائیڈ کیا ہو۔ قاضی صاحب کا نشانہ اچھا ہے۔ ایک بار نشانہ بازی کر رہے تھے۔ ٹارگٹ پر جو تصویر تھی، کوئی نشانہ اسے نہ لگا تو احباب نے فوراً وہاں سے وہ تصویر ہٹا کر ولی خان اور الطاف حسین کی تصویر رکھی تو نشانہ خود تیر پر آ لگا۔ رحمت الٰہی صاحب کا جماعت کا عہدہ چھوڑنا ان کے لیے رحمت الٰہی بنا۔ قاضی وہ تھے ہی یوں میاں طفیل محمد صاحب کے طفیل جماعت کے میاں بھی بن گئے۔

قاضی صاحب اپنے اور جاوید اقبال کے والد سے متاثر ہیں۔ نرگس پسند ہے اور کرگس ناپسند۔ گرمی اور سردا بہت کھاتے ہیں۔ دوسروں کو سننے کا اس قدر شوق ہے کہ منظر بھی وہ پسند ہے جس میں کچھ سننے کو ہو، جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ اور پانی کا شور۔ دیکھنے میں اپنے قد سے لمبے لگتے ہیں۔ سنتے ہوئے سر بلند اور کہتے ہوئے سُر بلند رکھتے ہیں۔ پٹھان ہیں اور آپ کو پتہ ہے پٹھان کب پٹھان کی طرح ہوتا ہے؟ جی ہاں جب غصے میں ہوتا ہے۔ وہ تو تقریر کر رہے ہوں تو لگتا ہے غصہ کر رہے ہیں۔ غصے میں ہوں تو سرخ رنگ ان کے چہرے کی طرح ہو جاتا ہے۔ کرنٹ افیئرز پر بات کر رہے ہوں تو بات میں اور کچھ ہو نہ ہو، کرنٹ ضرور ہوتا ہے۔ ہم زمانہ طالب علمی میں اونچی آواز میں بول بول کر سبق یاد کیا کرتے تھے۔ وہ اس طرح سوچتے ہیں۔ تقریروں میں اقبال کے شعر اس قدر استعمال کرتے ہیں کہ لگتا ہے یوم اقبال پر تقریر فرما رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ پردے

کے بڑے حق میں ہیں، حالانکہ انہیں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مخالفین کو ننگا کرتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ خود کو بے قرار برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے ذمے کوئی کام لگایا جائے تو اسے یوں کرتے ہیں جیسے کام ان کے ذمے نہیں لگایا گیا، وہ کام کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ اس قدر متحرک کہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے بھی ساکن نہیں ہوتے۔ وہ آرام کر رہے ہوں تو یقین کر لیں، یہ سب اپنی مرضی سے نہیں ڈاکٹر کی مرضی سے کر رہے ہوں گے۔ رات گئے دن کا آغاز کرتے ہیں اور اس وقت تک پہلا دن ختم نہیں کرتے جب تک اگلا شروع نہ کر لیں۔

پٹھان اپنی زبان نہیں بدلتے لیکن وہ ایرانیوں سے فارسی، عربوں سے عربی، اہل مغرب سے انگریزی، اہل خانہ سے پشتو، ہم وطنوں سے اردو اور ہم جماعتیوں سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں جو وہ سمجھتے ہیں۔ انہیں بولنا تو کئی زبانوں میں آتا ہے مگر چپ رہنا کسی زبان میں نہیں آتا۔ سر ڈھانپنا ان کے نزدیک ستر ڈھانپنا بلکہ بہتر ڈھانپنا ہے۔ لوگوں کے سر پر بال اگتے ہیں۔ ان کے سر پر ٹوپیاں۔ ان کے نزدیک تو ٹنڈ کرانا سر سے ٹوپی اتارنا ہوتا ہے۔ باریش چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ اگرچہ کھیلنے کے لیے مسکراہٹ کے پاس کم ہی چہرہ بچا ہے۔ لہجہ ایسا کہ جنرل دوستم کو بھی جنرل دو۔ ستم کہتے ہیں۔ قاضی حسین احمد مخالفوں کے لیے قاضی بھی ہے اور حسین بھی۔ انہوں نے ذاتی عدالتیں لگوائیں۔ ''پاسبان'' کی ان عدالتوں میں ان کی موجودگی ایسے ہی ضروری ہوتی ہے جیسے پنجابی فلم ہٹ کرانے کے لیے سلطان راہی۔ اس لیے وہ پاسبان کے جلسے میں جا رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے۔ ''شوٹنگ'' پر جا رہے ہیں۔ مجاہد آدمی ہیں۔ کار سے بھی یوں نکلتے ہیں جیسے

مورچے سے نکل رہے ہوں۔ ہاتھ ملا رہے ہوں تو لگتا ہے ہتھ جوڑی کر رہے ہیں ۔ چلتے یوں ہیں جیسے پیش قدمی کر رہے ہوں۔ بلاشبہ وہ پاکستان کی مسلح افواج کے سربراہ ہیں۔

☆

پان کا بادشاہ

اگرچہ وہ پان کی چلتی پھرتی پبلسٹی کمپین ہیں، لیکن اتنی شہرت انہوں نے پان کو نہیں دی جتنی پان نے انہیں دی ہے۔ ویسے تو پان کے ذکر کے بغیر ہمارا ابھی حدود اربعہ بیان کرنا دشوار ہے کہ ہم بڑے دھان پان ہیں، لیکن مولان ڈھن پان شخصیت ہیں۔ وہ جے۔یو۔پی کے تاحیات صدر ہیں یعنی جب تک جے۔یو۔پی حیات ہے۔ بول رہے ہیں تو جے۔یو۔پی کے کم اور یو۔پی کے زیادہ لگتے ہیں۔ وہ نام کے ہی شاہ نہیں کام اور پان کے بھی شاہ ہیں۔

میرٹھ میں پیدا ہوئے مگر پوچھو کہاں پیدا ہوئے تو کہیں گے: ''گھر میں''۔ بچپن میں فٹ بال کے کھلاڑی تھے۔ فٹ بال اور سیاست میں یہ قدر مشترک ہے کہ اگر فٹ بال گول میں گرانا ممکن نہ ہو تو مخالف کھلاڑی کو گرانے کی کوشش کریں۔ مولانا صاحب میں شروع ہی سے سیاست دان بننے والی خوبیاں موجود تھیں۔ کوچ نے ایک بار کہا کہ اگر فٹ بال نہ چھین سکو تو مخالف کھلاڑی کو ٹانگ مار کر گرانے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کہ ابھی فٹ بال آتا ہے تو کھیل شروع کرتے ہیں۔ اس پر مولانا نے کہا فٹ بال کو چھوڑیں آپ کھیل شروع کروائیں۔ سیاست میں بھی فٹ بال ایم کیو ایم والے لے گئے کیونکہ الطاف حسین حالی تو پانی پت میں پیدا ہوئے تھے مگر ایم کیو ایم کے الطاف حسین بے حالی پانی پت کے میدان میں پیدا ہوئے۔

ہر وقت ان کے منہ میں پان اور جماعت اسلامی ہوتی۔ دوران گفتگو بات

کرتے کرتے جماعت اسلامی پر فقرہ یوں پھینکتے ہیں جیسے پان کھاتے کھاتے پیک پھینکتے ہیں۔ اب تو جماعت اور پاندان کے بغیر کہیں جاتے بھی نہیں۔ گلوری گلے میں یوں دباتے ہیں جیسے کلرک فائل دباتے ہیں۔ منہ ایسا کہ اس میں پان نہ ہو، تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ ہمیں تو پان کھانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ یوں شرم سے پان پان ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا کو اقوام متحدہ پر محبت آئے تو اسے قوام متحدہ کہیں گے۔ پان اس قدر نفاست سے کھاتے ہیں۔ کہ کیا مجال منہ سے پتہ چلے کہ پان کھا رہے ہیں، قمیض سے پتہ چلتا ہے۔ پانوں کے بعد ان کی دوسری مصروفیات جماعت اسلامی ہے۔ سال میں چند دنوں کے لیے وہ پاکستان کے تبلیغی دورے پر آتے ہیں۔ مذہبی رہنما انہیں سیاست دان سمجھتے ہیں اور سیاست دان انہیں مذہبی رہنما مانتے ہیں۔ ان کے والد محترم کو قائداعظمؒ نے بیرونی ملک کے دورے پر بھیجا تا کہ باہر پاکستان کی فضا بہتر بنائیں۔ اب مولانا خود دوروں پر چلے جاتے ہیں تا کہ پاکستان کی فضا بہتر رہے۔ جب تک وہ باہر رہتے ہیں، بہتر رہتی بھی ہے۔

انہیں دنیا کی ہر اہم زبان آتی ہے جو نہیں آتی اسے اہم نہیں سمجھتے۔ فرانسیسی، فارسی، اردو، انگریزی، اور سواحلی اس قدر روانی سے بولتے ہیں کہ سننے والے کو بہا لے جاتے ہیں۔ ویسے فرانسیسی تو ہم بھی سمجھ لیتے ہیں بشرطیکہ اردو میں بولی جائے۔ عربی پسند ہے۔ گلا تک عربی سے صاف کرتے ہیں اردو تک یوں بولتے ہیں کہ ایک صاحب خربوزے بیچ رہے تھے ان سے پوچھا: آپ عدداً بیچتے ہیں یا وزناً؟ تو دکان دار نے کہا: مولانا میں خربوزے بیچتا ہوں۔ بڑے بدلہ سنج اور بذلہ

سچ ہیں۔ بھٹو مرحوم نے ایک بار کہا: ''آپ ایک شریف آدمی کی بات پر اعتبار کریں اور میری بات مان لیں۔'' تو مولانا بولے: ''آپ ایک شریف آدمی لے آئیں، میں اعتبار کرلوں گا۔'' فرماتے ہیں: ''جس سے ناراض ہوتا ہوں اسے ایک منٹ میں نکال دیتا ہوں۔ دل سے بھی اور پارٹی سے بھی''۔ ان کی پارٹی اتنی ہی بڑی ہے جتنا بڑا ان کا دل ہے۔ وہ دین کو سیاست سے الگ رکھتے ہیں جیسے ذوالفقار علی بھٹو سے حزب اختلاف کی لڑائی میں وقت نماز وہ اپنی جماعت کی الگ جماعت کراتے ہیں اور سیاست میں مفتی محمود کی امامت میں لڑتے۔ ان کی جماعت ملک کی چھوٹی پارٹیوں میں سب سے بڑی پارٹی ہے۔ لیکن وہ پارٹیاں جو اس سے بہت بڑی ہیں یہ ان سے تھوڑی ہی چھوٹی ہے۔ البتہ الیکشن کے دنوں میں جب دوسری پارٹیوں کے سربراہ اپنے ووٹ تلاش کر رہے ہوتے ہیں، یہ اپنے امیدوار تلاش کرتے ہیں۔ دوسری پارٹیوں کا منشور ہی ان کا مسلک ہوتا ہے۔ ان مسلک ہی ان کا منشور رہوتا ہے۔

ایک تاجر سے ہم نے پوچھا کہ مولانا کے سیاست میں آنے سے کیا فرق پڑا ہے؟ تو اس نے کہا۔ سرمہ نورانی اور پان نورانی زیادہ بکنے لگا ہے۔ مولانا کے مداح ان کے نام کے ساتھ اتنے القاب و آداب لگاتے ہیں جیسے ان جیسے ایک بزرگ نے رات کو ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کمرے کے لیے پوچھا۔ اندر سے آواز آئی کون؟ کہا ہم ہیں علامہ سرکار شریعت، حافظ قادری صوفی چشتی صابری ثم لاہور تو چوکیدار نے گھبرا کر اندر ہی سے جواب دیا: معاف کیجئے صاحبان، ہوٹل میں اتنے آدمیوں کے لیے جگہ نہیں۔

سیاست میں ہم خیال جماعت سے اتحاد کرتے ہیں۔ ہم خیال سے مراد وہ جو ان کی ''ہم'' کا خیال رکھے۔ اسمبلی میں ان کے ارکان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ ساتھ تقریباً لگانا پڑتا ہے۔ گول میز کانفرنس کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ مریدوں نے گھر کی میزیں گول کرنا شروع کر دیں۔ اگرچہ کانفرنس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کہتے ہیں جو کرنا چاہیے اور جلوس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کرتے ہیں جو کہنا چاہیے۔ بہر حال وہ کہتے ہیں ملک کے دو ٹکڑے اس لیے ہوئے کہ یحییٰ خان کے پاس گول میز نہ تھی، لیکن بقول پگاڑہ مولانا کے گھر میں تو میز ہی نہیں، گول میز تو دور کی بات ہے۔ موصوف کا گھر محلے میں ہے جب کہ سیاست دانوں کے گھر میں تو کئی محلے ہوتے ہیں۔ پوچھو گھر سجانا ہو تو کیا کرتے ہیں؟ کہیں گے خود گھر آ جاتا ہوں۔ ''خواتین'' کا بے نظیر احترام کرتے ہیں۔

مولانا دو ہزار کافر مسلمان کر چکے ہیں۔ میرا دوست ''ف'' کہتا ہے کہ ہم تو ایک کافر کو ہی بمشکل مسلمان بنا سکے۔ دوسری کو بنانے لگے تو پہلی نے کیس کر دیا۔ دوران گفتگو عروسی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں پہلو بدلتے ہیں جیسے رامے صاحب پارٹیاں بدلتے ہیں۔ گفتگو میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے لگتے ہیں جمعیت علمائے پاکستان کے عہدہ داران کا انتخاب کر رہے ہیں۔ مولانا الیکشن میں صرف اسے کھڑا کرتے ہیں جو کھڑا ہوتا رہا ہو۔ یعنی انہیں دیکھ کر کھڑا ہوتا رہا ہو۔ ان کے پی اے سے وقت لیے بغیر کوئی انہیں نہیں مل سکتا؟ بلکہ لگتا ہے وہ اپنے پی اے سے وقت لیے بغیر خود سے بھی نہیں ملتے۔ مزاج اور مزاح برابر ہو تو بہت برا لگتا ہے۔ بہت اچھا ہو تو صرف اچھا لگتا ہے۔ مخصوص انداز سے بولتے ہی نہیں، چپ بھی مخصوص انداز سے ہوتے

ہیں۔اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں،لیکن جسے معاف کرنا چاہیں، اسے اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے دیتے ہیں۔ان کا مشورہ بھی کارکنوں کے لیے حکم ہوتا ہے۔ مرید تو ان کی تجویز کو بھی تعویز سمجھتے ہیں۔اس قدر ان کہ کوئی کہہ دے کہ آپ تو بوڑھوں کی طرح چلتے ہیں تو کہیں گے نہیں بوڑھے میری طرح چلتے ہیں۔

وہ جگہ جہاں ناپسندیدہ افراد کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، سسرال کہلاتی ہے۔ اور مولانا صاحب کی بیوی سعودی عرب کی ہیں۔صحافیوں میں ان کی افطاری کی بریانی بہت مشہور ہے۔وہ اتنی لذیذ ہوتی ہے کہ اگر مولانا سیاست نہ بھی کرتے، تب بھی انہیں روزگار کی فکر نہ ہوتی۔لوگ ان سے اپنا نکاح اور دوسرے کا جنازہ پڑھوانا بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور اکثر مذہبی لوگ ہر سال یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔وہ ہر کام مسلمانوں کے لیے کرتے ہیں۔وہ تو پان بھی یوں کھاتے ہیں جیسے مسلمانوں کے لیے کھا رہے ہو۔یہی نہیں وہ تو کہتے ہیں میں پان نہیں کھا رہا ہوتا، دراصل مسلمانوں کی امداد کر رہا ہوتا ہوں کیونکہ پان انڈونیشا، بنگلہ دیش اور سری لنکا سے آتا ہے اور زیادہ تر اس کا مسلمان ہی کاروبار کرتے ہیں یوں اگر میں نے پان چھوڑ دیئے تو مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔"

مزاروں پر ہم نے کسی پیر کو جاتے نہیں دیکھا، مریدوں کو ہی دیکھا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پیر مزار کے اندر رہتے ہیں۔لیکن مولانا پہلے سیاست دان ہیں جن کی الیکشن کمپین میں مردے بھی زندوں کی طرح حصہ لیتے ہیں۔ان کی سیاست میں آنے سے پہلی بار "مزار" کا لفظ سیاست میں آیا کیونکہ وہ "مزاری" سیاست دان ہیں۔

اصغر اعظم

یہ وہ زمانہ تھا جب جموں اور سری نگر میں تعلیمی سہولتیں اتنی تھیں کہ ایک طالب علم نے کہا: ''میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھا جب میں نے پہلی مرتبہ سکول ٹیچر دیکھا۔'' ان دنوں وہاں ایک ہیڈ ماسٹر اپنی کلاس کے بچوں کو تقریر کرنا سکھا رہا تھا۔ ہر بچے کو بتاتا کس طرح بولنا ہے۔ ایک بچہ آیا تو ہیڈ ماسٹر نے کہا: ''تم صرف یہ سیکھو کہ چپ کیسے ہونا ہے؟'' یہ بچہ بڑا ہو کر پاک فضائیہ کا پہلا اور دنیا کا سب سے کم عمر کمانڈر انچیف بنا۔ پوری قوم نے اسے ''شاہین'' کہا مگر حنیف رامے نہ کہتے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے: ''میں جب انہیں ''شاہین'' کہہ کر بلاؤں گا' لوگ سمجھتے ہیں میں اپنی پہلی بیوی کو بلا رہا ہوں''۔

دیکھنے میں میں اپنے اصغر علی خان پر گئے ہیں۔ بچپن ہی سے ان میں سیاست دانوں والی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر کلاس میں کامیاب نہ ہوتے تو گھر والوں کو یہ نہ کہتے کہ میں ناکام ہوا ہوں، کہتے دھاندلی ہوئی ہے۔ والد اس قدر سخت تھے کہ انہیں لگتا، میں گھر میں نہیں، سکول میں پیدا ہوا ہوں۔ آدمی انہیں الٹا ہو کر دیکھے تو سیدھے سادے آدمی ہیں۔ وطن کا دفاع کر کے اب یہ حال ہو گیا ہے کہ دوران گفتگو بھی دفاعی پوزیشن میں رہتے ہیں۔ کسی سے پانچ روپے بھی وصول کرنے ہوں تو ضرور کریں گے، چاہے وصول کرنے میں سو روپے لگ جائیں۔ اس قدر ذمہ دار کہ اگر انہوں نے آپ کو نیند کی گولی کھلانا ہو تو وقت پر کھلائیں گے، چاہے اس کے لیے انہیں آپ کو سوتے میں اٹھانا پڑے۔ جو غلطی ایک بار کی، پھر اسے

کبھی نہیں دہرایا۔ ہمیشہ نئی غلطی کی۔ عمر اور ارادہ پختہ، البتہ عمر کا پوچھو تو عمر اصغر خان کا بتانے لگتے ہیں، ویسے بھی ہمارے ہاں سیاست کا یہ حال ہے کہ لیڈر عوام کے حال کے بجائے ان کے ماضی کو ہی بہتر بناتے ہیں۔ وہ بھی ایسے کہ عوام کا وہ حال کرتے ہیں کہ اسے ماضی بہتر لگنے لگتا ہے۔

اصغر خان کہتے ہیں: ''سیاست میں میرا آنا ایک حادثہ ہے''۔ سیاست کو یہ حادثہ 1968ء میں پیش آیا۔ بھٹو صاحب نے کہا تھا: ''ایوبی دور میں میری نظر بندی نے دو شخصیتوں کو لیڈر بنایا، ایک بیگم نصرت بھٹو تھی اور دوسرے بے غم اصغر''۔ خان صاحب نے سکول میں اتنی بار اے بی سی ختم نہ کی ہو گی جتنی سیاسی اتحاد بنا بنا کر کی۔ مثلاً جے پی، ٹی آئی، پی این اے، ایم آر ڈی اور پی ڈی اے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فاتح سیاست ہیں۔ اندرون ملک ان کا دورہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دورے کا سنتے ہی حکومت ایمبولینس روانہ کر دیتی ہے۔

جب فوج میں تھے تو ہمیشہ خطرناک کام سب سے پہلے خود کرتے، پھر جونیئرز کو اس کی اجازت دیتے۔ یہاں تک کہ شادی بھی پہلے خود کی۔ ہوائی اور جہاز اڑانے کے ماہر ہیں۔ کہتے ہیں جب میں ائیر مارشل تھا تو کبھی کسی نے یہ شکایت نہ کی کہ چھلانگ لگاتے ہوئے اس کا پیراشوٹ نہیں کھلا۔ پی آئی اے میں آئے تو اسے اتنا آرگنائز کیا کہ ہر کام کے لیے الگ سٹاف رکھا۔ یہاں تک کہ مسافروں کی خدمات کرنے کے لیے الگ عملہ ہوتا اور نہ کرنے کے لیے الگ۔ خان صاحب آج کل بھی plan کو plane سمجھتے ہیں۔ ڈرائیور ایسے کہ ان کی گاڑی کے آگے آنے والے کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا پیچھے آنے والے کو۔

عمر اصغر دراصل کم عمر اصغر خان ہیں۔اس لیے معمر اصغر خان صرف نوعمر اصغر خان کے مشورے پر ہی عمل کرتے ہیں۔کہتے ہیں میری پارٹی اکیلی ہی پی پی کو ہرا سکتی ہے۔اور 1990ء میں انہوں نے اکیلے پی پی سے اتحاد کر کے اسے ہرا کے دکھا دیا۔ واحد سیاست دان ہیں جو مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ہار جائیں۔ جتنی محنت سے وہ ہارتے ہیں اس سے کم محنت پر بندہ جیت سکتا ہے۔ان کا حلقہ انتخاب ہمیشہ ہلکا انتخاب رہا۔ ہر الیکشن پر وعدہ کرتے ہیں کہ الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر رکھ دیں گے۔واقعی الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر کسی اور جگہ سے الیکشن لڑتے ہیں۔صرف چار بار الیکشن ہارے۔جس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ وہ صرف چار بار ہی الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے۔ہار تو انہیں اس قدر پسند ہے کہ کوئی کسی اور کے لیے لایا ہو تو بھی وہ اپنی گردن آگے کر دیتے ہیں۔ بقول پیر پگاڑہ انہیں ہمیشہ کرسی ملی مگر اپنے گھر کے لاونج میں۔یہ وہ ہوا باز ہیں جنہوں نے تمام حادثے ہائی وے پر کیے۔وہ بھی یوں کہ لوگ ہائی وے کی بجائے ”ہائے وے“ کہہ اٹھے۔وہ اسی سیاسی پارٹی کے سربراہ ہیں جسے ووٹ لینے کے لیے ہی کمپین نہیں چلانا پڑتی۔امیدوار لینے کے لیے بھی یہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ونسٹن چرچل نے کہا تھا: ”سیاست اور جنگ دونوں ایک جیسی خطرناک ہوتی ہیں،البتہ جنگ میں آپ صرف ایک بار مارے جاتے ہیں لیکن سیاست میں بار بار۔اور اگر سیاست دان خان صاحب جیسا ہو تو ہر بار۔اگرچہ ان کا دبدبہ اب دب دبا گیا ہے مگر پھر بھی ہر بات پر کہتے ہیں: ”میری نہ مانی گئی تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا“ اور بقول شفیق الرحمان یہ کون سا مشکل کام ہے۔اس کے لیے

صرف دو اینٹیں ہی تو چاہیے ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں ''ہم ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی، ہم اسے کچل دیں گے۔''

لوگ کہتے ہیں: ''اصغر خان صاحب تاریخ کو دہراتے ہیں مگر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔ حالانکہ وہ تو اس مقام پر ہیں کہ تاریخ کو خود ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب محبت سے خان صاحب کو ایسے نام سے پکارتے جس سے بھٹو صاحب کی خان صاحب سے اتنی محبت ظاہر نہیں ہوتی، جتنی سبزیوں سے، ویسے تو محبت اور روزنامہ ''جنگ'' میں سب جائز ہوتا ہے۔

اصغر خان صاحب دوسروں کی خامیوں کی اس قدر دل جمعی سے اصلاح کرتے ہیں کہ بعد میں پتہ چلتا ہے، موصوف ساتھ خوبیوں کو بھی اصلاح کر گئے ہیں۔ کہتے ہیں ''ہر مصیبت کا سامنا مسکرا کر کرتا ہوں۔'' یہ بات انہوں نے بیگم مہناز رفیع کے سامنے کہی۔ انہیں اپنی پارٹی کے ہر کارکن کا نام آتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ ان کا حافظہ نہیں، کارکنوں کی تعداد ہے۔ خان صاحب میں اس قدر استقلال ہے کہ آج بھی وہیں ہیں جہاں بیس سال پہلے تھے۔ انہوں نے تحریک استقلال کو یوں چلایا جیسے کوئی ہیڈ ماسٹر کمیٹی کا سکول چلاتا ہے۔

ایک بار انہوں نے تقریر میں اپنی زندگی کی کہانی ان لفظوں میں سمیٹی: ''میں وطن کا سپاہی تھا، وطن کا سپاہی ہوں اور وطن کا سپاہی رہوں گا۔'' تو پیچھے سے آواز آئی۔ ''ترقی نہ کرنا۔'' اس کے باوجود وہ جس امیدوار کو چاہیں، الیکشن میں جتوا سکتے ہیں۔ انہیں بس اتنا ہی کرنا پڑتا ہے کہ اس امیدوار کے خلاف خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ایک تجزیہ نگار کے خیال میں وہ خود بھی الیکشن جیت سکتے ہیں۔ بس انہیں یہ کرنا ہوگا کہ وہ اس حلقے سے الیکشن لڑیں جہاں سے اصغر خان الیکشن لڑ رہا ہو۔

مولانا دستار نیازی

1938ء میں پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہو رہا تھا: ''جناح کو معزول کیا جائے۔'' ہال سے پاٹ دار آواز ابھری اور سب آوازوں پر چھا گئی: ''بدبختو! ہم یہ تسلیم نہیں کرتے۔'' یہ آواز آج بھی ہماری سیاست میں اتنی ہی بلند ہے۔ کم از کم ''بدبختو'' تو آج بھی اتنے ہی زور سے کہتی ہے۔ اسے آج ہم مولانا دستار نیازی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ان کو دور سے دیکھو تو جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے، وہ ان کی دستار ہی ہے۔ جس کا طرہ جیسے ان کے سر پر پچاس برسوں سے کھڑا ہے۔ ایسے تو ہماری سیاست میں کوئی لیڈر پچاس ماہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ مولانا جب نوجوان تھے تو 9 جون تھے۔ اب ان کا بڑھاپا جوانی پہ ہے مگر آج بھی ایسا دبدبہ ہے کہ کوئی کہے کہ میں نے انہیں دبایا ہے تو یقین کر لیں، اس نے ان کی ٹانگوں کو دبایا ہوگا۔ سیاست میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔ ہمیشہ ڈنڈا مارا۔ وہ داڑھی، آنکھیں، ڈنڈا اور سینہ نکال کر چلتے ہیں اور کسی کی نہیں چلنے دیتے۔ ان کے سامنے اگر کسی کی چل رہی ہوتی ہے تو وہ سانس ہی ہوتی ہے۔ غصے میں ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے تصویر میں دکھتے ہیں۔ بغیر داڑھی اور غصے کے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔

میانوالی کے میاں ہیں۔ ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بندہ ایک رات بسر کر لے تو یہی سمجھتا ہے رات مسجد میں ٹھہرا تھا۔ وہ تب بھی مولانا تھے، جب ابھی ان کی داڑھی نہ تھی۔ مولویوں کی طرح سوچتے مگر کہتے نیازیوں کی طرح ہیں۔ یعنی زبان سے سوچتے اور ہاتھ سے کہتے ہیں۔ بچپن میں سکول میں مانیٹر تھے اور ساری

کلاس کے لڑکوں کو نماز پڑھانے لے کر جاتے اور خود ڈنڈا پکڑ کر انہیں دیکھتے رہتے کہ کوئی آدھی نماز پڑھ کر تو نہیں کھسک رہا۔ کلاس نہ رہی مگر وہ ہمیشہ مانیٹر رہے۔ آج بھی گفتگو میں ان کے پاس جو سب سے وزنی دلیل ہوتی ہے، وہ ان کے دائیں ہاتھ نے تھامی ہوتی ہے۔ دوسرے سے جس لہجے میں بات کرتے ہیں، اس سے پتہ چلے نہ چلے کہ وہ دوسرے کو کیا سمجھتے ہیں، یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسروں کو بہرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بندے سے بھی بات کر رہے ہوں تو لگتا ہے عالم اسلام سے مخاطب ہیں۔

وہ واحد سیاست دان ہیں جو ابھی تک واحد ہیں۔ ان سے پوچھو: ''حضرت ذرا عمر بتائیں۔'' تو حضرت عمر کا بتانے لگیں گے۔ ویسے بھی ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ان کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ آج تک جتنی دعائیں مولانا کی شادی کی لیے مانگی گئی ہیں، شاید ہی کسی اور کے لیے کی گئی ہوں۔ مسجدوں، عید گاہوں اور گھروں میں ہر زبان پر یہی خواہش ہوتی ہے۔ یہی نہیں ہر پاکستانی حکومت یہی وعدہ کر کے برسر اقتدار آتی ہے۔ کیونکہ مولانا نے اعلان کیا ہے کہ اس وقت تک شادی نہ کروں گا جب تک ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہو جائے۔ اس سے قبل اداکارہ شمیم آراء نے اعلان کیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو کشمیر فتح کرے گا۔ جس سے ابھی تک ہمیں کشمیر فتح نہ کرنے کی وجہ سمجھ آتی ہے۔ ہو سکتا ہے پاکستان کی ہر برسر اقتدار حکومت دراصل مولانا کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے اسلام نافذ نہ کرتی ہو۔ مولانا عورت کی حکمرانی کے حق میں نہیں۔ اگر ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ فرماتے ہیں ''میری بیوی نہیں، اس لیے سارا وقت سیاست کو

دیتا ہوں۔'' فخر امام صاحب کہتے ہیں: میری بیوی ہے، اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔ مولانا نے سیاست کو بیوی کا وقت ہی نہیں، مقام بھی دیا ہے۔

فرانس کے مثالی سیاست دان رابرٹ شوماں عمر بھر کنوارے رہے۔ ایک صحافی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ میں ساری عمر مثالی بیوی کی تلاش میں رہا۔ صحافی نے پوچھا۔ وہ ملی؟ کہا: ہاں ملی، مگر وہ خود مثالی بیوی کی تلاش میں تھی۔ ''کنوارہ بندہ وہ ہوتا ہے جسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کے مہینے کی تنخواہ کہاں جاتی ہے۔ مولانا کا یہ مسئلہ بھی نہیں۔ انہوں نے تن کو جن آلائشوں سے پاک رکھا، ان میں ت۔ خواہ بھی ہے۔ اگرچہ امارت ایسی چیز ہے جسے ہم خود بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔ جی ہاں۔ دوسرے کی امارت''۔ ویسے بھی غریب ایسی چیز ہے جس پر تمام سیاست دان فخر کرتے ہیں اور اس وقت تک فخر کرتے ہیں جب تک وہ خود غریب نہیں ہوتے۔ مگر مولانا دولت کو ہاتھ کا میل، سمجھتے ہیں اور انہیں میلے ہاتھ پسند نہیں۔

سنا ہے دنیا میں سب احمق نہیں ہوتے، کچھ کنوارے بھی ہوتے ہیں۔ مولانا تو مجرد ملت ہیں۔ سنا ہے مولانا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ ویسے ہمارا خیال ہے بیوی سے ڈرتے ہیں۔ اگر نہ ڈرتے ہوئے تو شادی شدہ ہوتے۔ ایک صحافی نے کہا۔ ''آپ ہمارے دادا کی جگہ ہیں اب شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' کہا اسی لیے نہیں کرتا کہ دادی سے شادی کرتا کون اچھا لگتا ہے''۔

مولانا نوجوانی میں منہ پر اختلاف کرتے اور کبھی کبھی اختلاف اتنا گہرا ہوتا کہ

ڈاکٹر کو اس کی گہرائی کم کرنے کے لیے پٹی کرنا پڑتی۔ ویسے تو اب بھی وہ اس عمر میں ہیں جس میں ہمارے ہاں بات سننے کے لیے آلہ سماعت اور سنانے کے ڈنڈا استعمال ہوتا ہے۔ انہیں لٹھ اور لٹھا پسند ہے۔ 1955ء میں گورنر جنرل غلام محمد کو چڑیوں کا مغز کھلانے کے لیے لکھنؤ سے جو پچانوے سالہ حکیم آئے، ان کے ساتھ جوان کی بیوی تھی جس کی گود میں بچی تھی جسے حکیم صاحب اپنے نسخوں کے تیر بہدف ہونے کا ثبوت کے طور پر ساتھ ساتھ رکھتے۔ مولانا اسی مقصد کے لیے ڈنڈا ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ تو پریس کانفرنس میں بھی یوں آتے ہیں جیسے سکول ماسٹر ڈنڈا لے کر کلاس میں آتا ہے۔

مولانا نیازی جوانی میں بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی لڑ سکتے تھے۔ ویسے تو نیازی ایسے ہوتے ہیں کہ جنرل نیازی اس بڑھاپے میں بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی ہار سکتے ہیں۔ مولانا ایسی بڑی شخصیت ہیں کہ کھانے کی میز پر موجود ہوں تو ان کے لیے واحد حاضر کی بجائے جمع حاضر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ لوگوں کو سر بھاری ہو تو اسپرین کھاتے ہیں ان کا سر بھاری ہو تو غصہ کھاتے ہیں۔ ہر کام اسلام کے لیے کرتے ہیں۔ وہ تو ناشتہ بھی اپنے لیے نہیں، اسلام کے لیے کرتے ہیں۔ جو بات صحیح سمجھتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔ اور جو بات کہہ دیتے ہیں اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ درست بات یوں کرتے ہیں کہ درشت بات لگتی ہے۔ جانتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی جو بات دوسروں کو جتنی کڑوی لگے، سمجھتے ہیں اتنی سچی ہے۔ کوئی کام آرام سے نہیں کرتے۔ وہ تو آرام سے آرام بھی نہیں کرتے۔ ہم نے آج تک انہیں تھکا ہوا نہیں دیکھا۔ اگر آپ کو کبھی وہ تھکے تھکے لگیں تو اس کی وجہ

یہ ہوگی کہ آپ خود تھکے ہوئے ہوں۔

طبیعت ایسی جلالی کہ دعا بھی یوں مانگتے ہیں جیسے سود خور پٹھان قرض۔ ہر مسئلے پر سب سے پہلے ڈٹ جاتے ہیں۔ اکثر تو مسئلے سے پہلے ہی ڈٹ جاتے ہیں۔ نماز کے اس قدر پابند کہ وہ تو ہم عصر بھی اسے مانتے ہیں، جس کے ساتھ عصر پڑھی ہو۔ عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ خواتین کو دیکھ کر ہم بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں، بس راستہ دیکھنے کے لیے ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں۔

سیاست میں جوشیلے نوجوان کے طور پر داخل ہوئے۔ آج تک اپنی کسی بات سے نہیں پھرے۔ یہاں تک کہ آج بھی اتنے ہی جوشیلے اور نوجوان ہیں۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں تھے تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن تھے۔ جے یو پی کے جنرل سیکرٹری تھے تو سیکرٹری کم اور جنرل زیادہ تھے۔ تحریک ختم نبوت میں تو انہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ جب موت کی سزا ملی تو لگا جیسے موت کو سزا ملی۔

مولانا اسلام پورہ میں رہتے ہیں مگر انہیں اسلام پورا پسند ہے۔ اپنی پہلی بات کو آخری بات سمجھتے ہیں۔ اگر آپ نہ مانیں تو ہوسکتا ہے یہ آپ کی بھی آخری بات ہی ہو۔ گدھے گھوڑے کو ایک ہی ڈانگ سے ہانکتے ہیں جس کی وجہ سے بتاتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی ڈانگ ہے۔ ان کی آواز آج بھی اتنی ہی بلند ہے۔ جتنی 1936ء میں تھی۔ مگر ہمارے سیاست دان سرگوشیاں سننے کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ اب انہیں بلند آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ مولانا کی شخصیت کو اگر ایک لفظ میں لکھا جائے تو وہی ہے۔ جس عنوان سے ان کی آپ بیتی چھپی ہے وہ ہے ''میں''......ان کی شخصیت ''میں'' کے گرد گھومتی ہے۔ وہ بات ''میں'' سے شروع کرتے ہیں۔ بات ختم ہوجاتی ہے مگر ''میں'' ختم نہیں ہوتی۔

شی مین

یہ جاننے کے لیے سیاست مرد ہے یا عورت، اس کی پالیسیاں دیکھنا چاہئیں اور بے غم عابدہ حسین ''صاحب'' سیاست کی مرد میدان ہیں۔ کہتے ہیں، عابدہ حسین کو خاتون بنانے کا فیصلہ تو بہت بعد میں کیا گیا، پہلے ان میں ساری مردانہ خصوصیات اکٹھی کی گئیں۔ مگر کاتب تقدیر کی کتابت کی غلطی سے یہ ''وہ'' بن گئیں۔ جس گھر میں پیدا ہوئی، وہ اتنا بڑا تھا کہ اگر کوئی بدھ کو ملنے جاتا تو چوکیدار کہتا: ''اس برآمدے میں سیدھے چلے جائیں اور جمعرات کو دائیں مڑ جائیں۔'' اس گھرانے کی خواتین کے لباس میں تو گھروں کی بلند دیواریں بھی شامل ہوتیں۔ عورتوں کے دوپٹوں کو بھی غیروں سے پردہ کرایا جاتا۔ شریف شرفا تو غیروں کے سامنے بیوی کے جوتے کا ناپ تک نہ بتاتے، مبادا کوئی ہمدردی کرنے لگے۔ اس گھرانے کو پانچ ہزار ایکڑ کا وارث چاہیے تھا۔ جب تک بے غم صاحبہ پیدا نہ ہوئی تھیں ''دلنشیمن'' میں ہر طرف شمعیں جل رہی تھیں اور جب یہ پیدا ہوئیں تو جو چیز جل رہی تھی، وہ ان کی نانی لیڈی مراتب تھیں، جنہیں عورت کے مراتب کا پتہ تھا۔ خود بے غم عابدہ حسین کو اپنا لڑکی پیدا ہونا اتنا برا لگا کہ اپنی پیدائش کے ایک سال بعد تک انہوں نے کسی سے بات نہ کی، مگر بڑی ہو وہ عابدہ حسین کی بجائے عابد حسین بن گئیں۔ یہاں تک کہ جب مارچ 1971ء میں بھٹو صاحب نے انہیں خواتین کی نشست پر الیکشن لڑنے کے لیے کہا تو انہوں نے انکار کر کے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ 1988ء میں جب بے نظیر قائد حزب اقتدار تھیں، بے غم صاحبہ کو

کہا گیا کہ آپ لیڈر آف دی اپوزیشن بن جائیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خاتون کا مقابلہ کرنا کوئی مردانگی نہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جو ڈسٹرکٹ کونسل جھنگ کی چیئر ''مین'' رہیں۔ یہی نہیں وہ شادی میں بھی فخر امام کو بیاہ کر اپنے گھر لائیں۔ مردوں کے ساتھ مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ یہی نہیں عورتوں کے ساتھ بھی مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ شیر افضل جعفری صاحب نے ان کی ''بڑائی'' بیان کرتے ہوئے کہا: ''کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں پر بھاری ہے۔'' جنہوں نے بےغم صاحبہ کو دیکھا ہے وہ کہتے ہیں۔ فقرہ یہ تھا: ''کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں سے بھاری ہے۔''

وہ سیاست میں بے حیثیت عورت نہیں، بحیثیت سیاست دان آئیں۔ ہمارے ہاں جو ہر بار ایسے سیاست دان جیت کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں جس سے ان کی سیاست دانوں کی اہلیت سے کہیں زیادہ عوام کے حافظے کا پتہ چلتا ہے۔ جی ہاں عوام کے کمزور حافظے کا۔ بےغم صاحب پہلی بار جب گھر سے اسمبلی آئیں تو برقع پہن کر۔ پھر اسمبلی میں گھر کر گئیں۔ اب تو اسمبلی میں یوں پھرتی ہیں جیسے گھر میں پھر رہی ہوں۔ سنا ہے وہ جھنگ کے لوگوں کو بہت کم نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو انہیں جب بھی دیکھا بہت نظر آئیں۔ چہرے کے نقوش سے تو ماہنامہ ''نقوش'' لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ ''بھری'' بیٹھی ہیں۔ چہرے اور درازے پر ''ڈوناٹ ڈسٹرب'' کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ ایسے نرم کہ ایک صحافی خاتون نے پوچھا ''آپ ہاتھوں کو ایسا رکھنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟'' کہا: ''ان کو ایسا رکھنے کے لیے ہی تو میں کچھ نہیں کرتی۔'' بچپن میں اپنے پاؤں اٹھا کر مور کی

طرح زمین پر رکھتیں۔ یہی نہیں پاؤں بھی موری کی طرح کے رکھتی ہیں۔ بچپن میں اپنی کلاس کی نمایاں طالبہ تھیں۔ کلاس کو جتنے فاصلے سے دیکھا جاتا، یہی نمایاں نظر آتیں۔ بچپن ہی سے سیاست دان بننے کی صلاحیت موجود تھی، یعنی ہر سال اپنی جماعت بدل لیتیں۔ جب کہ ہمارے دوست ''ف'' تو ایک ہی جماعت سے اتنے کمیٹڈ ہوئے کہ آج کل ان کا ساتویں میں آٹھواں سال ہے۔ غصے میں ایسی انگریزی بولتی ہیں کہ لگتا ہے انگریزی میں نہیں مکمل گرفت نہیں، انگریزی کو ان پر مکمل گرفت ہے۔ کمرے میں انگریزی کتابیں رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ اردو کتابیں بھی رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔

وہ بڑی ہو کر بے نظیر بننا چاہتی ہیں، حالانکہ وہ صرف ''چھوٹی'' ہو کر یہ بن سکتی ہیں۔ ان میں اور بے نظیر میں وہی فرق ہے جو دونوں کے والدوں میں تھا۔

سیاست میں امام وہ نہیں ہوتا جس کی مرضی پر پیروکار چلیں، بلکہ وہ ہوتا ہے جو پیروکاروں کی مرضی پر چلے۔ فخر امام صاحب پنج وقتی آئینی ہیں۔ ان سے کہو چاند بہت خوب صورت لگ رہا ہے تو کہیں گے: ہاں لگتا تو آئین کے مطابق ہی ہے۔ ''1985ء میں وہ اسمبلی کے سپیکر بنے، مگر پھر تحریک عدم اعتماد میں انہیں ووٹ ملے اور وہ ہار گئے تو کسی نے کہا: ''امام کے ساتھ 72 ہی ہوتے ہیں۔'' فخر امام بے غم صاحب کو اپنی ''دنیا'' کہتے ہیں۔ کیوں کہتے ہیں؟ یہ بات ''گول مول'' ہے۔ فخر امام صاحب کے لیے وہ فخر بھی ہیں اور امام بھی۔ وہ مرد عورت کی برابری کی قائل ہے۔ کہتی ہیں۔ مرد اگر باصلاحیت ہو تو وہ عورت کی برابری کر سکتا ہے۔ اگر کوئی مرد ایسا نہ ہو تو اسے برابر کر دیتی ہیں۔ وہ تو تجارتی بنیادوں پر افزائش نسل

کے لیے مرغیاں خریدیں تو بھی جتنی مرغیاں خریدیں گی، اتنے میں مرغے لیں گے۔ ویسے ہم سمجھتے ہیں صرف ایک کام ایسا ہے جو دو مرد تو مل کر کرسکتے ہیں مگر عورتیں دس مل کر بھی نہیں کرسکتیں۔ وہ ہے چپ رہنا۔ بے غم صاحبہ اس موضوع پر بھی بات کردیتی ہیں جس پر سرگوشی ہی کی جاسکتی ہے۔ جو بات نہ سننا چاہیں، اس کے لیے اپنے کان بند نہیں کرتیں۔ کہنے والے کی زبان بند کرتی ہیں۔ دوران گفتگو دوسرے کو اپنی سطح پر نہیں لاتیں اور نہ دوسرے کی سطح پر اترتی ہیں۔ بلکہ اپنی سطح پر رہ کر گفتگو کرتی ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتیں۔ اس لیے عمر پوچھو تو جواب نہیں دیتیں۔ وہ بول رہی ہیں تو لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں، کیونکہ سیاسی خاتون اور گلوکارہ کی یہ خوش فہمی ہی ہوتی ہے کہ لوگ اسے صرف سننے آتے ہیں۔

جس کلچر پر وہ ایگری ہیں۔ وہ ایگری کلچر ہے، لیکن کہتی ہیں: ''میں جاگیر دارنی نہیں ہوں۔'' ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ جاگیر دارنی نہیں ہیں، جاگیر دار ہیں۔ علاقے کے لوگ ان کو سلام بھی کریں تو لگتا ہے معافی مانگ رہے ہیں۔ گھڑ دوڑ پسند ہے۔ اکثر اس میں حصہ لیتی ہیں۔ یہی نہیں جیتتی بھی ہیں۔ اس قدر مصروف کہ ان کے پاس دن بھر کی مصروفیات کی لسٹ دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ یہی ان کی خوشی کا راز ہے۔ فارغ رہتیں تو اپنے وزن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتیں۔ نارمل گفتگو کر رہی ہیں۔ ویسے بھی پاس اور بارش ہوتی ہی برسنے کے لیے ہے۔

عورت کے تخلیقی کاموں کے اس قدر خلاف ہیں کہ جو تخلیقی کام قدرت نے عورت کے ذمے لگایا اسے روکنے کے لیے ''منصوبہ بندی'' کرتی رہیں۔ یوں

پاکستان نے جو عورتیں ضبط تولید کی گولیاں کھاتیں، وہ ترقی پسند خواتین کہلاتی ہیں اور اور جو یہ گولیاں نہ کھاتیں، وہ مائیں کہلواتیں۔ جتوئی صاحب کے دور میں وزیر اطلاعات رہیں۔ ویسے اطلاعات کا شعبہ پیدائشی طور پر خواتین ہی کا ہے۔ آج کل امریکہ میں پاکستانی کلچر کی نمائندہ ہیں۔ پہلے پاکستان میں امریکی کلچر کی نمائندہ تھیں۔

وہ ڈپلومیٹ ہیں۔ ایک سیاست دان نے کسی کو بتایا کہ میں ڈپلومیٹ ہوں تو دوسرا بولا: ''اچھا میں تمھیں غیر شادی شدہ سمجھا تھا۔'' لیکن اس کے باوجود وہ امریکہ میں کسی کو اپنے گھر دعوت نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں یہاں کون سی میری بیوی ہے جو مہمانوں کو پکا کر کھلائے۔

امریکی گفتگو اور لباس میں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ یہ اختصار میں بھی تفصیل سے کام لیتی ہیں۔ انہیں تو بندہ کہہ دے کہ مجھے مونچھیں پسند ہیں تو کہیں گی، مرد کی یا عورت کی۔ جب حکومت ان کی نہیں ہوتی، یہ حکومت کی ہوتی ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے تصویریں بناتیں۔ ان عورتوں سے زیادہ تیز ہیں جوان سے کم تیز ہیں۔ غصے میں منہ کھلا رکھتی ہیں اور آنکھیں بند۔ وہی باتیں چھپاتی ہیں جو وہ نہیں جانتیں۔ ایسی بارعب شخصیت ہیں کہ کچھ نہ بھی کہہ رہی ہوں، تب بھی لگتا ہے کہ کچھ کہہ رہی ہیں۔ مسز تھیچر سے خاوند کو ان سے ملنے سے پہلے محترمہ کے پی اے سے ٹائم لینا پڑتا ہے۔ ایک بار کسی نے تھیچر کے خاوند سے پوچھا: مارگریٹ تھیچر آپ کی بیوی ہیں؟ تو اس نے کہا ''آپ کو اس شے پر کوئی شک ہے''۔

جھنگ کے لوگ انہیں اپنا ہیرو کہتے ہیں۔ سنا ہے کچھ ''عزیز'' انہیں ''چاند''

بھی کہتے ہیں، جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ چاند مذکر ہوتا ہے۔ بہر حال جب تک وہ سفیر بن کر امریکہ نہیں گئی تھیں، لوگوں کو شک تھا کہ پاکستانی سیاست میں بے نظیر واحد خاتون ہیں۔ اب شک نہیں رہا۔

IqbalCyberLibrary.Net
www
All rights reserved.
©2002-2006

شکاری

وہ پاکستان کے ویران صوبے کے آبادسرکار ہیں۔شکل سے بلوچ نہیں، بلوچستان لگتے ہیں۔مونچھیں اتنی نوکیلی کہ ان سے کسی کو زخمی کیا جاسکتا ہے۔چیتے کی پھرتی،عقاب کی نظر،اونٹ کی دشمنی اور شیر سی ہلاشیری ہی نہیں،ان میں اور بھی کئی جانوروں والی خوبیاں موجود ہیں۔وہ بگٹی قبیلے کے سردار ہیں۔یہ اس قدر جنگجو قبیلہ ہے کہ ان کے ہاں جس دن بچہ باہر کسی کو مار کر نہ آئے،اس دن بچے کو مارتے ہیں۔لوگ اپنے ذہن میں خدا کا تصور بنانے کے لیے سردار کو دیکھتے ہیں۔معاف نہ کرنا اور حکم دینا اکبر بگٹی کو ورثے میں ملا ہے۔دوسرے کی بات یوں سنتے ہیں جیسے بادشاہ کسی کی فریاد سن رہا ہو۔خود کو اپنے قد سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔ ویسے ان کا قد ایسا ہے کہ بندہ ان کے پاؤں سر تک پہنچے تو موسم بدل چکا ہوتا ہے۔

دوران تعلیم کوئی پوچھتا: آپ کس کلاس میں ہیں؟ تو کہتے: اَپر کلاس میں۔ استاد پوچھتا: ہوم ورک کیا ہے؟ تو کہتے: ہمارے ہاں ہوم میں ورک نوکر کرتے ہیں۔ہر معاملے میں خود کو دوسرے سے بڑا سمجھتے ہیں۔وہ تو دس سال کی عمر میں بھی تیس سال کے لوگوں سے خود کو بڑا سمجھتے۔ایچی سن کالج میں ان کی تعلیم کے دوران جب چیانگ کائی شیک دورے پر آیا تو بچوں کی لائن میں کھڑا کر کے ان سے ہاتھ ملانے کو کہا گیا۔جب معزز مہمان موصوف تک پہنچے تو یہ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔اب بھی جب کسی ''معزز مہمان'' کو آتا دیکھتے ہیں،ایسے ہی کرتے ہیں۔

لمبی بات نہیں کرتے،بات اتنی مختصر کرتے ہیں کہ جونہی دوسرا متوجہ ہوتا ہے،

بات ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اتنی مختصر ہوتی ہے کہ اس کے لیے منہ بھی ہلانا نہیں پڑتا۔ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے زور سے نہیں بولتے، بلکہ چپ ہو جاتے ہیں۔ اس قدر صاف گو کہ بچپن میں بھی اس وقت کسی نے ان کے منہ سے جھوٹ نہ سنا جب تک دو باتیں نہ کرنے لگے۔ انگریزی ادب اس قدر پسند ہے کہ جس کا ادب کرنا چاہیں، انگریزی میں کرتے ہیں، کہتے ہیں: انگریزی پر میری گرفت ہے۔ واقعی ان کی انگریزی قابل گرفت ہے۔ سنا ہے جب وہ اردو کے خلاف ہوں تو اردو نہیں بولتے، حالانکہ جب وہ اردو بولتے ہیں تو یہی لگتا ہے کہ وہ اردو کے خلاف ہیں۔

مجلس میں کوئی ایسی گفتگو یا واقعہ نہیں سناتے جس میں ان کی حیثیت ثانوی ہو۔ اس لیے وہ قیام پاکستان پر گفتگو نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے بیٹے کی شادی میں بھی تقریب کے دولہا خود ہی ہوتے ہیں۔ وہ کام نہیں کرتے، جو سب کر سکیں۔ وہ کتاب تک نہیں پڑھتے، جسے سب پڑھ سکیں۔ سیاست دانوں میں بیٹھے ہوں تو ان کی آنکھوں میں مستعدی ہوتی ہے۔ جیسے مچان پر بیٹھے ہوں۔ ان سے پوچھو: کس کا شکار پسند کرتے ہیں؟ تو کہیں گے: شکاری کا۔ نواب اکبر بگٹی ایک بار نصر اللہ خان سے ناراض ہوئے تو کہا: آپ میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ آپ نواب زادہ ہیں اور میں نواب ہوں۔

خود کو اپنی جماعت کا حصہ نہیں سمجھتے، جماعت کو اپنا حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ کسی جماعت میں کھپ نہیں سکتے۔ جس جماعت میں جائیں، وہاں کھپ پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مخلوط حکومتیں ہی نہیں، حکمران بھی مخلوط ہوتے ہیں لیکن کسی مس کا لیڈ

کرنا موصوف کے نزدیک مس لیڈ کرنا ہے۔ حکومت آسان اور حکمرانی مشکل ہے اور وہ حکمرانی کرتے ہیں، حکومت نہیں۔ ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھا۔ وہ تو سوتے وقت بھی سر اونچا رکھتے ہیں، چاہے اس کے لیے دو تکیے کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ بھٹو مرحوم نے انہیں بلوچستان کے تخت پر یوں بٹھایا جیسے ہمارے ہاں چھوٹوں کو پاؤں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سے پوچھو: دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو وہ کہے گا ہوتے تو چار ہیں مگر آپ فلاں کنسلٹنٹ سے سیکنڈ اوپینین لے لیں اور فلاں فلاں ٹیسٹ کروا لیں۔ سیاست دان سے پوچھو: دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو وہ کہے گا۔ آپ کتنے چاہتے ہیں۔ مگر اکبر بگٹی کے علاقے میں دو اور دو اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے موصوف کہیں۔ وہ تو قبیلے کے کسی فرد کو زندہ دفن کرنے کا حکم دیں تو لوگ پھر بھی کہیں گے: دفن تو کیا مگر اتنے رحم دل ہیں کہ مار کر نہیں۔ وہ دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر بھی آپ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ذہین و ''فطین'' اکبر بادشاہ کی آنکھوں میں ماضی کے ذکر سے چمک آجاتی ہے۔ جس سے لگتا ہے اب جوان نہیں ہے۔ ویسے بندتب بوڑھا ہوتا ہے۔ جب اسے پتہ چلے کہ پچاس کا ہو گیا، لیکن انہوں نے آج تک خود کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا۔

Mathematics اتنی کمزور کہ ایما ڈنکن نے ان سے پوچھا: آپ نے ان ہاتھوں سے کتنے لوگوں کو قتل کیا؟ تو انہوں نے کہا مجھے گنتی یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اس عمر میں قتل کرنے شروع کر دیئے ہوں جب ابھی گنتی سیکھنا شروع بھی نہیں کی تھی۔ انہیں موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں۔ ان سے ملو تو موت

سے پہلے زندگی پر بھی ایمان نہیں رہے گا۔ ان میں ایک خوبی وہ بھی ہے جو کسی سیاست دان میں نہیں۔ جس میں ہو وہ سیاست دان نہیں، وہ اپنی رائے کے غلط ہونے کا سر عام اعتراف کرنا۔ وہ بزدل سیاست کے بہادر سیاست دان ہیں۔ کہتے ہیں: میں کسی سیاسی پارٹی میں نہیں آ سکتا۔ مجھ میں کئی سیاسی پارٹیاں آ سکتی ہیں۔ دشمنی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں تک دشمنی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں: میں جو سوچتا ہوں وہ کرتا ہوں۔ حالانکہ وہ جو کرتے ہیں اس سے تو یہ نہیں لگتا کہ وہ سوچتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ آپ کی بات سن رہے ہیں یا نہیں، آسان طریقہ ہے۔ اگر آپ ان کا ذکر کر رہے ہیں تو وہ سن رہے ہیں۔ اگر نہیں کر رہے تو وہ نہیں سن رہے۔ سیاست دان تو لوگوں کے مسائل کو وسائل بنا کر جیتے ہیں اور وسائل کو لوگوں کے لیے مسائل بنا دیتے ہیں۔ مگر ان کا ذریعہ روزگار سیاست نہیں۔ ان کے تو قبیلے کے لوگ کبھی روزگار کی تلاش میں کہیں نہیں گئے۔ روزگار ان کی تلاش میں سوئی کے مقام پر آیا۔ یہ Suiside موصوف کی اجازت کے بغیر Suicide ہے۔ ان کی پسندیدہ شخصیت ہٹلر ہے۔ مگر یہ بات اس طرح بتاتے ہیں جیسے وہ ہٹلر کی پسندیدہ شخصیت ہوں۔ کہتے ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں خود سے بڑا آدمی آج نہیں دیکھا۔ واقعی جو ان سے بڑا نکلا، اسے دیکھا بھی نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ذات پر پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں سو سنسار کی ایک سردار کی۔ اگرچہ سردار اتنے سیاست میں نہیں ہوتے۔ جتنے لطیفوں میں ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ سردار کتنا ہی سیانا کیوں نہ ہو لوگ پھر بھی اسے سردار جی ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ بلوچ ہی نہیں بے

لوچ سردار بھی ہیں۔ سیاست میں اپنے بچوں کے والد کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔

غیر سنجیدگی کا مظاہرہ بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کسی افوہ پر یقین نہیں کرتے۔ جب تک سرکاری طور پر اس کی تردید نہ ہو جائے۔ ان کے کئی محافظ ہیں جن کا دعویٰ ہے جب تک موصوف کی زندگی ہے، ہم انہیں مرنے نہیں دیں گے۔ موصوف بے اختیار اپنے اختیار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ کھانوں میں انہیں مرچیں پسند ہیں۔ ان کے کھانے میں مرچیں نہیں ڈالی جاتیں، مرچوں میں کھانا ڈالا جاتا ہے۔ بڑوں میں انہیں چھوٹے پسند ہیں۔ ان کے غسل خانے کے باہر میڈونا کی تصویر دیکھ کر ایماڈنکن نے پوچھا: آپ نے یہ تصویر غسل خانے کے باہر کیوں لگائی؟ کہا: غسل خانے کے اندر گیلی ہو جاتی ہے۔ اس قدر تنہائی پسند کہ قوالی ناپسند ہے۔ کیونکہ اس میں گانے والا تنہا نہیں ہوتا۔ ویسے وہ گانا سنتے ہی نہیں، دیکھتے بھی نہیں۔ گانے والے کو داد یوں دیتے ہیں جیسے تسلی دے رہے ہوں۔ کہتے ہیں بھٹو صاحب میرے کلاس فیلو تھے۔ واقعی بھٹو کا تعلق بھی اس کلاس سے تھا جس سے ان کا تھا۔ ان کا سیاسی کہنہ سالی ذکر کرو تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ کہنہ سالی کہنے پر ناراض تو سالی کو ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں یہ فخر کی بات ہے کہ اے۔ کے۔ بروہی مجھے پڑھاتے رہے۔ مگر کہتے اس انداز سے ہیں جیسے یہ اے۔ کے۔ بروہی کے لیے فخر کی بات ہو۔

جو شخص کچھ نہیں جانتا، مگر سمجھتا ہے وہ سب جانتا ہے۔ اس کے لیے سیاست بہترین پیشہ ہے۔ موصوف بھی یہی پیشہ کرتے ہیں۔ ہم نے تو ہر کام صفر سے

شروع کیا۔ یہاں تک کہ عمر بھی صفر سے شروع کی۔ لیکن وہ سردار ہیں اور سرداروں کا صفر بھی بارہ سے شروع ہوتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ آپ اس کے دوست ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔ اتنا کم سوتے ہیں کہ پوچھو نیند کب آتی ہے؟ تو کہیں گے: ''جب سویا ہوا ہوں''۔

خوشامد غور سے سنتے ہیں کہ خوشامد کرنے والا دراصل وہی کچھ کہہ رہا ہوتا ہے جو وہ خود کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ اتنا وہ نہیں بولتے جتنا ان کی تصویریں بولتی ہیں۔ ویسے مرد خاموش ہو تو آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے اور عورت جب تک خاموش نہ ہو، آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے۔

وہ مولوی خولیا کے مریض ہیں۔ مذہبی معاملات پر یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے لطیفہ سنا رہے ہوں۔ دین کے بارے میں ان کا نظریہ وہی ہے جو شہنشاہ اکبر کا تھا۔ البتہ ان دونوں حکمرانوں میں یہ فرق ہے کہ شہنشاہ اکبر کے پاس نورتن تھے اور ان کے پاس No رتن ہیں۔

غُل خان

وہ چپ بھی ہوں تب بھی لگتا ہے کہ بول رہے ہیں۔ ایک بار بولیں تو کئی بار سنائی دیتے ہیں۔ لہجہ ایسا کہ کانفرنس کو بھی خانفرنس کہتے ہیں۔ پشتو سے اس قدر محبت کہ انگریزی تک پشتو میں بولتے ہیں۔ بولتے وقت کان، لفظ اور غصہ بہت کھاتے ہیں۔ اگر ان کی بات بہت طویل ہو جائے تو سمجھ لیں وہ اپنی بات کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی ہر بات پر اس قدر یقین ہوتا ہے کہ خود کو "ولی" کہتے ہیں۔ بات کے اس قدر پکے کہ جو بات آج کہیں گے، بیالیس سال بعد بھی وہی کہیں گے۔ شاید اس لیے آج بھی وہی بات کر رہے ہیں جو بیالیس سال پہلے کیا کرتے تھے۔ وہ تو جو لطیفہ ایک بات بار سنا دیں، پھر جب بھی لطیفہ سنائیں گے وہی سنائیں گے۔ ضیا کے مارشل لاء لگانے پر یہ لطیفہ سناتے کہ ایک شخص گدھے پر چوڑیوں کی گٹھڑی لیے جا رہا تھا ایک سپاہی نے روکا اور ڈنڈا مارتے ہوئے پوچھا: اس میں کیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا: اگر آپ نے ایک بار پھر یہ ڈنڈا مارا تو پھر اس میں کچھ نہیں ہے۔ وہ زبان سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جب بول رہے ہوں تو سمجھ لیں سوچ رہے ہیں۔ غصے میں بول رہے ہوں تو یہی لگتا ہے فائرنگ کر رہے ہیں۔ سنا ہے وہ غصے میں اپنے علاوہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ یہ غلط ہے وہ غصے میں اپنی بھی نہیں سنتے۔

اس خاندان میں آنکھ کھولی، جس نے ابھی تک آنکھ نہیں کھولی۔ جیسے میرا دوست "ف" کہتا ہے، مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ میرے سات بھائی ہیں اور ان

میں سے ایک کشمیری بھی ہے۔ یہ کہتے ہیں، مجھ سے سیاست کی بات ہوش سے کرو۔ میرا باپ ''گاندھی'' بھی رہا ہے۔ پہلے نیشنل عوامی پارٹی کو بیگم نسیم ولی خان سمجھتے، آج کل نسیم ولی خان کو نیشنل عوامی پارٹی سمجھتے ہیں۔ ان کے والد کی اتنی بڑی ناک تھی کہ دھوپ میں انہیں چھتری کی ضرورت نہ پڑتی۔ ناک منہ پر سایہ کیے رکھتی۔ غل خان کی بھی ایسی خوب ناک ہے کہ وہ ناک کی اوٹ میں چھپ سکتے ہیں۔ ان کی تو چھوٹی انگلی بھی بڑی ہے۔ دونوں باپ بیٹوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ باپ عمر میں بڑا تھا۔ ان کے کان دیکھ کر بندہ سوچتا کہ قدرت کتنی فیوچرسٹک ہے۔ اس نے اس وقت ایسے کان بنانے شروع کر دیئے جب ابھی انسان کے دامن ذہن میں عینک بنانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اس عمر میں ہیں جس وگ کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ لیکن بال سفید ہوئے تو کیا ہوا، عینک تو سیاہ ہے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں یا اللہ ایسی چشم بینا عطا فرما کہ دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت نہ پڑے۔ ان کی نظر گاندھی آشرم میں لاٹھی لگنے سے خراب ہوئی۔ تب سے پاکستان کو اسی خراب نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کام جو دل لگا کر کرنے چاہئیں وہ کام بھی عینک لگا کر کرتے ہیں۔ نہرو جیکٹ پہنتے ہیں، جو اپنی حالت سے واقعی ہی نہرو کی لگتی ہے۔ طویل عرصہ قیوم خان اور آشوب چشم میں مبتلا رہے۔ تاہم اب بھی صحت کا پوچھو تو کہیں گے۔ Fit. Fighting ہوں۔ ویسے بھی جس پٹھان کا لڑنے کو دل نہ چاہے۔ یقین کر لیں وہ فٹ نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کو اپنی آنکھیں دکھا دکھا کر یہ حالت ہو گئی ہے کہ اب تو جو بھی ملے۔ اسے آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔ یادداشت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ یادداشتہ لگتی ہے۔ جب کہ نسیم ولی خان کا

حافظہ تو اتنا کمزور ہے کہ ان کے اپنے بیٹے بھی تھے سوتیلے بیٹے بھی مگر اب ان سے پوچھو کہ سوتیلا کون ہے تو کہیں گی: میں بھول گئی ہوں۔

پاکستان بننے سے پہلے وہ کانگریس کے رکن تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سے کانگریس ان کی رکن ہے۔ گاندھی جی سے بہت متاثر ہیں۔ گاندھی جی کو غریب رہنے کے لیے بہت خرچ کرنا پڑا۔ ایسے ہی انہیں چپ رہنے کے لیے بہت بولنا پڑتا ہے۔ اپنی پارٹی کو اپنی ذات سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی پارٹی پر فقرہ کسو تو سمجھتے ہیں کہ ذاتیات پر اتر آئے ہیں۔ ان کی تو پارٹی میں کوئی دوسرا آ جائے تو اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے گھر میں کوئی دوسرا آ گیا ہے۔ وہاں تو شیر باز مزاری بھی شیر ہوتا ہے۔ نہ باز، بس مزاری ہوتا ہے۔ کسی کو معاف نہیں کرتے۔ انہوں نے تو کبھی خود کو معاف نہیں کیا۔ کبھی کبھی اپنی پارٹی کو سیر کرانے لاہور لاتے ہیں مگر وہ ان کے واپس چارسدہ پہنچنے سے پہلے چارسدہ پہنچ چکی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں: میں تا حکم ثانی محب وطن ہوں۔ اپنی سیاسی اہلیت و اہلیہ کی وجہ سے پاکستان میں اہم مقام رکھتے ہیں اور یہ اہم مقام چارسدہ ہے۔ والد سے سیاست سے زیادہ باغبانی کا شوق ورثے میں ملا۔ وہ تو باغ باغ ہونا سے مراد وہ باغ ہونا لیتے ہیں۔ ولی باغ میں رہتے ہیں مگر یوں جیسے باغی باغ میں رہنے والے کو ہی کہتے ہیں۔ وہ کسی مہمان کے سامنے چائے کے ساتھ بسکٹ رکھ دیں تو مہمان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ بسکٹ اصلی نہیں یا یہ اصلی "ولی خان" نہیں۔ وہ سانپ پر لاٹھی نہیں مارتے، لاٹھی پر سانپ مارتے ہیں۔ تقریر میں ضرب الامثال یوں لگاتے ہیں جیسے امثال کو ضرب لگا رہے ہوں۔ کوئی بات سمجھ نہ آئے تو اس کے لیے نسیم اللغات نہیں بیگم نسیم کو دیکھتے

ہیں۔ان کی پارٹی کا نصف بہتر ان کی نصفت بہتر ہے۔ گفتگو میں ''جی'' بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔اگر وہ فقرے کے آخر میں جی لگائیں تو سمجھ لیں گھر سے باہر گفتگو کر رہے ہیں۔گھر میں وہ فقرے سے پہلے جی لگاتے ہیں۔

وہ بیگم نسیم ولی خان کا مردانہ روپ ہیں، لیکن وہ بیگم صاحبہ سے بڑے سیاست دان ہیں۔ پندرہ سولہ سال بڑے ہیں۔انگلینڈ جا کر جم کر لکھتے ہیں: جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہاں اتنی سردی پڑتی ہے کہ بندہ نہ لکھے، پھر بھی جم جاتا ہے۔اپنے بھائی عبدالغنی خان کی طرح تخلیقی آدمی ہیں۔وہ تو تاریخ بھی لکھ رہے ہوں تو لگتا ہے تخلیق کر رہے ہیں۔البتہ ان کی آپ بیتی کم اور اپنے آپ بیتی زیادہ لگتی ہے۔ جیل میں تنہائی اور فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خدائی خدمتگار تحریک کے دو حصے مکمل کر لیے اور کہا جونہی پھر تنہائی اور فرصت میسر آئی، کتاب کا آخری حصہ مکمل کرلوں گا۔اس اعلان کے بعد کسی حکومت نے انہیں جیل نہیں بھیجا۔یاد رہے خدائی خدمت گار اتنی مذہبی پارٹی رہی کہ اس کے سربراہ کا انتخاب براہ راست خدا کے ہاتھ میں ہوتا۔جس کو سربراہ کی کرسی سے اٹھاتا، خدا ہی اٹھاتا۔

لائبریری اچھی جگہ ہے بس وہاں کتابیں نہ ہوں۔ویسے کتاب سے رشتہ تب شروع نہیں ہوتا جب آپ کتاب شروع کرتے ہیں بلکہ تب سے شروع ہوتا ہے جب آپ کتاب ختم کرتے ہیں۔ولی خان کتابوں کے پرانے رشتے دار ہیں۔ چپل اور چپل کباب پسند ہیں۔بڑھاپے میں اتنے جوان ہیں، پتہ نہیں جوانی میں کتنے بوڑھے رہے ہوں گے۔انہیں غصہ بہت آتا ہے۔کبھی تو اس بات پر غصہ آ جاتا ہے کہ مجھے فلاں بات پر غصہ کیوں نہیں آتا ہے۔غصہ اتنا غضب ناک کہ وہ تو

اپنے ہی غصے سے ڈر کر کانپنے لگتے ہیں۔ بقول پیر پگاڑہ: ایک تو ولی جو ہوتا ہے گرم ہے اور اوپر سے پٹھان یعنی بہت ہی گرم۔ قابل کو کابل کہتے ہیں۔ بھٹو انہیں اس لیے ناپسند نہیں کہ اس کی وجہ سے انہیں اندر جانا پڑا بلکہ اس وجہ سے کہ بیگم نسیم کو باہر آنا پڑا۔ تب سے بیگم نسیم ولی خان باہر ہیں اور خان صاحب اندر۔ کہتے ہیں۔ بھٹو دور میں تقریر پر پابندی تھی۔ حالانکہ یہ درست نہیں تقریر پر کب پابندی تھی۔ مقرر پر تھی۔ بھارت سے اس کی زبان میں بات کرتے ہیں جب کہ پاکستان سے پشتو میں بات کرتے ہیں۔ ایک بار حکومت نے انہیں بھارت میں پاکستان کا سفیر بھیجنا چاہا تو بھارت کی حکومت نے کہا: ''آپ کسی پاکستانی کو بھیجیں''۔

ارسطو نے کہا ہے انسان ایک سیاسی جانور ہے۔ پتہ نہیں یہ بات انہوں نے جانوروں سے ملنے کے بعد کہی یا سیاست دانوں سے۔ تاہم غل خان ایسے سیاست دان ہیں۔ ایک سیاست دان کو پتہ چلا کہ غل خان پان کھاتے ہیں نہ سگریٹ پیتے ہیں، شراب سے دلچسپی ہے نہ شباب سے تو اس نے کہا: ''آپ نے یہ کچھ کرنا ہی نہیں تو پھر سیاست کیوں کر رہے ہیں؟'' ترقی پسند نظریات کی وجہ سے چل رہے ہیں۔ قوم پرست ہیں۔ ہر وقت آپ وافغان کرتے رہتے ہیں۔ وہ بیگم نسیم ولی کے مزاجی خدا ہیں۔ ان کا مزاج پٹھان کی طرح ہے جو ہینگ لے کر آیا اور چلا چلا کر کہتا: ''اینگ لے لو۔ جو چپ کر کے گزر جاتا، اسے کچھ نہ کہتا۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ مجھے ہینگ نہیں چاہیے تو خان غصے میں آ کر کہتا: خو تم اینگ کیوں نہیں لیتا۔ ہم تمہارے باپ کا نوکر ہے جو تمہاری واسطے اتنی دور سے اینگ لایا ہے۔''

غل خان لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں، جس رگ پر ہاتھ رکھیں وہ

ضرور دکھنے لگتی ہے۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کے پاس ہر حل کے لیے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ ہے انا۔ سرحد میں پیدا ہی نہیں ہوئے، سیاست کے لحاظ سے بھی ہمیشہ سرحد پر ہی رہتے ہیں۔ پٹھانوں کا تو محبت کرنے کا اندازہ بھی اپنا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتے ہیں: ''خاناں وہ ہم کو اتنا اچھا لگتا ہے کہ دل چاہتا ہے اسے گولی مار دوں۔'' سردی گرمی ہر موسم میں گرم۔ ایک زمانہ تھا وہ لطیفہ بھی سنا رہے ہوتے تو لگتا دھمکی دے رہے ہیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دھمکی بھی دیں تو لگتا ہے لطیفہ سنا رہے ہیں۔ ہم انہیں ضدی تو نہیں کہتے مگر جسے ضدی کہنا ہو، اسے غل خان کہتے ہیں۔

پکاسو کی بیوہ

پاکستان بننے سے قبل سکھوں کے شہر ننکانہ میں ایک لڑکا ہاتھ میں ڈانگ لیے گزرتا تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگتیں: ''بابا ڈانگ، بابا ڈانگ''۔ یہ بچہ ہر وقت ہاتھ میں ڈانگ اس لیے رکھتا کہ اس کے ددھیال والے اس کی ماں سے اچھا سلوک نہ کرتے۔ اسے اپنی امی سے اتنا پیار تھا کہ جب وہ بڑا ہو کر مصور بنا تو تصویر پر اس نے اپنا جو نام لکھا، اس میں بھی امی آتا تھا۔ وہ تھا ''رامی'' یہ الگ بات ہے کہ تصویر دیکھ کر لوگوں نے نام کو یوں ادا کرنا شروع کیا کہ احتیاطاً رامی کی بجائے رامے لکھنے لگے۔ وہ اداکار جتندر کے ہم عمر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل رامے پچاس سے اوپر ہیں جب کہ جتندر پچیس سے اوپر کے۔ ویسے بھی اداکار، بیوی اور کار جب پرانی ہو جائے تو چالیس سے اوپر نہیں جاتی۔ بہر حال ان دونوں دوستوں نے اداکاری کے مختلف فیلڈ چنے اور کامیاب رہے۔

والدہ انہیں بچپن میں جھوٹ بولنے سے منع کرتیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ بیٹا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ رامے صاحب جب کسی واقعہ پر حیران ہوں تو انہیں چپ لگ جاتی ہے۔ اپنی پیدائش کے تین سال بعد تک نہ بولے۔ چھوٹے تھے تو کئی سال بعد بولنا آیا۔ بڑے ہوئے تو کئی سال بعد چپ ہونا نہ آیا۔ فلسفے میں داخلہ لیا۔ ہر گتھی سلجھالی۔ جو گتھی سلجھنے کی بجائے الجھنے لگی۔ اس سے شادی کر لی۔ ماں اور بیوی نے ان کی شخصیت پر ایسا اثر ڈالا کہ آج بھی وہ 50 فیصد ماں اور 50 فیصد بیوی ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن پنجاب کی زنانہ آواز، عابدہ حسین پنجاب کی مردانہ

آواز اور رامے پنجاب کی درمیانہ آواز ہیں۔ جوان کی آواز ایک بار سن لے، پھر وہ انہیں محترم نہیں، محترمی کہہ کر ہی بلاتا ہے۔

سیاست اور محبت میں جو کرتے ہیں، وہ جائز ہوتا ہے۔ صرف وہ ناجائز ہوتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں۔ پہلے سیاست دان کرپٹ ہوتے تھے، آج کل کرپٹ سیاست دان ہو گئے ہیں۔ رامے خود کو اس سیاست کا باغی کہتے ہیں۔ انہیں مل کر باغی سے مراد باغ میں آنے جانے والا ہی لیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں میں مڈل کلاس سے ہوں۔ ہم نے سنا ہے مڈل کلاس سے تو غلام حیدر وائیں صاحب تھے۔ رامے تو ایم اے ہیں۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے مڈل کلاس کی نمائندگی کی ہے تو یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم خود مڈل کلاس کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مڈل کلاس میں ہم مانیٹر تھے۔

1957ء میں ''نصرت'' نکالا۔ بعد میں نصرت پیپلز پارٹی کا ترجمان بنا۔ اب تو نصرت پیپلز پارٹی کی ترجمان ہیں۔ بھٹو دور میں رسالے ''نصرت'' پر اپنے نام سے پہلے ''طابع'' لکھتے مگر اسے ''تابع'' پڑھتے۔ سولہ ماہ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں اور سولہ ماہ شاہی قلعے میں قید رہے۔ لوگ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جب وہ وزیر اعلیٰ تھے تو لوگ وزیر اعلیٰ ہاؤس کے سامنے جا کر کہتے: ''وزیر اعلیٰ کو رہا کرو''۔ لیکن یہ آج تک یہی سمجھتے تھے کہ عوام کہتے تھے: وزیر اعلیٰ رہا کرو: آج بھی نام کے ساتھ وزیر اعلیٰ یوں لکھتے ہیں جیسے ڈاکٹر اپنے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔

روزنامہ ''مساوات'' سے نکل کر مساوات پارٹی بنائی۔ دونوں میں یہ فرق تھا

کہ روزنامہ ''مساوات'' میں کارکن زیادہ تھے۔ پارٹی کا اس قدر خیال رکھتے کہ جب کہیں باہر جاتے تو ہمسایوں سے کہہ کر جاتے کہ اس کا خیال رکھنا، آ کر لے لوں گا۔ ریٹرن ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں وہ تو الیکشن میں بھی ریٹرن ٹکٹ پر ہی Suffer کرتے ہیں۔

مصور فطرت کی عکاس ہوتی ہے۔ جی ہاں مصور کی فطرت کی۔ پینٹنگ دیکھنے کا اصول یہ ہے کہ خود نہ بولو، پینٹنگ کو بولنے دو۔ رامے صاحب نے تجریدی مصوری کو بہت توجہ دی۔ ویسے بھی تجریدی مصوری اتنی توجہ مانگتی ہے کہ مصور کا ذرا دھیان ادھر اُدھر ہو جائے تو بھول جاتا ہے۔ کہ کیا بنا رہا تھا۔ سکھوں کے شہر میں پیدا ہوئے، مگر اپنی گفتگو سے اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے بدصورتی کو بڑی خوب صورتی سے پینٹ کرتے ہیں۔ مصوری میں وہ پکاسو کی بیوہ ہیں۔ کسی تصویر کو کپڑے پہنا دیں تو اس کی طرف یوں دیکھیں گے جیسے کوئی سخی کسی ننگے کو لباس پہنانے کے بعد دیکھتا ہے۔ بچپن میں ٹریس کر کے تصویریں بناتے اور مار کھاتے۔ ہمارے تو ایک جاننے والے مصور نے ٹریس کر کے تصویر بناتے ہوئے بیوی سے مار کھائی کیونکہ وہ ایک ماڈل حسینہ سے تصویر ٹریس کر رہے تھے۔

جہاں بلند بولنا ہو، وہاں سرگوشی کریں گے۔ جہاں سرگوشی کرنا ہو، وہاں خاموشی کریں گے۔ انہیں تو ایک آدمی سے بات کرنے کے لیے بھی مائیک چاہیے۔ اس قدر آہستہ بولتے ہیں کہ زور لگا کر سننا پڑتا ہے۔ ان کا چہرہ ایک بار دیکھ لو تو ایک بار ہی یاد رہتا ہے۔ بار بار دیکھو تو بار بار بھولے گا۔ انہیں ہر مشکل پسند

آتی ہے۔وہ تو مشکل کو مہ شکل سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی آواز کبھی بیوی کے قد سے بلند نہیں ہونے دی۔ان کی پسندیدہ شخصیت ان کی بیوی کا شوہر ہے۔ہر بیوی کے جذبات کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اگر انہیں پتہ ہو کہ مجھے آج مرنا ہے تو وہ سب سے پہلے جو کام کریں گے وہ یہ ہو گا کہ اپنی بیوی کو تعزیتی کارڈ ارسال کریں گے۔سکول میں ان کی نرم طبیعت ،قوت برداشت اور صبر کی وجہ سے ایک بار سکول ٹیچر نے کہا تھا: ''یہ مستقبل کا مستقل شوہر ہوگا''۔آج کل دنیا کی سپر پاور امریکہ ہے۔رامے صاحب کی ''دنیا'' کی سپر پاور بھی آج کل ایک امریکن ہی ہے۔

کہتے ہیں اقتدار کا بھولا شام کو پارٹی میں آجائے تو بھولا نہیں کہلاتا۔البتہ اگر وہ رات کو پارٹی میں آئے تو اور بات ہوگی۔انہیں اگر ڈاکٹر کہے کہ آپ کی صحت کے لیے تبدیلی ضروری ہے تو صبح تک پارٹی بدل لیں گے۔کہتے ہیں: ''میں نے زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ دیکھی ہے، وہ سورج ہے۔'' واقعی چڑھتے سورج کو ان سے زیادہ کس نے دیکھا ہو گا۔استاد تھے تو طبیعت میں شاگردی تھی۔ طبیعت میں استادی آئی تو سیاست میں آ گئے۔انہیں ہر وقت ایک بندہ چاہیے جس کی تعریف کر سکیں۔اگر کوئی نہ ملے تو شادی کا سوچنے لگتے ہیں۔کافی اس قدر پسند ہے کہ صرف وہی چیز لیتے ہیں جو کافی ہو۔ہم تو کہتے ہیں مشروبات ہیں ہی دو طرح کے۔ایک کافی اور دوسرے ناکافی۔

صاحب! جس نے کبھی عورت سے محبت نہیں کی، وہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتا اور جس نے عورت ہی سے محبت کی۔ وہ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ادب نے ان کا

قدر بحیثیت سیاست دان کم کیا اور سیاست نے ان کا قد بحیثیت ادیب کم کیا۔ کہتے ہیں، میری تحریروں میں علم وفضل کی کمی نظر آئے تو ادیب سمجھ کر معاف کر دیں۔

محمد حنیف رامے وہ تصویر ہیں جو انہوں نے خود بنائی ہے۔ کبھی انہوں نے اسے ایک سیاست دان وزیر اعلیٰ کی شکل دی، کبھی ترقی پسند صحافی کی، کبھی ''پنجاب کا مقدمہ'' لڑنے والے ادیب کی، کبھی مقرر اور کبھی دانشور کا روپ دیا اور کبھی ان سب پر خط تنسیخ پھیر ہاتھ میں برش پکڑ کر خود تصویر کی جگہ آ کھڑے ہوئے۔ یہ وہی بابا ڈانگ ہے جو خود تو وہی کا وہی رہا مگر اس کی ڈانگ گھستے گھستے قلم اور برش ہو گئی۔

☆

عروس العلماء

دیکھنے میں ناصح کہنے میں ناسخ۔ غصے میں نیازی اور اگر آپ غصے میں ہوں تو جنرل نیازی۔ حیات محمد خان کوثر نیازی کا پہلا ہاف میانوالی میں پیدا ہوئے اور دوسرے نے لاہور میں جنم لیا۔ وہ میاں والی کے میاں بن سکے نہ والی، اور لاہور تو ہے ہی لاہور۔ مگر میاں والی کے حیات محمد لاہور کی کوثر بن گئے۔ اداکاراؤں کے لیے حوض کوثر اور علماء کے استفادے کے لیے خوض کوثر۔ حیاتی، حیات محمد کی مونث و مونس رہی۔ جماعت نے کوثر کو مولانا کے پیچھے لگایا اور مولانا کوثر نیازی بنا۔

بچپن میں حیات ایسی حرکتیں کرتا کہ دیکھنے والا کہ اٹھتا: ''واحیات'' کلاس میں ٹیچر سوال پوچھتا تو یہ سب پہلے ہاتھ کھڑا کرتے اور جب تک فارغ ہو کر آتے ،سوال کا جواب دیا جا چکا ہوتا۔ بچپن میں ہی سے مذہب اور میٹھے سے لگاؤ تھا۔ ویسے اگر کوئی مولوی کہے، مجھے میٹھا ناپسند ہے تو سمجھ لیں یہ جھوٹ ہے۔ اگر وہ سچ بول رہا ہے تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ وہ مولوی ہے۔ پڑھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑھانے لگو۔ سو یہ سکول ٹیچر ہو گئے۔ بچپن ہی سے بارلیش اور بارش بھاتی۔ حیات محمد کو ''کوثر'' رسالے نے نام دیا۔ Weekly کوثر نہ چلا مگر Weekly کوثر چل نکلے۔ پھر ''شہاب'' کے بانی ایڈیٹر ہوئے مگر شہاب کے آؤٹ ہونے سے ایک دن پہلے ہی آؤٹ ہو جاتے۔ شہاب ایسا پرچہ تھا جس پر پرچہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس رسالے کو پڑھنے کے لیے بڑا سمجھدار ہونا ضروری تھا۔ جو اس معیار پورا نہ اترتا، وہ اسے پڑھ تو نہ سکتا، اس میں لکھ سکتا تھا۔

وہ جیسے سیاست دان ہیں، ایسے ہی ادیب ہیں اور جیسے ادیب ہیں ویسے ہی سیاست دان۔ ان لوگوں سے زیادہ عالم ہیں جوان سے کم عالم ہیں۔ جتنا انہوں نے لکھا، ہمارے ہاں اتنا کاتب لکھتے ہیں۔ وہ صرف کاتب ہی سے ڈرتے ہیں کیونکہ کاتب تقدیر کے بعد کاتب تحریر ہی جنس بدل سکتا ہے۔ ایک بار کاتب نے انہیں نامزد امیدوار لکھا مگر ''ز'' کا نقطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی ''نکاتی'' ہوئی۔ انہوں نے تین درجن کتابیں لکھیں۔ ویسے بھی ان کی کتابیں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں کہ آٹھ کتابوں میں درجن پوری ہو جاتی ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خاص کر کے اس وقت جب وہ ختم ہوتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پر لکھی ان کی کتاب ''دیدہ ور'' پر کسی نقاد نے کہا کہ آج ایسی کتابیں ایک سو دس روپے میں بک رہی ہیں، اچھے وقتوں میں اتنی قیمت میں ساتھ مصنف بھی خریدا جا سکتا تھا۔ صدیق سالک کی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس کا نام ''میں نے ڈھاکہ ڈبوتے دیکھا'' ہونا چاہیے تھا۔ ایسے ہی مولانا کی کتاب ''اور لائن کٹ گئی'' کا نام ہونا چاہیے تھا: ''اور لائن کاٹ دی''۔ ''زرگل'' اور ''لمحے'' دو شعری مجموعے ہیں جن کے باہر لکھا ہوتا ہے کہ یہ شعری مجموعے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو پتہ چل سکے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ ادبی تقریبات کے صدور والی ان میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یعنی سوتے ہوئے خراٹے نہیں لیتا۔ کوثر وہ شاعر ہیں جن کی وجہ سے ایک گھر میں طلاق ہوگئی۔ ایک میاں روز اپنی بیوی سے کہتے: مجھے کوثر کا یہ شعر پسند ہے۔ وہ شعر پسند ہے۔ بیوی نے تنگ آ کر کہا اگر تمہیں کوثر اتنی اچھی لگتی ہے تو اسے لے آؤ۔ میں چلی۔ مولانا

نے ساری عمر نثر بولی۔ سوانح عمری لکھنا چاہ رہے ہیں۔ مغرب میں جو رائٹر فکشن لکھنا چاہے، وہ ناول یا افسانہ لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کام کے لیے سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں دیکھ کر یہ نہیں لگتا کہ دریا کو کوزے میں سمیٹا گیا ہے۔ لگتا ہے کوزے کو دریا میں سمیٹا گیا ہے۔ کسی شاعر کا کلام سنائیں تو لگتا ہے، اپنا کلام سنا رہے ہیں اور اپنا کلام سنائیں تو لگتا ہے کسی اور کا سنا رہے ہیں۔

بول رہے ہیں تو ایک صحافی نہیں لگتے، دو لگتے ہیں۔ ایسے مقرر کہ لگتا ہے اسی کام کے لیے مقرر ہیں۔ وہ تو شعر سنائیں تو لوگ مکرر نہیں کہتے، مقرر کہتے ہیں۔ جیسے کارٹونسٹ فیکا کارٹون بناتے بناتے اس مقام پر آ گیا ہے۔ کہ یونہی لکیریں کھینچے تو کارٹون بن جاتا ہے۔ بلکہ بندہ تو اس کی تصویر کھینچے تو کارٹون بن جاتا ہے۔ ایسے ہی مولانا دیکھنے میں بھی آواز لگتے ہیں۔ چپ ہوں تب بھی سنائی دیتے ہیں۔ انہوں نے گلے کے زور پر سیاست کی۔ ان سے قبل غلے کے زور پر سیاست ہوتی۔ ویسے ہم نے آج تک جس کو متاثر کیا، خاموش رہ کر کیا اور دوسرا اس وقت تک متاثر رہا جب تک ہم خاموش ہے۔ یہ غلط ہے کہ مولانا جب بولتے ہیں تو سنتے نہیں۔ حالانکہ وہ تو بولتے ہی تب ہیں جب سننا ہو۔ تقریر محبت کی طرح ہوتی ہے۔ اسے ہر بے وقوف شروع تو کر سکتا ہے۔ مگر اختتام تک نہیں لے جا سکتا۔ کچھ ہی بے وقوف اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ وہ برنارڈ شا کی طرح فی البدیہہ مقرر ہیں اور برنارڈ شا کہتا ہے، میں دنیا کے چند فی البدیہہ بولنے والے مقرروں میں سے ایک ہوں۔ کیونکہ میں نے فی البدیہہ بولنے کی ریہرسل کی ہوتی ہے۔ مولانا تو یہ بتانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیں گے کہ بس ایک منٹ بولوں گا۔

دوسروں کے دکھ سکھ میں ایسے شریک ہوتے ہیں کہ آپ کی شادی پر یوں شاد ہوں گے کہ نئے آنے کو پوچھنا پڑے گا کہ شادی کس کی ہے۔ ایسے خطیب کہ جو کہتے ہیں، اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ جہنم کا ذکر کر رہے ہوں تو لگتا ہے، آنکھوں دیکھا حال نشر کر رہے ہیں۔ ٹی وی پر مبلغ تین سو روپے میں مبلغ بنتے رہے۔

ہر پارٹی میں چلے جاتے ہیں، بشرطیکہ پارٹی کے منشور میں کھانا ہو۔ وہ اکیلے بھی کھا رہے ہوں تو لگتا ہے پارٹی کھا رہی ہے۔ مغز بہت کھاتے ہیں۔ یوں ان کے پیٹ میں بھی مغز ہے۔ ایک بار ان کو کھاتا دیکھ کر کسی نے لکھ دیا کہ یوں کھاتے ہیں جیسے آخری بار کھا رہے ہوں تو ناراض ہو گئے۔ سو اسے یہ لکھنا پڑا کہ یوں کھاتے ہیں جیسے پہلی بار کھا رہے ہوں۔ ویسے وہ اس کی دوا بھی لیتے رہے کہ کھانا کھانے سے بھوک نہیں لگتی۔ پوچھو: کھانوں میں زیادہ کیا پسند ہے؟ تو کہیں گے زیادہ کھانا پسند ہے۔ کھانے والی چیزوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ کھانے کا اس قدر شوق کہ کسی کی بات پسند آئے تو کہیں گے: ''بڑی لذیذ بات ہے۔''

جسے دور کرنا چاہیں اس کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لوگ انہیں مولانا کوثر نیازی بھی کہتے ہیں۔ پیر پگاڑہ صاحب نے کہا: ''مولانا کوثر نیازی اتنے ہی مولانا ہیں جتنے ہم پیر ہیں اور ہم اتنے ہی پیر ہیں جتنے وہ مولانا ہیں۔'' وہ سیاست میں بعد میں آئے، پہلے ان میں سیاست آئی۔ ان میں اتنی انٹیلی جنس ہے، جتنی انٹیلی جنس والوں میں ہوتی ہے۔ شورش کاشمیری کے بقول ''بھٹو کی مردم شناسی دیکھئے، اطلاعات بہم پہنچانے والے کو انہوں نے مشیر اطلاعات بنا دیا۔''

تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ ہم تو تاریخ کا علم اس لیے نہیں رکھتے کہ وہ بڑی جلدی بدلتی ہے۔ آج دس تاریخ ہے تو کل گیارہ ہوگی۔ مولانا تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ چاہیں تو رانی جھانسی کو رانی جھانسہ بنا دیں۔ ذہین و ''فتین'' مولانا کے کلام میں بڑی ''فسادت و بلوغت'' ہے۔ فطرت پسند ہے۔ جی ہاں! اپنی فطرت پسند ہے۔ انہوں نے ڈبل لائف گزاری۔ ویسے تو ہمارے ہاں اکثر لوگ ڈبل لائف ہی گزارتے ہیں۔ ایک اپنی اور ایک اپنی بیوی کی۔

فلمی سنسر بورڈ میں تھے تو کوئی سین سنسر کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے یقین کر لیتے کہ یہ سین فحش ہے اور اس وقت سین بار بار دیکھتے جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ سین فحش ہے۔ لیکن اس قدر باحیا کہ اس سین کو ساتویں بار دیکھ کر بھی ان کے کان اتنے ہی سرخ ہوتے، جتنے پہلی بار دیکھ کر ہوتے۔ ان دنوں اداکاراؤں کے ساتھ جتنی ان کی تصویریں چھپتی، اتنی تو ان اداکاراؤں کی اپنے خاوندوں کے ساتھ نہ چھپی ہوں گی۔ تصویروں میں اکثر اداکارائیں ان کا سانس روکے کھڑی ہوتیں۔

اسلام سے اس قدر محبت ہے کہ ہر کام اسلام کو آباد دیکھنے بلکہ اسلام آباد کو دیکھنے کے لیے کیا۔ یہ علم کا وہ چشمہ ہیں جس میں حکمران غرارے کرتے رہے۔ غرارے انہیں بھی پسند ہیں: بشرطیکہ پہننے والے پسند کے ہوں۔ مہمان اچھے ہیں اور اچھا مہمان وہ ہوتا ہے جو میزبان سے کہے کہ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھٹو دور میں ڈاکٹر نے میٹھے سے منع کیا تو خوشی کے موقع پر یہ کہنے کی بجائے کہ منہ میٹھا کرواؤ کہا کرتے: منہ کڑوا کرواؤ۔

بغیر سوچے سمجھے بات نہیں کرتے۔ کیونکہ بغیر سوچے سمجھے بات کرنے سے بعد

میں پریشانی ہوتی ہے، حالانکہ سوچ سمجھ کر بات کرنے سے پہلے پریشانی ہوتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار جو کتاب لائبریری سے پڑھی۔ وہ سکھوں کے گرونانک کے بارے میں تھی۔ اس سے بہت متاثر ہیں مگر جب تک غصے میں نہ ہوں اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی ذاتی لائبریری اتنی بڑی ہے کہ وہاں کتاب ڈھونڈنے میں اتنی دیر لگتی ہے جتنی پورے لاہور سے ڈھونڈنے میں لگتی ہے۔ کہتے ہیں میں صرف معیاری کتابیں پڑھتا ہوں۔ ٹھیک کہتے ہیں ہم نے کبھی انہیں اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا۔ 1970ء میں جیل ہی میں قومی اسمبلی کے ممبر چنے گئے تو کسی سے کہا: دیکھا! حالانکہ میں بند تھا اور لوگوں سے مل نہ سکتا تھا۔ تو سننے والے نے کہا۔ اسی لیے تو جیت گئے۔

میاں طفیل محمد کے طفیل پتہ چلا کہ جب کوثر نیازی جماعت اسلامی میں تھے تو ایوب خان کے ساتھ تھے۔ جب ایوب خان کے پاس تھے تو بھٹو کے ساتھ تھے اور جب بھٹو کے ساتھ تھے تو پتہ نہیں، اندر سے کس کے ساتھ تھے۔ بہر حال مولانا وہ شخص ہیں جو ان پر پہلی بار بھی یقین کر رہا ہوتا ہے۔ وہ بھی دراصل آخری بار کر رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں، مولانا کوثر نیازی نے کسی سے بے وفائی نہیں کی ہے۔ انہوں نے صرف ایک شخص سے بے وفائی کی ہے اور اس کا نام ہے ''مولانا کوثر نیازی''۔

مُلّا دو پلازہ

جس مولوی کا پیٹ بڑا نہ ہو، اس کے مولوی ہونے پر شک ہونے لگتا ہے کہ لوگ تو مولوی کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، مگر مولوی اپنے پیٹ کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن دیکھنے میں مولوی لگتے ہیں، یعنی پیدل بندہ ان کی شلوار میں نالا نہیں ڈال سکتا۔ یہ سپر ہیوی ویٹ مولانا سیاست میں لائیٹ ویٹ مولانا ثابت ہوئے۔ ان کی پالیساں اتنی دھندلی ہوتی ہیں کہ پارٹی ورکروں کو بھی نظر کی عینک لگا کے دیکھنا پڑتی ہے۔ ان کی پارٹی ایسی ہے کہ جس پارٹی کے ساتھ ہو، اسے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ بلکہ خود مولانا کو اخبار کے دفتر فون کر کے پوچھنا پڑتا ہے کہ آج ہم کس کے ساتھ ہیں؟

وہ جمعہ کے روز جمعیت العلمائے اسلام کے گھر اس وقت پیدا ہوئے، جب گھر والے جمعہ کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ وہ جب پیدا ہوئے تب بھی مولانا تھے۔ عین جوانی میں بوڑھے ہوئے اور 26 سال کی عمر میں 62 سالہ ناظم اعلیٰ بنے۔ مولانا مفتی محمود نے آدھی عمر اللہ سے ''فضل'' مانگا اور باقی آدھی عمر اس کی صحت دیکھ کر کہا: ''میرے گھر میں اللہ کا بڑا ''فضل'' ہے۔'' مفتی صاحب کے انتقال کے بعد جمعیت علمائے اسلام کا انتقال مولانا فضل الرحمٰن کے نام ہو گیا۔ پارٹی ورکروں نے انہیں یوں مانا جیسے مفتی صاحب کا فتویٰ مان رہے ہوں۔ مولانا سیاست میں بڑے باپ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اور ابھی تک ان کی یہی حیثیت ہے۔ وہ اس سے کم عمر کے بیٹے ہیں جس عمر کے وہ نظر آتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر کے

ہیں جس عمر کے اپنے بیانوں سے لگتے ہیں۔ وہ جمعیت کے امیر اور سیاست کے غریب ہیں۔ سیاست میں کسی سے اتنی دشمنی نہیں رکھتے کہ اس سے دوستی نہ ہو سکے اور کسی سے اتنی دوستی نہیں رکھتے کہ اس سے دشمنی ہو سکے۔ کوئی بات خلاف مرضی ہو تو ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ پٹھان ہیں اور پٹھانوں کی مرضی کے خلاف بات کی جائے تو چہرہ ضرور سرخ ہوتا ہے، مگر بات کرنے والے کا۔ دوستوں کا پتہ نہیں، البتہ ان کا لباس چند ہی دنوں میں تنگ آ جاتا ہے۔ شلوار قمیض تو ایک طرف، انہیں تو دھوتی کرتا تنگ ہو جاتا ہے۔ ان کا عرض بڑا طول ہے۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے ہیں۔ ''ف'' کہتا ہے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں بھی جب لباس پہنتا ہوں تو وہ سفید ہی ہوتا ہے۔ ایک رومال کاندھے پر اور ایک سر پر باندھتے ہیں۔ تبدیلی چاہیں تو سر کے رومال کو کاندھے پر رکھ لیتے ہیں اور کاندھے والا سر پر باندھ لیتے ہیں۔ کسی عورت کو ننگے سر دیکھنا تو دور کی بات ہے آج تک کسی عورت نے انہیں ننگے سر نہیں دیکھا۔

سنا ہے مولانا فٹ بال نہیں کھیل سکتے کہ جہاں فٹ بال رکھ کر ہٹ لگا سکیں وہاں فٹ بال ہو تو نظر نہیں آتا اور جہاں سے فٹ بال نظر آتا ہے وہاں سے وہ ہٹ نہیں لگا سکتے۔ ہری پور جیل میں ان کا ساٹھ پاؤنڈ وزن کم ہوا تو انہوں نے خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔ میرا دوست ''ف'' کہتا ہے انہوں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میں جیل جاتے وقت ساٹھ پاؤنڈ کا نہیں تھا۔ ورنہ جیل سے باہر کیا نکلتا؟ اگرچہ منہ سے نکلی بات اور پیٹی سے نکلا پیٹ واپس نہیں آتا، پھر بھی وہ جیل جا رہے ہوں تو سمجھتے ہیں سلمنگ سنٹر جا رہا ہوں۔ کہتے ہیں پیاز کھانے سے بھی دوست اور

وزن کم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک نشست میں کئی بیٹھکیں لگاتے اب ایک بیٹھک کئی نشستوں میں لگاتے ہیں۔ پسندیدہ کھانا ثرید ہے کہ یہ وہ کھانا ہے جسے کھانے والا مولوی ہو تو کھانا نہیں بچتا اور اگر مولوی نہ ہو تو کھانے والا نہیں بچتا۔ مولانا جو کھاتے ہیں وہ سب کے سامنے ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تو جو کھا چکے ہوتے ہیں، وہ بھی سب کے سامنے ہوتا ہے۔

کہتے ہیں چائے سے انکار کفر ہے۔ اس لیے چائے کی دعوت قبول کر رہے ہوں تو لگتا ہے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مہمان نواز ہیں جو چند گھڑیوں کے لیے ان کا مہمان ہو۔ اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہو۔ کسی مہمان کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔ ایک بار مولانا درخواستی انہیں ملنے آئے تو ان کے پاس انہیں دینے کو کچھ نہ تھا۔ سو آدھی جمعیت علمائے اسلام دے دی۔ البتہ محترمہ بے نظیر بھٹو ان کے گھر آئیں تو محترمہ کو وہ تحفہ دیا جو محترمہ نے آج تک سنبھال کے رکھا ہے۔ انہوں نے محترمہ کو دو پٹہ دیا تھا مولانا کو میٹھے میں میٹھا رنگ پسند ہے۔

صوبہ سرحد کا مزاج ایسا ہے کہ وہاں بندہ اپنے کمرے سے بیوی کے کمرے میں جائے تو بھی بندوق لے کر جاتا ہے۔ مگر مولانا مسلح محافظوں کی بجائے مصلی محافظوں کے ساتھ پھرتے ہیں۔ وہ کلاشنکوف سے زیادہ کیمرے سے ڈرتے ہیں۔ جیل میں پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے جیل یوں جاتے ہیں جیسے لائبریری جا رہے ہوں۔ فرماتے ہیں مجھے زندگی میں پھل، پھول، رنگ اور خوشبو ایسی چیزوں پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا۔ انہوں نے جس گھر میں آنکھ کھولی۔ وہ مذہب اور سیاست کی یونیورسٹی تھا۔ والد محترم مفتی محمود صاحب نے اپنی زندگی میں

انہیں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے منع کیا، جس سے اندازہ لگائیں کہ وہ کتنے دور اندیش تھے۔ کہتے ہیں دیکھنے میں وہ مفتی محمود سے جتنی مماثلت رکھتے ہیں اتنی مماثلت اپنے آپ سے نہیں رکھتے۔ انہوں نے جمعیت علمائے اسلام اور گاڑی چلانا خود ہی سیکھا۔ صلاحیتیں اور انداز سیاست ایسا ہے کہ انہوں نے بقول مارشل لاء حکومت کو اس بات کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔ کہ مجھے وزارت کی پیشکش کرتی۔ ممکن ہے مارشل لاء والے ڈرتے پیشکش نہ کرتے ہوں کہ کہیں یہ قبول ہی نہ کرلیں۔

ادب سے اتنا لگاؤ ہے کہ "نظم" کا پوچھو تو کہیں گے' آج کل میں چلا رہا ہوں اس قدر، رحم دل ہیں کہ جب کار چلانے لگیں تو ساتھ بیٹھنے والے سے پوچھ لیتے ہیں کہ اس کے چھوٹے بچے تو نہیں۔ من کی بات سب کو بتا دیتے ہیں' بات من سے کم کی ہو، تب بھی سب کو بتا دیتے ہیں۔ ان کی ہلکی پھلکی باتوں میں بھی بڑا وزن ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو ہر بات بتا کر چلتے ہیں۔ وہ تو لطیفہ سنانے سے پہلے بتا دیتے ہیں۔ کہ یہ لطیفہ ہے تا کہ سننے والوں کو پتہ ہو۔ زیادہ بولتے ہیں نہ کم۔ اتنا دیکھتے نہیں جتنا دکھتے ہیں۔ بات سنجیدہ کرتے ہیں مگر مزاحیہ انداز میں۔ جب کہ سیاست دانوں کا انداز سنجیدہ ہوتا ہے۔ بات مزاحیہ۔ وہ عورت کو آدھا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنی گھریلو زندگی میں اسے پورا کیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آپ نے دوسری شادی کرنے کے لیے کیا کیا؟ تو یہی کہیں گے: اس کے لیے پہلی شادی کی۔

رمضان واحد مہینہ ہے جس میں وہ گھر پر رہتے ہیں۔ اس لیے گھر میں ان کے

قیام کو تیسرا دن ہو جائے تو گھر والے سحری کا انتظام کرنے لگتے ہیں۔ وہ سیاست میں کئی آدمیوں پر بھاری ہوں نہ ہوں وہ کئی آدمیوں سے بھاری ضرور ہیں۔ انہیں کرسی کا لالچ نہیں کیونکہ ان کے ہاں سب کچھ فرشی نشستوں پر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والد کے کام کو ترقی دی۔ وہ ایک پارٹی چھوڑ کر گئے تھے، انہوں نے اسے ترقی دے کر دو بنائیں۔ وہ دنیا سے زیادہ دین کا علم رکھتے ہیں۔ ان کی سیاست بھی ایسی ہے کہ اس کا اجر اگلی دنیا میں ہی ملے تو ملے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مدرس ہیں اور جمعیت علمائے اسلام کو یوں چلا رہے ہیں جیسے مدرسہ چلا رہے ہوں۔ سیاست میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو فلموں میں مسرت شاہین کو۔ مذہب کے یہ مُلّا دو پیازہ سیاست کے مُلّا دو پلازہ ہیں۔

☆

مس پریشانی

عورت اچھی حکمران ہوتی ہے کیونکہ اس کا حکومت کرنے کا بڑا تجربہ ہوتا ہے۔شاید ہی کوئی خاتون ایسی ہو جس نے کسی پر حکومت نہ کی ہو۔اس کے باوجود پاکستان جیسے ملک میں اب خاتون وزیراعظم صرف اسی صورت میں کہلا سکتی ہے کہ اس کا نام وزیر بی بی ہو اور وہ کسی اعظم نامی شخص سے شادی کر لے۔لیکن مس پریشانی وہ واحد خاتون ہیں جو پاکستان کی وزیراعظم رہیں۔دنیا انہیں مڈیم ڈیموکریسی کے نام سے جانتی ہے۔اس لیے انہیں کھانسی بھی لگ جائے تو ہمیں جمہوریت کے خلاف سازش لگتی ہے۔محترمہ میں دو بڑی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج وہ بین الاقوامی قد کی لیڈر رہیں۔ان میں ایک یہ ہے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہے اور دوسری بھی یہی ہے۔ان کا نام بےنظیر نہ ہوتا،تب بھی لوگ انہیں یہی کہتے۔جیسے اصغر خان کا نام یہ نہ بھی ہوتا تب بھی وہ سیاست میں اصغر ہی ہوتے۔

سر شاہنواز بھٹو مس پریشانی کے نرم دل دادا اور سیاست کے سخت دلدادہ تھے۔بچپن میں بھی محترمہ گول میز کانفرنس اور سمٹ کانفرنس کے نتائج یوں سنتیں جیسے ان کے ہم عمر ورلڈ کپ کرکٹ کی سکور سنتے۔تعلق اس خاندان تھا جہاں بچے سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتے رہے ہیں۔بچپن میں اگر محترمہ سے پوچھا جاتا کہ غریب آدمی سے متعلق آپ کیا جانتی ہیں تو یہی کہتیں کہ غریب وہ ہوتا ہے جس کی کوٹھی میں سب غریب ہو۔اس کا کار کا ڈرائیور، اس کے ملازمین۔اس کے

کارخانے کا چوکیدار غرض کہ اس کا ہر بندہ غریب ہو۔ بچپن میں رنگ ایسا تھا کہ سرخ گلاب کے پھولوں میں چلی جاتیں تو گھر والوں کو ڈھونڈنے میں مشکل ہوتی۔ آواز قد سے بھی بلند۔ ان کی تو سرگوشی ایسی کہ میلوں تک سنائی دے۔

پیٹر گلبرتھ کے بقول ''محترمہ ریڈکلف سے بی اے، آکسفورڈ سے ایم اے لیکن پی ایچ ڈی سکھر کی جیل سے کی۔'' 16 برس کی عمر میں جب وہ ریڈکلف گئیں تو اپنی عمر سے بہت چھوٹی تھیں، مگر باپ کی پھانسی کی ایک رات نے 25 سالہ بچی کو کئی سال بڑا کر دیا۔ ان کا پچیسواں سال مشکل سے گزرا۔ میرا دوست ''ف'' کہتا ہے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میری بیوی نے بھی پچیسواں سال بڑی مشکل سے کہیں جاکے ساتھ آٹھ سال میں گزارہ۔ وہ بچی تھیں تو بھائیوں کا بڑا بھائی بننا پڑتا۔ جوان ہوئیں تو والد بننا پڑا۔ شادی ہوئی تو خاوند بننا پڑا۔ اتنی پریشانیاں دیکھیں کہ اب جس دن پریشانی نہ دیکھنا چاہیں، آئینہ نہیں دیکھتیں۔

کوئی پوچھے کہ اس دنیا میں ایک سیاست دان سے زیادہ قابل اعتبار آدمی کوئی ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب یہی ہوگا کہ دو سیاست۔ مگر وہ واحد سیاست دان ہیں جن سے کوئی امید ہو سکتی ہے، ویسے بھی وہی امید سے ہو سکتی ہیں۔ محترمہ ذوالفقار علی بھٹو سے کئی لحاظ سے برتر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو کا والد اتنا بڑا لیڈر نہ تھا جتنا بڑا محترمہ کا باپ تھا۔ محترمہ نے سیاسی سفر کا آغاز گھر سے نہیں، جیل سے کیا۔ اگرچہ ان کے ہاں جیل کا آغاز بھی گھر سے ہوتا ہے۔ محترمہ اپنے والد کے ادھورے مقاصد کی تکمیل کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں اور ان مقاصد میں سے ایک اقتدار حاصل کرنا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پورے وزیراعظم تھے، ملک آدھا تھا۔ گواہی کے حساب سے یہ وزیراعظم بھی آدھی ہی تھیں۔ ان کا نعرہ ہے، اسلام ہمارا دین، سوشلزم ہمارا الٰہ دین اور جمہوریت ہماری ڈِین ہے۔ بھٹو مرحوم سے کسی نے کہا تھا کہ آپ جاگیرداری نظام کیا ختم کریں گے، پہلے اپنی زمینیں تو غریبوں میں تقسیم کریں۔ بھٹو صاحب نے یہ سن کر کہا کہ میری زمینیں تو اتنی ہیں کہ ان کو پاکستان کے غریبوں میں بانٹا جائے تو ہر فرد کے حصے میں صرف پندرہ پیسے آئیں گے۔ یہ لو اپنے حصے کے پندرہ پیسے اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ محترمہ کو بھٹو عزم تو نہ ملا، بہرحال بھٹو ازم مل گیا۔ بھٹو صاحب صرف ایک کو ولی مانتے تھے وہ تھا میکاولی۔ وہ اکثر دوروں پر محترمہ کو ساتھ رکھتے۔ شملہ معاہدے پر بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ جب معاہدوں پر دستخط ہوں تو بے نظیر موجود ہو۔ وفد کے ارکان نے کامیابی اور ناکامی کا کوڈ مقرر کر رکھا تھا اگر ناکام ہوئے تو کہیں گے لڑکی ہوئی ورنہ لڑکا۔ سو رات ساڑھے بارہ بجے ارکان ''لڑکا ہوا ہے'' کہتے ہوئے محترمہ کے کمرے کی طرف آئے اور سامنے محترمہ کو دیکھا تو کہا ''لڑکا...... ہوئی ہے''۔

کہتے ہیں خدا نے مرد کو پہلے بنایا، پھر عورت کو پیدا کیا۔ عورت کو پہلے اس لیے پیدا نہ کیا کہ خدا آدم کو کسی کے مشورے بغیر بنانا چاہتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک خاتون ہے جو صرف مانگنے پر مشورہ دیتی ہے وہ ہے لیڈی ڈاکٹر۔ مگر مس پریشانی نے کبھی مشورہ نہیں دیا ہمیشہ فیصلہ دیا ہے۔ اس سے قبل مرد ہی عورتوں کو فیصلے دیتے آئے ہیں، محترمہ کے والد امیر عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے، اس لیے ان کی پہلی بیوی امیر بیگم تھی۔ مس پریشانی نے زردار چنے۔ مگر شادی کے بعد وہ مسز

زرداری نہ بنیں۔ مس بے نظیر نے اپنے خاوند کو مسٹر بے نظیر بنا دیا۔ مسٹر بے نظیر خود بڑی خوبیوں والے ہیں۔ جیسے وہ سانس لیں تو صاف ہوا اندر جاتی ہے ان کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ چلیں تو سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ شوہر کامدار ہیں جنہیں بیوی کی تقریر سننے کے لیے دیر سے گھر جانے کی بجائے جلدی اسمبلی جانا پڑتا ہے۔ مس پریشانی کا بحیثیت وزیراعظم 20 ماہی اقتدار دراصل ماہی کا اقتدار ہی تھا۔

کہتے ہیں عابدہ حسین بے نظیر سے بڑی سیاست دان ہیں۔ جنہوں نے عابدہ حسین کو دیکھا ہے وہ مانتے بھی ہیں۔ عابدہ حسین تو اتنی بڑی ہیں کہ بندہ ان سے بات کر رہا ہو تو اسے لگتا ہے وہ اجتماع سے خطاب کر رہا ہے۔ جبکہ محترمہ کی صحت مندی کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی صحت۔ مندی ہی ہے۔ پارٹی کے لوگ ہر کام ان سے پوچھ کر کرتے ہیں وہ تو یہ بھی پوچھتے ہیں کہ بی بی سوموار کو پارٹی لائن کے مطابق کون سا دن ہو گا۔ اس بار دسمبر کے مہینے میں مارچ آئے گا؟ جن سیاست دانوں کے پیچھے لاکھوں ہوں، انہیں نظر نہیں آتا اور اگر ان کے پیچھے کوئی نہ ہو تو وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ مس پریشانی کو اس معاشرے میں لاکھوں لوگ چاہتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایک بھی مرد چاہے تو یہ بھی چھوٹی بات نہیں سمجھی جاتی۔ محترمہ اپنی ذات سے نہیں، ذہانت سے متاثر کرتی ہیں۔ ویسے ذہانت عورت کی وہ خوبی ہے جس کا نہ ہونا بھی خوبی سے کم نہیں۔

پورے کام کو آدھا نہیں کرتیں، آدھے کام کو پورا کرتی ہیں۔ ان ملکوں میں رہیں جہاں عورتوں کا لباس دیر سے شروع ہوتا ہے اور جلد ختم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ

اب ایسا لباس پہنتی ہیں جو جلد شروع ہو جاتا ہے اور دیر سے ختم ہوتا ہے۔ وہ جمہوریت کی شہزادی ہیں۔ ان سے پوچھو: ''جمہوری حکومت سے کیا مراد ہے؟'' کہیں گی: ''ہماری حکومت''۔ سندھی کو مادری زبان کہتی ہیں۔ ان کی مادری زبان ان کی والدہ کو نہیں آتی۔ بچپن میں محترمہ نے دوسرے بچوں سے پہلے بولنا شروع کر دیا۔ اب بھی اپنی پسند کی آواز سننا چاہیں تو بولنے لگتی ہیں۔ سننا تو اب تک نہیں آتی۔ انہیں نے اردو کا ٹیوٹر رکھا تا کہ اردو کی غلطیاں نکال سکے۔ حالانکہ ان کی اردو پڑھ کر لگتا ہے کہ ٹیوٹر کو ان کی درستیاں نکالنا چاہئیں۔ اب بھی محترمہ کی اردو سمجھنے کے لیے اردو کی سمجھ ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا انگریزی کی۔ اردو کی املا تو اب بھی ایسی ہے کہ عامر کو آمر، ذیابیطس کو ضیابیطس کو ضیاء الحق کو ضیاع الحق ہی لکھتی ہیں۔ البتہ آمر یوں کہتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں: ''آ......مر''۔

مقرر ایسی کہ کمیونزم پر کئی گھنٹے ایک فقرہ بھی اس کی حمایت اور مخالفت میں کہے بغیر تقریر کر سکتی ہیں۔ دوسرے لیڈروں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ جیسی باتیں دوسرے سیاست دان سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں، وہی یہ سوچ کر کہتی ہیں۔ جتنا وہ کام کرتی ہیں اور نہیں تھکتیں اتنا تو ہم آرام کریں تو تھک جائیں۔

مصروفیت کا یہ عالم کہ خاوند سے ملاقات ہونا تو دور کی بات، کئی کئی ماہ محترمہ کی خود سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ خوف زدہ لڑکی ہیں اور خوف زدہ لڑکی سے نڈر کوئی نہیں ہو سکتا۔

سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق ہے۔ جب پسند کی سوانح عمری کو دل چاہا تو اپنی سوانح عمر لکھ دی۔ بڑی بات پر خوش نہیں ہوتیں۔ البتہ چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض

ہو جاتی ہیں۔ شروع میں پارٹی میٹنگز میں کوئی ان سے اختلاف کرتا تو روتی ہوئی اٹھ جاتیں۔ اب یہ کام اختلاف کرنے والے کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ بقول ''کرسٹینا لیمب'' وہ بحیثیت وزیراعظم سرکاری دعوتوں میں کھانوں اور برتنوں پر زیادہ توجہ دیتیں۔ اتنی توجہ اس مسئلے پر نہ دیتیں جس وجہ سے یہ دعوت دی ہوتی۔ ایسے دل کی ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ کا پکا کھانا بلی کھا لے تو انہیں دکھ ہوگا کہ اس وقت تک اداس بیٹھی رہیں گی جب تک آپ یقین نہ دلا دیں کہ بلی بچ جائے گی۔ انہیں پاکستانی سفید بلیاں پسند ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستانی سفید بلیاں کالی نہیں ہوتیں۔

عمر کے معاملے میں عورتوں کا یہ رویہ رہا ہے کہ جب وہ چھوٹی ہوتی ہیں تو چاہتی ہیں انہیں بڑا سمجھا جائے اور جب بڑی عمر کی ہو جاتی ہیں تو چاہتی ہیں، انہیں چھوٹی سمجھا جائے۔ مگر محترمہ ان خواتین میں سے ہیں جو کسی کو خود سے بڑا نہیں سمجھتیں۔ وہ تو چچوں کو یوں بلاتی ہیں جیسے بچوں کو بلا رہی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت کم سے کم دوست اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دشمن بنانے کا گر جانتی ہیں۔ مولویوں کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے۔ جو مولویوں کی ان کے بارے میں ہے۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر کے سٹائل میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا ان کے ہیئر سٹائل میں۔

کہتی ہیں میں سیاست دان نہ ہوتی تو اخبار کی ایڈیٹر ہوتی۔ ویسے ہر عورت میں ایڈیٹر بننے کی پیدائشی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ خاوند کی جیب ان سے اچھی کون ایڈیٹ کر سکتا ہے۔ کہتی ہیں بلاول کو وکیل بناؤں گی یا فوجی جرنیل۔ فیصلہ صحیح ہے

اگر فوجی جرنیل بن گیا تو راج کرے گا اور اگر نہ بن سکا تو پھر وکیل ہونا چاہیے تاکہ اپنے خلاف ہونے والے مقدمے تو لڑ سکے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کسی کی افتادِ طبع کا سراغ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے ملتا ہے۔ بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔ بڑے کام تو بندہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور بسا اوقات طبیعت کے خلاف کرتا ہے۔ مگر محترمہ نے ساری زندگی کبھی چھوٹا کام کیا ہی نہیں۔ وہ تو سر درد کی دوا بھی کھا رہی ہوں تو لگتا ہے قوم کا دردِ سر کم کرنا چاہتی ہیں۔ خود پر اتنا اعتماد ہے کہ کسی پر اعتماد نہیں۔ والد کے نقصِ قدم اور نقشِ قدم پر چل رہی ہیں۔ مارشل لاء سے اتنا ڈرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں ان کے منہ سے کرسی، آیت الکرسی نکلتی ہے۔ ضیاء الحق کو قاتل کہتی ہیں حالانکہ وہ تو انتقال دیکھ ہی نہیں سکتے تھے جیتے جی ان سے اقتدار کا انتقال نہ دیکھا گیا اور کسی کا کیا دیکھا جاتا۔ ضیاء الحق سست آدمی تھے کہ انہوں نے نوے دن کا کام نو سال میں کیا، جب کہ محترمہ اتنی تیز نکلیں کہ پانچ سال کی حکومت سوا سال میں پوری کر دی۔ وہ فتح حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہار بھی سکتی ہیں۔ ضیاء الحق مارشل لاء میں اکثر کارکنوں میں انہیں کمر دکھائی۔ کچھ نے اس لیے بھی دکھائی تاکہ اس پر پڑے کوڑے دکھا سکیں۔ میاں نواز شریف کے اس قدر خلاف ہیں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ میاں کا نام لینا چھوڑ دیا۔ ان دنوں وہ اللہ میاں کو بھی اللہ صاحب کہنے لگیں۔ اقتدار میں آنے کے لیے مزاروں پر چادریں چڑھائیں، ایک چادر خود پر بھی چڑھالی۔

مس پریشانی بےنظیر کم، بھٹو کی بیٹی، مرتضیٰ اور شاہ نواز کی بہن، آصف کی بیوی اور بلاول کی ماں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان میں عظیم سیاست دان بننے والی تمام خوبیاں

موجود ہیں اور انہوں نے خود کو بڑی مشکل سے عظیم سیاست دان بننے سے روکا ہوا ہے اور اپنی مقبولیت کم کرنے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں۔ ان کا سیاسی سفر جو زیڈ۔ اے (ذوالفقار علی بھٹو) سے شروع ہوا، اب اے۔ زیڈ (آصف زرداری) تک آ گیا ہے۔

سٹیل مین

وہ سیاست کے ''میاں'' ہیں اور اس کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں۔ اس سے انہوں نے اپنا ''لوہا'' منوایا ہے۔ وہ پاکستان کے واحد سیاست دان ہیں جن کا نام جو بھی لیتا ہے۔ انہیں شریف ضرور کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی جب تک بولنے نہ لگتے، سیاست دان نہ لگتے۔ یہ بھی جب تک بولنے نہ لگیں ''شریف'' کے بیٹے لگتے ہیں، سیاست دان نہیں لگتے۔ چپ ہوں تو لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ انہیں سیاست کا کچھ پتہ نہیں۔ بولیں تو یہ شبہ دور ہوتا جاتا ہے۔ شکل وصورت ایسی کہ جب وہ کچھ بھی نہیں تھے،تب بھی کچھ تھے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر مشکور حسین یاد انہیں کلاس میں کھڑا کر کے کہتے: ''مسٹر تم ہنس کیوں رہے ہو؟'' تو یہ جواب دیتے: ''سر میں ہنس تو نہیں رہا۔ میری شکل ہی ایسی ہے۔'' اپنے پہلے ہی الیکشن میں اخباروں اور اشتہاروں میں ایسی رنگین تصویریں چھپوائیں کہ انہیں حکومت نہ ملتی تو فلمیں ضرور مل جاتیں۔ اتنے اچھے ماحول میں پرورش پائی کہ ان کے بڑے ہو کر سیاست دان بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس گھرانے میں تو پارٹی سے مراد بھی کھانے کی پارٹی لیا جاتا۔ وہ صنعت سے سیاست میں آئے اور سیاست صنعت میں آ گئی۔ ایسی صنعت جس میں لاکھ لگاؤ اور سا کھ کماؤ، سا کھ لگاؤ اور لاکھ بناؤ۔ سیاست کے لیے دولت ماں کا دودھ ہے۔ سمرسٹ ماہم نے کہا: ''دولت چھٹی حس ہے، لیکن اس کے بغیر آپ دوسری پانچ حسوں کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔'' میاں صاحب بڑے سے بڑا کیس بھی ''بریف کیس'' بنا دیتے

ہیں۔ بقول ایما ڈنکن: ''نواز شریف تحریک استقلال میں بینک کی حیثیت رکھتے، ضیاء الحق نے اسے قومیا دیا۔ پہلے ''فدا مسلم لیگ'' پر فدا رہے، پھر مسلم لیگ ان پر فدا ہوگئی۔ بقول پیر پگاڑہ ''ضیاء الحق نے مارشل لاء دور میں جو وزیر اعلیٰ تخلیق کیے، یہ ان میں سے ایک ہیں۔''

پنجاب میں کبھی ٹوانہ خاندان سیاست میں اہم تھا، پھر ایسے جاگیر دار روپے میں ٹو۔ آنہ ہی رہ گئے۔ میاں صاحب صنعت کار ہیں۔ یوں صنعت اور کار پر روانی سے بولتے ہیں۔ بقول ٹائم ''وہ خارجہ پالیسی کی بجائے مرسیڈیز کاروں پر زیادہ روانی سے گفتگو کرتے ہیں۔'' خدا نے انہیں بہت کچھ دیا، اور یہ بتانے کے لیے کہ خدا نے انہیں کیا کیا دیا ہے، خدا نے انہیں بہت کچھ دیا، اور یہ بتانے کے لیے کہ خدا نے انہیں کیا کیا دیا ہے، مشیر دیئے۔ یہ سب ''اتفاق'' کی برکت ہے۔ بھٹو مرحوم نے تو ''اتفاق'' کو ختم کرنا چاہا اور وہ ملک سے اتفاق ختم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر اتفاق سے ضیاء الحق آ گئے۔ تب سے ملک میں ہر طرف ''اتفاق'' ہی نظر آتا ہے۔ پنجاب کی دوستی، سندھ کی سادگی، سرحد کی دشمنی اور بلوچستان کی ویرانی مشہور ہے۔ لیکن اگر کوئی سیاست دان کی دوستی کی تعریف کر رہا ہو تو یقین کرلیں کہ وہ میاں صاحب کی تعریف کر رہا ہوگا۔ دوستوں کے ساتھ ملتے ہوئے دوست، تاجروں کے ساتھ ملتے ہوئے تاجر، بچوں کے ساتھ ملتے ہوئے بچہ اور حکمرانوں سے ملتے ہوئے حکمران ہوتے ہیں۔ اگر چہ یہاں تو اسکندر مرزا جیسے حکمران بھی گزرے ہیں جو بیوی سے ملتے ہوئے بیوی ہوتے۔

وہ بات کھلے دل، منہ اور جیب سے سنتے ہیں۔ پہلے تقریر یاد کر رہے ہوتے تو

لگتا، ان کا امتحان ہے۔ مگر جب وہ تقریر کرتے تو لگتا، امتحان سننے والے کا ہے۔ لکھی تقریر یوں کرتے جیسے فی البدیہہ کرتے ہیں۔ یعنی بے ربط۔ اب وہ تقریر یاد کر کے نہیں کرتے، تقریر وہ کرتے ہیں، یاد لوگ کرتے ہیں۔ ان کی انگریزی سمجھنے کے لیے بندے کے لیے اردو جاننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں گورنر میاں اظہر صاحب بی اے ہیں، مگر لگتے نہیں۔ غلام حیدر وائیں میٹرک پاس ہیں اور لگتے بھی ہیں۔ جب کہ میاں صاحب ایم اے پاس نہیں ہیں، مگر لگتے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی رہے۔ جی ہاں! چند گھنٹے وہاں رہے۔ وہ پاکستان کے سب سے مہنگے لیڈر ہیں۔ جلسوں میں اتنا خرچہ آتا ہے کہ ایک ایک لفظ کئی لاکھ کا پڑتا ہے۔ ہمارے بوڑھے سیاست دان تو جوڑ توڑ اور جوڑ درد میں مبتلا رہے ہیں، لیکن میاں صاحب نوجوانی میں مبتلا ہیں۔ بندہ ان کے پاس جس مسئلے کے ساتھ جائے، جب واپس آتا ہے۔ تو وہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر مسئلہ وہی ہوتا تو بندہ وہ نہیں ہوتا۔ وہ مخالفوں کی ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی ہی نہیں دیتے، ترقی بہ ترقی بھی دیتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب پر سب سے زیادہ حکومت کرنے والے حکمران ہیں۔ کہتے ہیں سکھ خالصتان ابھی تک اس لیے نہیں بنا سکتے کہ ان کے لیڈر بڑے سکھ ہیں، لیکن میاں صاحب ''ان سکھ'' سیاست دان ہیں۔ رنجیت سنگھ تو ہر کسی کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے، یہ تو ہر کسی کے لیے الگ آنکھ رکھتے ہیں۔ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے، شاید اسی لیے متاثر کرتے ہیں۔ اپنے دھن اور دھن کے پکے ہیں۔

وزیراعلیٰ پنجاب تھے تو لوگ انہیں لاٹ صاحب نہ کہتے ، الاٹ صاحب کہتے۔وزیراعلیٰ تھے تو پلاٹ یوں دیتے جیسے وزیراعظم بن کر پیلی ٹیکسیاں دیں۔ دوستوں کو دیکھ کر بے اختیار ان کی طرف نہیں لپکتے ،با اختیار لپکتے ہیں۔

ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔وہ تو ہر کسی سے مسکرا کر بھی شاید اس لیے ملتے ہیں ہیں کہ انہیں پتہ ہوگا مسکرانے پر 15 مسلز کو کام کرنا پڑتا ہے۔جب کہ تیوریاں چڑھانے میں 65 مسلز لگتے ہیں۔والد صاحب انہیں سخت سزا دینا چاہتے تو کتاب دیتے۔ان کی پسندیدہ بک چیک بک ہے۔غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور اسے دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا سیاست دان کا۔صفائی کا اس قدر خیال رکھتے کہ جس کام کے پیچھے پڑتے ،ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔اگر آپ چاہتے ہیں ،ان کے بارے میں بری رائے رکھیں تو انہیں کبھی نہ ملیں اور اگر آپ چاہتے ہیں ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھیں تو ہمیں کبھی نہ ملیں۔

کرکٹ پسند ہے۔ہمیں یہ اس لیے پسند ہے کہ اس میں کئی ’’اوور‘‘ ہوتے ہیں۔کرکٹ میں کوئی ’’نو بال‘‘ کہہ دے تو برا مان جاتے ہیں کہ کھیل میں ذاتیات پر نہیں اترنا چاہیے۔بچپن میں کرکٹ کھیلتے ، محلے کی ٹیمیں ٹاس کرتیں۔ جو جیت جاتی، یہ اس کی طرف سے کھیلتے۔ حالانکہ ہمارے بچپن میں دونوں ٹیمیں ٹاس کرتیں جو ہار جاتیں۔ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنا پڑتا۔عوامی سوٹ میں انہیں سوٹ کرتا ہے۔دن میں کئی بار لباس بدلنے کی عادت ہے۔یہ تب سے ہے جب ابھی وہ چند ماہ کے تھے۔

وہ پیاس سے مرے جا رہے ہوں، تب بھی ان کے ہونٹ سوکھے نظر نہیں

آئیں گے اور اگر ان کے ہونٹ خشک ہیں تو وہ پیاسے نہیں ہیں۔ خوب صورتی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں تک خوبصورتی جاتی ہے۔ برے کو ہی اس کے گھر تک چھوڑ کر نہیں آتے، اچھے کو بھی اس کے گھر چھوڑنے جاتے ہیں۔ سیاست میں صحت مندانہ رجحان لانے کے لیے صحت کو بہتر بنانے کا رجحان ہے۔ اگرچہ وہ تو اپنے سسرال میں قدم رکھیں تو دوسرا قدم اکھاڑے میں پڑتا ہے۔ ویسے کشتی اور سیاست میں یہی فرق ہے کہ کشتی لڑنے والا اپنے کپڑے خود اتارتا ہے۔ نوجوانی میں وہ دوستوں سے یوں گھل مل جاتے، لگتا مل نہیں رہے، گھل رہے ہیں۔

اقتدار نے انہیں پروان چڑھایا۔ اب وہ اقتدار کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ایسی شخصیت ہیں کہ جس کاندھے پر ہاتھ رکھ دیں۔ وہ ان کو کاندھا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بڑے حتمی اور حاتمی فیصلے کرتے ہیں۔ ان کو ساتھ ملا کر حکومت کی جو مل کر گھوڑا بناتے، تو جو بنتا وہ اونٹ ہوتا۔ انہیں گالی دی جائے تو وہ لوٹاتے نہیں۔ جس کی وجہ سے پیپلز پارٹی یہ بتاتی ہے کہ بزنس مین ہیں جو ملے گا واپس نہیں کریں گے۔ مصطفیٰ کھر کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ آج کل پی پی پی میں ہیں یا این پی پی میں؟ تو اکثر جواب ملتا ہے، آج کل بیڈ روم میں ہیں جب کہ میاں صاحب بیڈ روم میں بھی ہوں تو جواب ملتا ہے مسلم لیگ میں ہیں۔

انہوں نے کئی بندوں کو سیاست دان بنایا اور کئی سیاست دانوں کو بندہ بنایا۔ ویسے بھی اقتدار کی کرسی پر چڑھنے کے لیے اپنے سے اوپر والے کے پاؤں کو سر سے اور نیچے والے کے سر کو پاؤں سے ٹھوکر مارنا پڑتی ہے۔ بہر حال میاں صاحب وہ خاص آدمی ہیں جو کبھی کبھی عام آدمی بن کر وہی محسوس کرتے ہیں جو عام آدمی کبھی کبھی خاص بن کر محسوس کرتا ہے۔

مسز مسلم لیگ

ہم نے ایک دوست سے پوچھا: ''جس شخص سے کہا جائے کہ آپ فوراً کچھ کر لیں، آپ کا تختہ الٹا جا رہا ہے اور وہ آگے سے کہے، اچھا سائیں! دیکھا جائے گا۔ آپ ایسے شخص کو کیا کہیں گے؟'' تو دوست بولا۔ ''میں اسے محمد خان جونیجو کہوں گا''۔

جونیجو صاحب ہمارے ملک کے دوسرے بڑے سیاست دان تھے۔ آپ پوچھیں گے: ''پہلے بڑے سیاست دان کون ہیں؟'' تو اس کا جواب ہے ''باقی سب''۔ جونیجو صاحب کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا۔ اگر دو سیاست دان گفتگو کر رہے ہوتے اور ان میں سے ایک بور ہو رہا ہوتا، تو دوسرا محمد خان جونیجو ہوتا۔ وضع قطع ایسی جو اتنی وضع نہ ہوتی جتنی قطع ہوتی۔ دیکھنے میں سیاست دان سے زیادہ ان کا تعلق محکمہ زکوٰۃ سے لگتا۔ انہوں نے سیاست سے پاک سیاست کی۔ سیاسی قد ایسا کہ انہیں دیکھنے والے کی پگڑی گر پڑتی۔ مگر یہ پگڑی اکثر آگے کو ہی گرتی۔ وہ سیاست میں شرافت کا ''نمونہ'' تھے۔ سیاست میں ایسے نمونے کہاں ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا، آپ کمزور سیاست دان ہیں تو انہوں نے کمزوری دور کرنے کے لیے دودھ گھی شروع کر دیا۔ بچپن ہی سے ایسی صحت تھی کہ پہلی بار جب ڈاکٹر دیکھا تو بمشکل دیکھا کیونکہ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے نظر کمزور ہو چکی تھی۔

وہ بچپن میں اتنے تیز تھے کہ سکول سے ایک بجے چھٹی ہوتی تو پونے ایک گھر پہنچ جاتے مگر بڑے ہو کر بڑے سست ہو گئے۔ اتنا لیٹ آنے لگے کہ انہیں ریلوے

کا وزیر بنا دیا گیا۔ پیر پگاڑہ تو انہیں ریلوے بابو کہتے۔ ضیاء الحق نے انہیں وزیر اعظم کی نوکری دی تو وہاں بھی ان کی پوزیشن ہمیشہ انجن کی بجائے ڈبے کی ہی رہی اور آپ جانتے ہیں، جب ڈبے کو انجن کے آگے لگایا جائے تو پھر انجن اسے دھکیلتا ہے، کھینچتا نہیں۔ وہ وزیر اعظم تھے تو نئے آنے والے سے ان کا یہ کہہ کر تعارف کرایا جاتا کہ یہ وزیر اعظم صاحب ہیں۔ ان کے وزیر اعظم بننے پر پاکستان کا ہر فرد خوش ہوا کہ اگر یہ بن سکتے ہیں تو میں بھی بن سکتا ہوں۔ ہمارے ایک محلے دار نے تو اس ڈر سے سیاست چھوڑ دی کہ اس حساب سے اگلی باری میری ہے۔ اگر میں وزیر اعظم بن گیا تو اتنا مشہور ہو جاؤں گا کہ صبح دہی لینے نکلوں گا تو شام کو کہیں واپس آسکوں گا، کیونکہ راستے میں ہر کوئی اپنا مسئلہ لیے بیٹھا ہوگا۔

ہمارے بیشتر سیاست دانوں نے وزیر اعظم بننے کی کوشش کی اور نا کام رہے۔ انہوں نے وزیر اعظم ہوتے ہوئے وزیر اعظم بننے کی کوشش کی اور نا کامیاب رہے۔ ضیاء الحق نے جب انہیں وزیر اعظم بنایا تو یہ یوں خوش تھے جیسے سیور ر انفل ٹکٹ پر ان کا وزیر اعظم کا انعام نکلا ہو۔ پیر پگاڑہ صاحب کہتے ہیں: ''(سندھ) نے پاکستان کو دو وزیر اعظم دیئے، ان کی لاشیں ملیں۔ ہم نے ایک لاش دی تو اسے وزیر اعظم بنا دیا''۔

سندھڑی آم کی طرح میٹھی شخصیت محمد خان جونیجو نے 1932ء میں پہلی بار ''سندھڑی'' میں آنکھ کھولی۔ دوسری بار کب کھولی، پکا پتہ نہیں۔ لندن سے سنیئر کیمبرج اور زراعت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ لندن انہیں پسند تھا کیونکہ وہاں انگریز اپنا منہ صرف ماؤتھ ٹو ماؤتھ سانس دلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی

زبان بھی ناک میں ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ناک میں دم ہوتا ہے۔ جونیجو صاحب کا بھی منہ کھلا ہوتا تو لوگ سمجھتے، سانس لینے کے لیے کھولا ہوگا یا دوسرے کی بات سننے کے لیے۔ منہ سے الفاظ یوں نکالتے جیسے ریزگاری نکال رہے ہوں، یعنی گن گن کر۔ چلاتے تک سرگوشی میں۔ جس کام کے لیے دوسرے زبان ہلاتے، یہ خود کو ہلاتے۔ جب تک بلند آواز میں نہ بولتے، خود اپنی بات نہ سن سکتے۔ بیک وقت ہاں اور ناں یوں کہتے کہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پسینہ سکھانے کے لیے دھوپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی زیادتی کرتا، اسے اتنی جلدی معاف کر دیتے کہ لگتا انہیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ زیادتی کرے گا۔

وہ پیر پگاڑہ صاحب کی دریافت ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، وہ ان کی ایجاد ہیں۔ وزیراعظم تھے تو ماتحتوں کے ٹیلی فون بل تک چیک کرتے۔ ان کے دور میں تو چائے منگوانے کے لیے فائل موو کرانا پڑتی۔ سابق وزیر جسونت سنگھ کی طرح وہ بہت بچت کرتے۔ جسونت سنگھ تو پٹرول یوں بچاتے کہ جس گاڑی میں دفتر آتے اسے ڈرائیور کو دے کر واپس گھر بھجوا دیتے اور دفتر کے بعد خود پیدل گھر جاتے تاکہ پٹرول کی بچت ہو۔ پہلے جونیجو صاحب کے فیصلے بڑے دانشمندانہ ہوتے، مگر بعد میں انہوں نے خود فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔ یہ غلط ہے کہ وہ آج کا کام کل کرتے، وہ تو کل کا کام بھی آج کرتے۔ کبھی دوسروں کی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ انہوں نے تو کبھی اپنی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر کسی کام میں جلدی کی تو وہ دیر کرنے میں۔ وہ تو جتنی دیر میں شیو کرتے، اتنی دیر میں شیو پھر اتنی ہی ہو چکی

ہوتی۔ وہ بارات میں شامل ہونے کے لیے گھر سے نکلتے تو ولیمے پر پہنچتے۔ ایک بار انہیں صبح کی ایک تقریب میں پابندی وقت پر تقریر کرنا تھی، آپ تقریب میں پہنچے اور کہا: ''گڈ آفٹر نون'' اوجڑی کیمپ جب اجڑی کیمپ بنا تو انہوں نے کہا، اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ واقعی جب یہ واقعہ ہوا، ان کے دونوں ہاتھ ان کی جیب میں تھے۔ ان دنوں انہیں بہت کم نیند آتی، ہر چند روز کے بعد اٹھ پڑتے۔ ضیاء الحق نے جب اسمبلی توڑی تو کسی نے ان سے پوچھا۔ ایسا آپ کے ذہن میں تھا؟ کہا میرے ذہن میں تو کچھ نہیں تھا۔ تو سننے والے نے کہا: واقعی ذہن میں کچھ ہوتا تو ایسا کیوں ہوتا۔

وہ کاہل سہی مگر ان کا ذکر ممتاز کاہلوں میں نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ یہ جب وزیراعظم تھے، ذوالفقار علی بھٹو بننا چاہتے تھے۔ بولتے یوں جیسے بھٹو صاحب چپ ہوتے، یعنی دوسروں کو کچھ پتہ نہ ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب جیسی گاڑی اور وہی ڈرائیور ہی نہ رکھا، بلکہ گاڑی کی رفتار بھی وہی رکھی۔ مزاج ایسا تھا کہ جو دروازہ بٹن دبانے سے کھلتا، اس کے کھلنے پر بھی شکریہ کہتے۔ صبح چھڑی لے کر یوں واک کرنے نکلتے کہ لگتا چھڑی کو واک کرانے نکلے ہیں۔ پیر پگاڑہ صاحب کو ملنے جاتے تو جوتا پہلے اتار لیتے۔ انہیں اس بات پر بھی غصہ آتا، جس پر جو غصہ نہ کرے، اس پر غصہ کرنا چاہیے۔ پرائم منسٹر تھے تو ان کے نام کے ساتھ P.M بھی لکھا ہوتا، تو لگ اس سے مراد وقت ہی لیتے۔ ان کا پانچ نکاتی پروگرام پانچ نقاطی پروگرام ثابت ہوا۔ اس قدر محتاط ہوتے کہ احتیاط کرنے میں بھی احتیاط کرتے۔ وہ سیاست

میں یک دم پیچھے سے آگے آئے اور اتنا آگے نکل گئے کہ ان کے پیچھے دور دور تک کوئی نہ تھا۔ مسلم لیگ ان کی وہ کمزوری رہی جس میں ان کی طاقت تھی لیکن جب مسلم لیگ پوری ہوتی، وہ اس کے پورے صدر نہ ہوتے۔ جب وہ اس کے پورے صدر ہوتے تو مسلم لیگ پوری نہ ہوتی۔ لوگ انہیں مسلم لیگ کی بیوہ کہتے، مگر جب وہ نہ رہے تو مسلم لیگ بیوہ ہوگئی۔ ہر جگہ دیر سے پہنچنے والے محمد خان جونیجو نے صرف اللہ پاس کے پہنچنے میں جلدی کی۔

سندھی گاندھی

ہم سمجھتے ہیں، بھارت والے مہاتما گاندھی کی اس لیے پوجا کرتے ہیں کہ ان کے نام ''گاندھی'' میں ہندوؤں کی سب سے مقدس ہستی آتی ہے۔وہ ہے ''گاں'' یعنی گائے اور ساتھ ''دھی'' بھی ہے۔ گائے دودھ کی وہ فیکٹری ہے جس کی چار ٹانگیں اور ایک دم ہوتی ہے۔ جو دم نہیں لینے دیتی۔ بچپن میں ماسٹر جی ہم سے پوچھتے: ''کن کن چیزوں میں دودھ ہوتا ہے؟'' تو ہم کہتے ''چائے اور گائے''۔سو گاں دھی ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ پھر پتہ نہیں جی ایم سید کو سندھی گاندھی کیوں کہا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی طرح ان کا لباس بھی ایسا نہیں ہوتا، جیسے ہو تو لوگ یہ نہ کہیں کہ اس نے جسم چھپا رکھا ہے۔ یہی کہیں کہ جسم نے لباس چھپا رکھا ہے۔ پھر بھی گاندھی جی کی لنگوٹی اتنے کام کی تھی کہ اب تک ان کے مجاوروں اور ہمارے محاوروں میں استعمال ہوتی ہے۔ ان سے قبل ہمارے پاس سرحدی گاندھی تھے۔ان تینوں گاندھیوں میں ہمیں تو خرابی صحت کے علاوہ اور کچھ مشترک نظر نہیں آیا۔ مہاتما گاندھی اتنے سوم تھے کہ آپ انہیں مہاتما سوموار کہہ سکتے ہیں۔ مہاتما بدھ کو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔ سندھی گاندھی سید ہیں۔ یوں آپ انہیں مہاتما جمعرات کہہ سکتے ہیں۔

پہلی بار ایسے سید گھرانے میں آنکھ کھولی، جہاں بچے کو پیٹنے سے پہلے بھی بسم اللہ شریف پڑھی جاتی ہے۔ البتہ دوسری بار کراچی کے آنکھوں کے ہسپتال میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں غلام مرتضیٰ تھے، پھر جی ایم ہو گئے۔ نام کے ساتھ بعد میں

سیدیوں لکھتے ہیں جس طرح ہم جیسے ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔ گزشتہ تیس چالیس سالوں سے جو اہم کام کر رہے ہیں، وہ بوڑھا ہونا ہے۔ بہر حال اب وہ واحد سیاست دان ہیں جن کو بندہ کہہ سکتا ہے کہ اب آپ بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ اگر چہ ان کی مزید پندرہ بیس سال بوڑھا ہونے کی خواہش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بوڑھے بھی انہیں اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ بڑھاپے میں آدمی دوسری بار بچپن گزار رہا ہوتا ہے مگر اسے سمجھانے کے لیے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ سندھی گاندھی بھی اپنا دوسرا بچپن گزار رہے ہیں، یقین نہ آئے تو ان کی باتیں سن لیں۔ ان کی سالگرہ پر ایک نوجوان سیاست دان نے کہا: میری خواہش ہے کہ میں آپ کی سویں سالگرہ میں بھی شرکت کروں تو انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا، بظاہر تو تمہیں دیکھ کر مجھے یہی امید ہے کہ تم میری سویں سالگرہ میں شرکت کے لیے موجود ہوں گے۔

اپنا شجرہ نسب وہاں تک لے جاتے ہیں جہاں نسب ابھی شجر پر ہی ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو خود کو 45 سال سے پاکستانی، چودہ سو سال سے مسلمان اور چودہ ہزار سال سے سندھی کہتے ہیں۔ اپنے سندھ میں پیدا ہونے پر اس قدر فخر کرتے ہیں۔ جیسے یہ سب ان کی ذاتی کوششوں سے ہوا ہو۔ سندھ میں جی ایم سید کا بڑا احترام ہے۔ سندھی تو جس کا احترام کرنا چاہیں اسے شاہ کہنے لگتے ہیں۔ جیسے دریائے سندھ کو بھی وہ دریائے شاہ کہتے ہیں۔

تحریک خلافت سے سیاست کا آغاز کیا۔ تحریک ختم ہوگئی، مگر وہ خلیفہ ہو گئے۔ مسجد منزل گاہ تحریک کے قائد کے طور پر مسجد کو منزل گاہ بنایا۔ 1943ء میں علیحدہ

مسلم ملک کے لیے قرارداد پیش کی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی قائداعظم کی رفاقت سے ہاتھ دھو لیے، اسی دن سے ہاتھ دھوئے ہوئے ہیں۔ بڑے ڈرانے والے بیان دیتے ہیں۔ مگران کے بیان سن کر رنگ پیلا نہیں پڑتا ہے کہ ان کا بڑا قابل بیان بھی نا قابل بیان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں، میں کئی سال آگے دیکھتا ہوں۔ حالانکہ ان کی نظر ایسی ہے کہ کئی قدم آگے نہیں دیکھ سکتے۔ نظر کی عینک آنکھ سے لگائے رکھتے ہیں۔ جس کا یہ فائدہ ہے کہ انہیں عینک نظر آتی رہتی ہے۔ جو بات کرنا ہو، لکھ کر کرتے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات سننا ہو، وہ بھی لکھ کر سنتے ہیں۔ ان کی اتنی کتابیں ہیں کہ اگر ہم ہر سال ایک کتاب لکھیں، تو پھر بھی ان جتنی کتابیں لکھنے کے لیے ہمیں دو تین کتابیں پیدا ہونے سے پہلے لکھنا پڑیں گی۔ ان کی ہر کتاب میں ایک ہی بات ہوتی ہے۔ ایک بار وہ پبلشر کے پاس اپنی نئی کتاب کا مسودہ لے کر گئے۔ پبلشر نے مسودہ ایک نظر دیکھ کر اس میں لگی پن نکال کر رکھ لی اور مسودہ سندھی گاندھی کو واپس دیتے ہوئے کہا: ''سید سائیں یہ رکھ لیں۔ اس میں جو نئی چیز تھی وہ میں نے نکال لی ہے۔'' لگتا ہے انہوں نے آخری کتاب پہلے لکھ لی، پہلی کتاب آخر میں لکھ رہے ہیں۔ لوگ ان کی کتاب پڑھ کر یہی کتاب ہے: ''ہم نے آپ کی کتاب پڑھ لی۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

سندھی گاندھی اتنے گھر میں نہیں رہتے، جتنے خبروں میں رہتے ہیں۔ ان ک پگھ اور پگ تلے تاریخ کے قدیم خطے ہیں۔ ان کی ذات ایک خزانہ ہے۔ ویسے سندھ کے جو حالات ہیں، اس میں تو خزانہ بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ اسے

زمین میں دبا دیا جائے۔ چہرے پر ایک معصومیت اور مصروفیت۔ ان کے چہرے پر جو چیز سب سے واضح ہے وہ ان کی عینک ہے جس کے بغیر ان کے لیے کچھ واضح نہیں ہے۔ انہیں تو عینک کے بغیر خواب تک صاف دکھائی نہیں دیتے۔

کتاب چھپوانے سے پہلے اس پر پابندی لگوانے کا انتظام کر لیں گے۔ اگر پابندی نہ لگنے کا پچاس فی صد بھی شک ہو تو انہیں چھپوائیں گے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں پابندی سے وہی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ جس پر پابندی لگی ہو۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس قدر مستقل مزاج ہوتے ہیں کہ چاہیں تو اسپرین کو سر درد لگا دیں۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کا اگر کوئی ذہن تبدیل کر سکتا ہے تو وہ نیورو سرجن ہی ہو سکتا ہے۔ تلفظ ایسا کہ بہاری کو بھاری کہتے ہیں۔ ان کے پاس سندھ کے ہر مرض کا علاج ہی نہیں، ہر علاج کے لیے مرض بھی موجود ہے۔ تاریخ سے اس قدر لگاؤ ہے کہ جو بھی ملے، اس سے پوچھتے ہیں: آج کیا تاریخ ہے؟ اتنی دیر گھر میں نہیں رہے، جتنی دیر جیل میں رہے۔ سو ان کے لواحقین جیل کو اپنی منقولہ جائیداد سمجھتے ہیں۔

یادداشت ایسی کہ ان کے سامنے ایک بات کئی بار کی جائے تو انہیں یاد ہو گا کہ یہ کتنی بار کی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پتہ نہ ہو گا کہ کیا بات کی گئی۔ قائل کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت ہے۔ وہ آپ کو ضائع ہونے پر لیکچر دے رہے ہوں تو آپ فوراً قائل ہو جائیں گے کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جئے سندھ والے ان کی بات اس قدر مانتے ہیں کہ سندھی گاندھی چپ بھی ہوں تو وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے ہیں۔ ساری زندگی شراب کو ہاتھ نہ لگایا۔ انہوں نے تو کبھی شرابی کو

ہاتھ نہیں لگایا۔ 1970ء کے بعد الیکشن میں کھڑے نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں، میں اتنا بیمار ہوں کہ دو منٹ سے زیادہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کہو جئے سندھ، سندھ میں ہاری ہے تو کہیں گے، جئے سندھ میں سندھی ہاری ہے۔ وہ پہلے پاکستان کے علم بردار تھے، اب الم بردار ہیں۔ اپنی ''فطرت'' کے باعث اب سندھ اور چھڑی کے سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔

پاکستان کو اپنا ''ٹوٹ انگ'' کہتے ہیں۔ ان کے ماننے والے بڑے دنوں سے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ اب تو وہاں دن رات ایک ہو بھی گئے ہیں کہ وہاں تو نوکری کے لیے ڈاکومنٹ سے مراد ڈاکومنٹ ہوتا ہے۔ شروع سے علیحدگی پسند تھے۔ جس کا مطلب یہ نہیں کہ جسے پسند کرنا ہوتا، اسے علیحدگی میں کرتے۔ وہ سیاست دان ہیں اور ہمارے ہاں سیاست دان ہوتے ہیں، سائنس دان نہیں ہوتے کہ سائنس دان پہلے اپنے سارے تجربے چوہوں اور خرگوشوں پر کرتا ہے اور سیاست دان براہ راست انسانوں۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بنگلہ دیش بنانے والوں کو بنگلہ ملتا ہے نہ دیش۔

شوہر اعظم

وہ مرزا جٹ کی نسل سے ہیں۔ اس لیے جس خاتون کو بھی دیکھا اسے صاحبہ نہیں صاحباں ہی سمجھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جب چند گھنٹوں کے لیے فارغ ہوں اور کام نہ ہو تو شادی کر لیتے ہیں۔ تعلیم تو ان کی اتنی ہی ہے جتنی غلام حیدر وائیں صاحب کی ہے۔ اور وائیں صاحب اتنی دیر زیر تعلیم نہیں رہے۔ جتنی دیر وزیر تعلیم رہے ہیں۔ بہر حال شوہر اعظم **ملک** جی ایم غیر سید نے شادیوں پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کی شادی پر تو فوٹو گرافر پولورائیڈ کیمرے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب تک تصویریں دھل کر آئیں۔ یہ نئی شادی کر چکے ہوں۔ وہ اگر کہیں کہ میں کئی سالوں سے پریشان ہوں تو لوگ سالوں سے مراد بھی مدت نہیں۔ رشتہ لیتے ہیں۔ ساری زندگی نمبر 2 رہے۔ بھٹو دور میں پی پی پی کے نمبر 2 لیڈر۔ این پی پی میں شامل ہوئے تو یہاں بھی دو نمبر لیڈر ہی رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بیویوں کے بھی نمبر دو خاوند رہے۔ قوم کا اس قدر غم ہے کہ 1990ء میں انہیں پتہ چلا کہ پاکستان میں 48 لاکھ لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں تو انہیں اس وقت تک رات کو نیند نہ آئی۔ جب تک انہوں نے اس تعداد میں ایک کی کمی نہ کر دی۔ سیانے کہتے ہیں کہ مطلقہ کی بجائے بیوہ سے شادی کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کہ وہ مرد کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مگر جو مرد اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوتا ہے۔ وہ زندہ نہیں ہوتا۔ کھر صاحب کو تجربہ کار لوگ اتنے پسند ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس سے شادی کی جسے پہلی شادی کا تجربہ

تھا۔ وہ مطلقہ کو ہی اپنی متعلقہ سمجھتے ہیں۔ انہیں تو ڈاکٹر تبدیلی آب و ہوا کا کہے تو سمجھتے ہیں، ڈاکٹر نے تبدیلی آب وحوا کہا ہے۔

جی ایم سید فٹوں میں سوچتے اور انچوں میں بولتے ہیں، جب کہ جی ایم سید انچوں میں سوچتے اور فٹوں میں بولتے ہیں۔ **ملک** جی ایم غیر سید خود کو پورا ملک سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ کہیں، پورا **ملک** بھوکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا۔ جہاں تک **ملک** سے ان کی محبت کی بات ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو ایک فرانسیسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا: ''میں رات بھر تمہاری جدائی میں جاگتا رہا ہوں اور ساری رات اپنے خوابوں میں صرف اور صرف تمہیں دیکھتا ہوں۔''

ان کا تعلق کھرل قبیلے کی کھر شاخ سے ہے۔ تہمینہ درانی لکھتی ہیں: ''کھرلوں کا ایک گروہ لاہور سے ملتان جا رہا تھا۔ راستے میں ملتان کے قریب انہوں نے گنے کے کھیت دیکھے تو انہیں کاٹ کر اپنی جھونپڑیاں بنانے لگے۔ کھیت کے مالک نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم تو کھرل ہیں۔ کھیت کے مالک نے کہا حرکتوں سے تو تم خر لگتے ہو۔ یوں کھرل کے بعد وہ کھر کہلائے۔'' شاید اسی لیے تہمینہ نے جی ایم غیر سید سے شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ بھی کھر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کھر صاحب بڑے مادہ پرست ہیں۔ یہاں مادہ سے مراد وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

جب وہ گورنر تھے تو اکثر فور پیس میں ملبوس نظر آتے۔ کسی نے پوچھا: ''تھری پیس سوٹ تو سنا ہے، فور پیس سے کیا مراد ہے؟'' تھری پیس تو پہنا ہوتا ہے اور ایک

پیں ساتھ ہوتا ہے۔ خاتون کے ساتھ تصویر میں جی ایم غیر سید کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا ہے۔ جس نے چادر لی ہو وہ موصوف ہوں گے۔ فرماتے ہیں۔ پنجاب کی کسی ماں نے مجھ سے بڑا بیٹا نہیں جنا۔ جب کہ میرا دوست ''ف'' کہتا ہے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں خود دسویں ماہ کی پیدائش ہوں۔ نواب آف کالا باغ نے کہا تھا کہ جس عہدے کے آخر میں نر آئے جیسے گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ ان سے ڈرو۔ جب کھر صاحب گورنر تھے تو لوگ ڈر کر انہیں شیر نہ کہتے بلکہ چڑیا گھر کے شیر کو بھی ڈر کے کھر کہہ کر بلاتے۔ یہ شیر آدم خور نہیں بلکہ حوا خور ہے۔ پیر پگاڑہ سے کسی نے اس شیر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے: ''ہم اشرف المخلوقات سے رابطہ رکھتے ہیں، جانوروں سے نہیں۔''

جب گورنر تھے تو ان کی اپنی ''ادا'' تھی۔ اداکارائیں گورنر ہاؤس میں یوں آتیں جیسے سٹوڈیو میں آ رہی ہوں۔ یحیٰی خان کے دور میں اداکارہ ترانہ جب یحیٰی خان سے ملنے کے بعد باہر نکلی تو ایوان صدر کے چوکیدار نے اسے سلیوٹ کیا۔ کسی نے پوچھا، جب وہ آئی تھی تب تو تم نے سلیوٹ نہیں کیا تھا؟ کہا: ''جب وہ آئی تھی تو صرف ترانہ تھی، جب کہ اب وہ قومی ترانہ ہے۔'' کھر صاحب اگر وزارت عظمیٰ کے امیدوار بھی ہوں تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اس وزارت میں عظمیٰ بھی ہے۔ ویسے بھی کیا ہو، اگر وہ وزیراعظم نہ بن سکے۔ شوہر اعظم تو بن گئے۔ تہمینہ نے جس دن طلاق لی۔ اس شام انہوں نے کہا۔ تہمینہ نے میرا گھر برباد کر دیا۔ عزت کو اخباروں میں اچھالا، الزامات لگائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری آج کی شام برباد کر دی۔ ایک مشہور گلوکارہ کی ذہانت سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر

نے کو کہا۔ وہ واقعی ذہین نکلی، اس نے فوراً کسی اور سے شادی کر لی۔ انہیں انکار اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی مردوں کو اگر کسی عورت کا "انکار" پسند آئے تو یقین کر لیں وہ پروین شاکر ہوگی۔

اقتدار میں تھے تو اپنا چہرہ سرخ رکھنے کے لیے لسی، مکھن، دودھ اور حنیف رامے کی تصویر استعمال کرتے۔ کوٹ ادو ان کا وہ کوٹ ہے جسے وہ جس کا چاہیں، پہنا دیں۔ پڑھائی سے انہیں اتنا شغف ہے، ان کے سامنے رسالہ کھو تو وہ اسے کتاب کی بجائے فوج کا دستہ سمجھیں گے۔ بحیثیت گورنر انہوں نے ثابت کیا کہ وہ نواب آف کالاباغ لیول کے نواب آف سبز باغ ہیں۔

ان کی زندگی کی کہانی ایک فلمی کہانی ہے، جس میں فائٹیں اور بڑھکیں ہی نہیں گانے بھی موجود ہیں۔ پہلے صرف جاگیردار تھے۔ تو کہتے میری کوٹھی کے آگے سے گاڑی ہٹاؤ، گورنر بنے تو کہنے لگے، میری گاڑی کے آگے سے کوٹھی ہٹاؤ، اب کہتے ہیں، کوٹھی کے آگے سے میری گاڑی ہٹاؤ۔ مزاج ایسا کہ اپنے دور اقتدار میں اگر کسی آرٹسٹ کو فائن کہتے تو ان کے موڈ سے اندازہ لگانا پڑتا کہ کہیں آرٹسٹ سے فائن لینا تو نہیں۔ معاملات میں ایسے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ کاروبار کرنا چاہیں تو پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کریں۔ اگر وہ وکیل آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر آپ کسی اچھے وکیل سے مشورہ کریں۔

دنیا میں جو جھوٹ سب سے زیادہ بولا جاتا ہے۔ وہ ہے کہ حکومت آپ کے مسئلے حل کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ ہر مسئلے کا حل نکال لیتے۔ ان کے دور اقتدار میں کچھ پارٹی ورکرز نے شکایت کی کہ ہمیں جاب نہیں ملتی تو انہوں نے فوراً ایک کمیٹی

بنانے کو کہا جو یہ پتہ چلائے کہ انہیں جاب کیوں نہیں ملتی اور ان کو اس کمیٹی میں جاب دے دی۔ کسی بے وقوف کو اپنا نہیں بناتے، ہاں اپنے کو بے وقوف بنا لیتے ہیں۔ سیاست میں ان کا یہ اصول ہے کہ سیاست میں کوئی اصول نہیں ہوتا۔

گورمانی خاندان کو سیاسی طور پر دفن کرنے کے لیے سیاست میں آئے۔ حالانکہ گور تو اس خاندان کے نام میں پہلے ہی تھا۔ بھٹو اقتدار میں تھے تو یہ ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ وہ اقتدار میں نہ رہے تو یہ دائیں بائیں ہو گئے۔ پیپلز پارٹی سے ان کو نکالا گیا مگر پیپلز پارٹی کو ان سے نہ نکالا جا سکا۔ واپس پی پی پی میں آئے تو انہیں کچھ نہ کہا گیا۔ یعنی صدر کہا گیا نہ سیکرٹری۔ 1977ء کے بعد **ملک** چھوڑ دیا۔ اگر یہ **ملک** نہ چھوڑتے تو **ملک** انہیں نہ چھوڑتا۔ جان کے گلبرتھ کہتا ہے ''سیاست دان اتنا اچھا ہوتا ہے، جتنا برا اس کا حافظہ ہوتا ہے'' ان کا حافظہ تو ایسا ہے کہ ایک صحافی نے بچوں کی تعداد پوچھ لی تو خود جواب دینے کی بجائے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھنے لگے۔

بے نظیر کے سسر حاکم زرداری فرماتے ہیں، کھر بھٹو کا بریف کیس ہی نہیں ان کے گھر کے جوتے بھی اٹھا کر لے جاتے۔ جس کا مطلب تو یہ ہے کہ بھٹو کا گھر ان کے لیے مسجد تھا۔ انہیں دن اچھا نہیں لگتا کہ صبح صبح چڑھ آتا ہے، البتہ رات پسند ہے کہ یہ اندھیرے میں آتی ہے۔ ناپسندیدہ دن 21 جون کہ اس کی رات بڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ سگار پی رہے ہوں تو ساری دنیا ان کے لیے ایش ٹرے ہوتی ہے۔ یہ تو ہیں مرد آہن مگر آہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے استعمال نہ کیا جائے تو اسے زنگ لگ جاتا ہے وہ لاکھوں کے مجمع کو کنٹرول کر سکتے ہیں مگر خود کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔

ہر کسی کو غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو غلام نہ بنے، اسے آقا بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں میں کبھی کسی کے آگے نہیں جھکا۔ حالانکہ تہمینہ کہتی ہیں، وہ اپنی بیویوں کے آگے جھکتے۔ ظاہر ہے اتنا لمبا بندہ جھکے بغیر تو بیوی کے پیٹ میں گھونسا کیسے مار سکتا ہے؟ اچھے ڈرائیور ہیں۔ آج تک جتنے حادثے کیے، سڑک پر نہیں گھر پہ کیے۔ گاڑی یوں چلاتے ہیں جیسے گھوڑا دوڑا رہے ہوں۔ اس لیے بریکیں لگاتے وقت سٹیئرنگ یوں کھینچتے ہیں جیسے لگامیں کھینچ رہے ہوں، اتنے تیز رفتار کہ جتنی دیر میں آپ ایک پل کراس کرتے ہیں وہ ڈبل کراس کر چکے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں، مخالفین مجھ سے اتنا ڈرتے ہیں کہ وہ مجھے زخمی کرنے کے لیے بھی میرے گھر پر تب حملہ کرتے ہیں جب انہیں یقین ہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ حریف کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ویسے بھی حریف سیاست دان اگر آپ سے سارے اختلافات ختم کر کے آپ کے ہاں آئے تو یقین کر لیں کہ وہ آپ کے جنازے پر آ رہا ہے۔ سائنس کہتی ہے، گرمی سے چیزیں پھیلتی ہیں۔ ان کی گورنری کا دور اتنا گرم تھا کہ ان کی تیس ایکڑ زمین پھیل کر کئی گنا ہو گئی۔ مجھ سے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ اگر یہ خوشبو زیادہ ہو جائے تو کپڑے بدل لیتے ہیں۔

مگرمچھ کی کھال کے جوتے تین تین سال چلاتے ہیں۔ میرا دوست ''ف'' کہتا ہے کہ یہ تو کوئی زیادہ عرصہ نہیں، یہ کھال تو مگرمچھ تیس تیس سال چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں، ''میں یاراں کا یار ہوں۔ واقعی وہ زیادہ سے زیادہ ''یاراں'' کا یار ہو سکتے ہیں۔ باراں یا تیرہ کے نہیں۔ مصیبت میں جوان کے کام آئے، اسے نہیں بھولتے۔ خاص کر اس وقت جب پھر مصیبت میں ہوں۔ فیصلہ کرنے میں اتنی دیر لگاتے

ہیں کہ اب تک ادھیڑ عمر ہونے کا فیصلہ کرنے میں ادھیڑ بن میں ہی ہیں۔ ان کے کاموں کے حساب سے ان کی عمر کا اندازہ لگائیں تو اپنے بیٹے کے ہم عمر نکلیں گے۔ اداکارہ نینسی آسٹر نے کہا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پچاس سال سے اوپر کی ہرگز نہ ہوں گی۔ سو ایک وقت ایسا آیا، نینسی جو عمر بتاتی، اس حساب سے اس کا بڑا بیٹا چار ماہ بعد پیدا ہوا۔ جی ہاں! نینسی آسٹر کی پیدائش کے چار ماہ بعد۔

عورتیں انہیں ایک شوہر، پی پی ورکرز ایک جوہر، بھٹو صاحب ایک شوفر اور جماعت اسلامی ایک لوفر کے طور پر جانتی ہے۔ انہوں نے اپنا سیاسی سفر کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی کے طور پر شروع کیا۔ بھٹو کے دست راست بنے۔ پنجاب کے بااختیار گورنر بنے، لیکن پھر وہیں آ گئے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ یعنی اب وہ پھر صرف کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی ہیں۔

علامہ فی الفور

علامہ فی الفور ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر کام جلدی سے کرتے ہیں۔ وہ تو دیر کرنے میں بھی جلدی کرتے ہیں۔ انہوں نے معروف ہونے میں تو چند ماہ ہی لگائے، البتہ غیر معروف ہونے میں کئی سال لگائے ہیں۔ مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور بڑی "جھنگ جو" شخصیت ہیں۔ لاہور آ کر لاء کالج کے ہوسٹل میں رہے۔ یہاں لاء ہوسٹل سے مراد سسرال نہیں کہ وہاں بھی مدران لاء، فادران لاء، سسٹر ان لاء بلکہ ہر کوئی ان لاء ہی ہوتا ہے۔ وہاں سے نکل کر فیض الحسن صاحب سے "فیض" کیا۔ وہ پیدائشی طور پر بڑے سیاست دان ہیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹا ادیب، چھوٹا سیاست دان اور چھوٹا اداکار پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ وہ پیدائشی طور پر اس لیے بڑے ہیں کہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔

مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور اس وقت سوتے ہیں جب اٹھنا ہو۔ جب کہ ہم جیسے تب اٹھتے ہیں جب سونا ہو۔ کسی نے ہم سے پوچھا "سو سو کر تھک نہیں جاتے؟" تو ہم نے کہا: "جب تھک جاتے ہیں تو پھر سو جاتے ہیں۔" یہ پتہ کرنا کہ علامہ صاحب سوئے ہوئے ہیں یا نہیں، بڑا آسان ہے۔ آپ کو ان کے پاس بیٹھے پانچ منٹ ہو جائیں اور وہ نہ بولیں تو سمجھ لیں، وہ سوئے ہوئے ہیں۔ لوگ تو جاگتے میں کام کرتے ہیں یہ سوئے ہوئے بھی فارغ نہیں ہوتے۔ خواب ملاحظہ فرما رہے ہوتے ہیں۔ خوابوں کا سلسلہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ گورباچوف نے ایک

بار کسی کو بتایا کہ مجھے بڑی پریشانی ہے۔ رئیسہ گورباچوف روز سوتے میں یہ خواب دیکھتی ہے کہ اس کی کسی امریکی سے شادی ہو رہی ہے۔ تو سننے والے نے کہا۔ اس وقت تک پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک وہ یہ خواب جاگتے میں نہیں دیکھنے لگتیں۔ علامہ صاحب جاگتے میں خواب دیکھتے ہی نہیں، دکھاتے بھی ہیں۔ فرماتے ہیں ان کا نام بھی خواب میں رکھا گیا۔ یہی نہیں انہوں نے تو نام پیدا بھی خواب ہی سے کیا۔

اپنے ہر کام کو الہامی سمجھتے ہیں۔ کچھ کام تو واقعی لگتے بھی ہیں یعنی ان کا تعلق انسانی عقل سے نہیں لگتا۔ علامہ صاحب دنیا کے واحد فرد ہیں جنہیں کوئی درازی عمر کی دعا بھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بقول مولانا فی الفور بحوالہ خواب نمبر...... اللہ تعالیٰ نے میری عمر 63 سال مقرر کی جو حضور پاک ﷺ نے بڑھا کر 66 برس کر دی، لیکن میں نے قبول نہ کی اور عرض کیا کہ 63 برس سے زیادہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس طرح عمر کے سلسلے میں سنت نبویؐ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوں گا۔ اور حضور ﷺ نے مان کر 63 کر دی۔ ویسے مولانا صاحب نے اس عمر کی حفاظت کے لیے اتنے گارڈ رکھے ہیں کہ لگتا ہے وہ انہیں لوگوں سے نہیں بچا رہے، بلکہ لوگوں کو ان سے بچا رہے ہیں۔ ہمارے ایک صحافی دوست بتاتے ہیں کہ مولانا کی دعا بڑی جلدی قبول ہوتی ہے۔ میں ملنے گیا۔ مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا: ''جاؤ، کھوئی ہوئی رقم مل جائے گی،'' اور ان کی آدھی دعا فوراً قبول ہو گئی کہ میں وہاں سے چلا آیا۔

مولانا صاحب تقریر کر رہے ہوں تو جنہیں اردو بھی نہیں آتی، سمجھ ان کو بھی آ

رہی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ نہ بھی بھول رہے ہوں تب بھی سننے والوں کو سمجھ آ رہی ہوتی ہے۔ دوران گفتگو ہم نے آج تک کسی کو ان سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا، جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ دوران گفتگو وہ کسی اور کو بولنے کا موقع نہیں دیتے۔ ویسے علامہ صاحب جس تیزی سے بولتے ہیں، اس تیزی سے تو ہم سن بھی نہیں سکتے۔ بہت لمبی تقریر کرتے ہیں۔ کیونکہ مختصر تقریر سننے کے لیے آج کل لوگوں کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ ٹی وی کے مذہبی پروگراموں کی کاسٹ میں شامل رہے۔ ایسے مقرر کہ جو انہیں ایک بار سن لے، پھر انہیں مقرر نہیں کہتا۔ مکرر کہتا ہے۔ ایک بار ٹی وی پر ان کی تقریر نشر ہونا تھی۔ دو تین بار اس کا ٹیلپ چلا۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر کو اس تقریر کی تعریف میں اتنے خط ملے کہ وہ پریشان ہو گیا۔ ہم نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا: ''سوچتا ہوں عین وقت پر بوجوہ علامہ صاحب کی تقریر ٹیلی کاسٹ نہ کی جا سکی۔ تو اتنے خط آئے۔ اگر تقریر ٹیلی کاسٹ ہو جاتی تو پھر کتنے آتے؟''

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''انسان زبان کی اوٹ میں چھپ سکتا ہے۔'' مگر علامہ صاحب نے زبان خود کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی۔ میرے دوست ''ف'' کے بقول بندہ خواب زادہ طاہر القادری صاحب کا انٹرویو کرنے جائے تو واپس آ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ڈکٹیشن لے کر آیا ہے۔ وہ اکیلے چار آدمیوں جتنا کام کرتے ہیں۔ آپ ان کو کھانا کھاتے دیکھ لیں تو اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ کمزوری محسوس ہو تو گوشت کی کڑاہی منگا لیں گے اور ایک منٹ میں ختم ہو جائے گی، آپ سوچتے ہوں گے کمزوری جی نہیں، کڑاہی۔

وہ دوسروں کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوتے ،خود اپنے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے اقتدار پسند نہیں۔ ویسے ان کے طریقہ کار سے واقعی یہی لگتا ہے کہ وہ کبھی اقتدار حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ ڈاکٹر اسرار احمد کہیں کہ مجھے اقتدار پسند نہیں تو بندہ سمجھتا ہے، اپنے بھائی اقتدار احمد کی بات کر رہے ہیں۔ جب کہ مولانا صاحب تو اسی کی خاطر سیاست برد ہوئے۔ پاکستان عوامی تحریک کی بنیاد رکھی جس میں تحریک تو ہے مگر عوام نہیں۔ 1990ء کے ضمنی انتخابات میں ایک امیدوار عوامی تحریک کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ میرے حساب سے مجھے الیکشن جیتنے کے لیے نو دس ووٹ اور چاہئیں۔ علامہ صاحب کہتے ہیں میرے پاس جو ہو وہ تقسیم کر دیتا ہوں۔ واقعی ان کے پاس جو ووٹ تھے انہوں نے وہ تقسیم کر دیئے۔ ان کی تحریک کا نعرہ ہے: ''جوانیاں لٹائیں گے، انقلاب لائیں گے''۔ مگر کہتے یوں ہیں ''جوانیاں لوٹائیں گے، انقلاب لائیں گے'' جو اچھا بھلا کسی حکیم کا اشتہار لگتا ہے۔ علامہ صاحب پارٹی کے لیے یتیموں اور بیواؤں سے چندہ نہیں لیتے۔ اس لیے جو انہیں چندہ نہ دے، اسے بیوہ اور یتیم سمجھتے ہیں۔

سیلف میڈ ہیں، یہاں تک کہ علامہ اور پروفیسر بھی سیلف میڈ ہیں۔ ڈاکٹر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو علاج کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو خود قابل علاج ہوتے ہیں۔ مولانا خواب زادہ فی الفور صاحب کے والد صاحب انہیں علاج کرنے والا ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں، مگر موصوف کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔

مولانا وہ مرد ہیں جنہوں نے زنانہ وار لکھا۔ وہ جتنی کتابوں کے خود کو مصنف بتاتے ہیں، صرف ان کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک کتاب بن جائے۔ وہ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا۔ ''آپ اتنا لکھنے کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں؟'' تو میرے دوست ''ف'' نے کہا: ''اتنا لکھنے کے بعد تو بندہ محسوس کر ہی نہیں سکتا۔'' فرماتے ہیں، مولانا مودودی کی جتنی تحریریں میں نے پڑھی ہیں، اتنی مولانا مودودی نے خود اپنی تحریریں نہ پڑھی ہوں گی۔ علامہ صاحب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ مقام اپنی ذاتی کوششوں سے حاصل کیا، جیسے ہمارا دوست ''ف'' اپنی ذاتی کوششوں سے اس مقام پر ہے کہ وہ اپنے سات بھائیوں میں اکیلا سید ہے۔ علامہ صاحب خود اس فرقے سے ہیں جو فرقہ بندی کے خلاف ہے۔ انہوں نے زندگی میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو وہ اپنا نہ ہوگا۔ ہر کام ترتیب سے کرتے ہیں۔ وہ تو بے ترتیبی بھی ترتیب سے کرتے ہیں۔

اگر وہ کہیں کہ مجھے خوب صورت چہرہ دیکھے دیر ہوگئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں شیشہ دیکھے گھنٹہ وہ گیا ہے۔ ان کی شخصیت میں انفرادیت ہے یہی انفرادیت انہیں اجتماعیت نہیں لانے دیتی۔

مریض الملّت مہاجر حسین

ایک زمانہ تھا جب مہاجر حسین امریکہ میں سیاسی پناہ لینا چاہتے تھے مگر انہیں الطاف حسین کے علاوہ کوئی سیاست دان نہ جانتا تھا۔ پھر وہ اتنے مشہور ہوئے کہ کراچی اور حیدرآباد کی ہر گلی میں ان کی تصویر تھی۔ سیاست دان ان کے گھر میں یوں حاضری دیتے کہ لگتا اب بھی الطاف حسین کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ آج کل وہ لندن میں ہیں جہاں کام اور زکام ہی ہوتا ہے، مگر اب لگتا ہے الطاف حسین بھی انہیں نہیں جانتا۔ وہ جتنی دیر ہسپتال میں رہے، اتنی دیر تو اپنے گھر میں نہ رہے ہوں گے۔ صرف اس وقت ہسپتال سے باہر آتے، جب دوسرے ہسپتال جانا ہوتا۔ گھر کو بھی ہسپتال کی طرح اتنا صاف رکھتے کہ لوگ نہ صرف ان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پاؤں صاف کرتے بلکہ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے بھی کرتے۔ ان کے حمایتیوں کی طرح مخالفوں کا بھی زیادہ وقت ہسپتالوں میں ہی کٹتا۔ یوں سیاست میں وہ الطاف بھائی کی بجائے ہسپتال بھائی کے طور پر ابھرے۔ لوگ انہیں دوست نہیں بھائی کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دوست تو بندہ مرضی سے بناتا ہے۔

1947ء میں بٹوارہ ہوتو جو ''خانساماں'' تھا اس کا ''خان'' ادھر آ گیا اور ''ساماں'' ادھر رہ گیا۔ برتن یوں بٹے کہ ''بر'' ادھر اور ''تن'' ادھر۔ سردار جی کے تو ''ٹرانسسٹر'' کا یوں بٹوارہ ہوا کہ ان کے پاس ''ٹرانس'' ہی بچی، ''سسٹر'' پیچھے رہ گئی۔ مہاجر حسین نے کراچی اور حیدرآباد میں جو مہاجر تھے۔ انہیں ایم کیو ایم کا

رکن بنایا، جو نہیں تھے انہیں مہاجر بنایا۔ مہاجر حسین خود آگرے میں پیدا ہوئے، اور وہاں سے کراچی میں آگرے۔ ان کے دل میں مہاجروں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جو اسلامی جمعیت طلبہ اور پولیس نے کوٹ کوٹ کر بھری۔ ان کی سیاسی عمر اتنی ہی ہے جتنی ان کی اپنی عمر ہے۔ انہوں نے اپنی لائف سٹوری میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ایم کیو ایم کی ہسٹری مہاجر حسین کی لائف ہسٹری ہی ہے۔ انہیں جہاں پناہ ملی، جہاں پناہ بن گئے۔

بچپن میں پسندیدہ کھیل لڑائی تھا۔ ان کی والدہ جب انہیں خوش کرنا چاہتیں تو کوئی لطیفہ نہ سناتیں، بس یہ بتاتیں کہ ساتھ والی گلی میں لڑائی ہو رہی ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ بچپن میں وہ کھلونے پسند تھے جن میں فوجی ہوں۔ پاکستانی فوجی کھلونے اس لیے پسند تھے کہ بادشاہ اور وزیر کے کھیل میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ امریکی فوجی کھلونے وہ ہیں جنہیں کبھی ڈبوں سے باہر ہی نہیں نکالا جاتا۔ نوجوانی میں بری طرح فوج میں جانے کا شوق تھا، سو بری طرح گئے اور آئے۔

جامعہ کراچی میں بی فارمیسی میں تھے اس کا ریکارڈ توڑنے کی کئی کوششیں کیں۔ مگر پولیس نے ریکارڈ ٹوٹنے سے بچا لیا۔ ان دنوں ان کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے ایک ٹوپی اور پہننے کے لیے ایک عینک ہوتی تھی۔ چلنے کے لیے ففٹی موٹر سائیکل جو ففٹی موٹر تھی اور ففٹی سائیکل، یعنی سواریاں اس پر موٹر کی بیٹھتیں اور وہ چلتی سائیکل کی طرح۔ وہ پٹرول سے نہیں، امید سے چلتی اور چلتے ہوئے ایسے ہی لگتی جیسے واقعی امید سے ہو۔ نقل و ''حمل'' کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا

کہ لوگ یہ نہ پوچھتے یہ کس کی ہے۔ یہ پوچھتے کہ یہ کیا ہے؟ وہ ان کی زبان سمجھتی۔ اس لیے وہ بریک کا کام بھی زبان سے لیتے۔ یعنی کوئی سامنے آ جاتا تو بریک کی بجائے اپنی زبان کا استعمال کرتے۔ یوں گاڑیوں کے نیچے آتے آتے وہ وقت آیا کہ ان کے نیچے گاڑیاں آنے لگیں۔ ابتدا میں تو مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی مصیبت بھی مول نہ لے سکتے، وہ بھی ادھار ہی لینا پڑتی۔ روزانہ شام کو جن سے قرض لینا پڑتا، ان کی میرٹ لسٹ بناتے اور جس کا ادھار سب سے زیادہ ہوتا، اس سے مزید ادھار لینا بند کر دیتے تاوقتیکہ کسی اور کا ادھار اس سے زیادہ نہ ہوتا۔ پھر وہ ایسے امیر ہوئے کہ ایسا کسی جماعت کا امیر نہ ہوا۔

وہ پہلے مہاجر حسین تھے، پھر مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن بنے اور پھر ایم کیو ایم کہلائے۔ 1986ء میں ایم کیو ایم کے جلسے میں بادل اور بے دل مہاجر حسین برسے اور پاکستانی سیاست میں سیلاب آ گیا۔ اس کے لیے وہ جیلوں میں مچھر اوڑھ کر سوئے۔ مہاجر حسین کی اسی کسرت نے ایم کیو ایم کو کثرت دی۔ کہتے ہیں ایم کیو ایم کو چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اور ڈاکٹروں نے ثابت کیا کہ واقعی ان کا گردہ بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بیس سال کی عمر میں بھی بیسیوں کے تھے۔

رنگ ایسا کہ میلا کپڑا بھی پہن لیں تو کپڑا اجلا لگنے لگے۔ پاجامہ پسند ہے۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پاجامہ پہننا ہوتا ہے۔ اور شلوار پہنی جاتی ہے۔ یوں وہ پاجامے میں پھولے نہیں سماتے۔ عینک چہرے کا لباس ہے۔ اس لیے عینک کے بغیر محفلوں میں نہیں جاتے۔ شاید اسی لیے بزرگ عینکوں کو پہننے کے لیے پیچھے رسی آزار بند کی طرح باندھے ہوتے ہیں۔

جذبات اور جزئیات کے سمندر ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ جاننے کے لیے کہ کراچی کا موسم گرم ہے یا سرد، لوگ محکمہ موسمیات کی بجائے مہاجر حسین کے بیان دیکھتے، کیونکہ وہاں سردی اور گرمی کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ منٹ میں سردی گرمی ہو جاتی ہے۔ ویسے برے موسم کا اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو، یہ ہے کہ جہاں موسم اچھا ہو وہاں لوگوں کو آپس میں لڑنے کے لیے مذہبی تفرقہ بندیوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ مہاجر حسین چپ ہوں تو دوست پریشان ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر کو بلانے کا سوچنے لگتے ہیں۔ زبان چل رہی ہو تو سمجھ لیں، ان کی سانس چل رہی ہے۔ زبان بند ہے تو ڈاکٹر زبان ہیں، نبض دیکھتے ہیں۔ جہاں بولنے کا موقع نہ ملے، وہاں بھی چپ نہیں ہوتے۔ سارا دن بول بول کر اس قدر تھک جاتے ہیں کہ بمشکل اپنا منہ بند کرتے ہیں۔ ان کو جو آپریشن ڈاکٹر ایک گھنٹے میں کر لیتے، اس کی تفصیل بتاتے میں مہاجر حسین ایک ماہ لگا دیتے، ٹیلی فون پر تقریریں کر کر کے یہ حال ہو گیا کہ بھائی کو فون کریں تو ہیلو یوں کہیں گے: ''عزیز ساتھیوں، بزرگو، میری تحریک ماؤں اور بہنو، ہیلو!'' عزیز آباد جواب انہیں عزیز ہے نہ آباد۔ وہاں ان کے گھر 15 ٹیلی فون تھے۔ کسی نے پوچھا: یہاں 15 فون کیوں ہیں؟ کہا: اس لیے کہ اس سے زیادہ کی جگہ نہیں تھی۔ پہلی بار آنے والے غیر ملکیوں کو بتانا پڑتا ہے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ٹیلی فون ٹھیک کر کے روزی کماتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہ کر کے بھی کما لیتے ہیں۔

ان کا پسندیدہ دوست الطاف حسین ہے۔ ''ایسے'' دوست کی صحبت میں رہ کر یہ بھی ''ویسے'' ہو گئے ہیں۔ شیشہ دیکھتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں وہ شیشہ نہیں دیکھ

رہے، شیشہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ ان دنوں بندہ کراچی میں کسی سے ان کے پتے کا پوچھتا تو مہاجر ''کروٹن'' کے پتے کا بتاتے۔

جاگیرداروں نے سیاست کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ الیکشن ہارنے کے لیے بھی لاکھوں روپے چاہئیں، لیکن انہوں نے سیاست کو سستا کر دیا۔ وہ اس پر یقین رکھتے کہ جو ایک مارے، وہ قاتل۔ جو بہت سو کو مارے، وہ فاتح اور جو سب کو مار دے وہ خدا ہوتا ہے۔ انہیں کوئی کام کرنے کا غلط طریقہ بتاتا تو کہتے، مجھے وہ طریقہ بتاؤ جو مجھے پہلے معلوم نہ ہو۔ کہتے ہیں تعلیمی ادارے ان دنوں تعلیم و تربت کا مرکز بن گئے۔ رشتوں کا یہ عالم ہوا کہ جسے سب برا اور نا قابل اصلاح سمجھتے اسے دادا کہہ کر بلاتے۔ مہاجر حسین خود کو سیلف میڈ کہتے ہیں جب کہ لوگ انہیں میڈ ان مارشل لاء لکھتے ہیں۔ کچھ غوث علی شاہ کو پیر مہاجر حسین کا غوث اعظم سمجھتے ہیں۔ ویسے وہ سیلف میڈ نہیں لگتے۔ کہ اگر انہوں نے خود کو آپ کا بنایا ہوتا تو ایسا بنایا ہوتا؟

ڈاکٹر کے لیے تو دنیا میں دو قسم کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بیمار ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جنہوں نے بیمار ہونا ہوتا ہے۔ یوں بھی بیمار ہونا ڈاکٹروں کی مالی امداد کرنا ہی ہے۔ سو مریض الملت مہاجر حسین کے کسی اور پر احسانات ہوں نہ ہوں، ڈاکٹروں پر ضرور ہیں۔ بچپن میں وہ ڈاکٹر بن کر مریضوں کے کام آنا چاہتے تھے۔ یہ تو نہ کر سکے مگر مریض بن کر ڈاکٹروں کے کام آئے۔ صحت کی انہیں اتنی فکر رہتی ہے کہ کسی کو صحت مند دیکھ لیتے تو انہیں فکر ہونے لگتی۔ بچپن میں وہ محلے کی کلب میں لوہے کے باٹ اٹھایا کرتے اور ایک بار باٹ اٹھاتے پکڑے بھی

گئے۔ فروری کے مہینے میں سب سے کم دن بیمار رہتے، جس کی وجہ یہ ہوتی کہ فروری میں سب سے کم دن ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں، ہم نے مہاجر نوجوانوں کے لیے Health Club بنائے جو بعد میں Hellth Clubs نکلے۔ جہاں ڈرل کے لیے ڈرل ماسٹر نہیں ڈرل مشینیں تھیں۔ مہاجر حسین کا مخالفوں سے جو برتاؤ ہوتا ہے اس میں برکم اور تاؤ زیادہ ہوتا ہے۔

وہ ہر کام یقین سے کرتے ہیں۔ وہ تو شک تک یقین سے کرتے ہیں۔ ہمارا اردو زبان پر یہی احسان ہے کہ ہم پنجابی بولتے ہیں لیکن انہوں نے اردو کو نئے نئے محاورے دیئے۔ ان میں یہ نامعقولہ بھی ہے کہ زن، زر، زمین اور زبان فساد کی جڑ ہے۔ یوں جو پہلے مہاجر حسین کو عمر دراز ہونے کی دعا دیتے، پھر یہی دعا زبان کے لیے دینے لگے۔ انہوں نے کراچی کو ریاست بنایا۔ مگر اسے سمجھا خالدہ ریاست۔ ان دنوں کراچی کی سڑکوں پر مہاجر حسین کی اتنی بڑی بڑی تصویریں ہوتیں کہ وہ جاپانی تو اپنے ملک کی فلمی رسالے کے لیے ان کا انٹرویو کرنے پہنچ گئے۔ ان کی بامثال کامیابی کی وجہ ان کا یہ اصول تھا کہ سیاست میں اصولوں پر سودا بازی نہیں ہونا چاہیے، اس کے بغیر ہونا چاہیے۔ اب ان کے پاس خدا اور خلق خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صفائی اس قدر پسند ہے کہ ان کا حکم ہے، ہر کام صفائی سے کرو۔ پریس کو انہوں نے جتنا پریس کیا، آج تک کوئی نہ کر سکا۔ کہتے ہیں میری شادی ایم کیو ایم سے ہوئی ہے۔ ان کے ایم کیو ایم کے ساتھ سلوک سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

وہ پاکستان کے پہلے سیاست دان ہیں جنہوں نے باقاعدہ سیاست سے

ریٹائرمنٹ کا اعلان بھی کیا۔ ہمارے ایک مشہور نقاد نے کہا: ''میں فلاں اعلیٰ افسر پر ایسا مضمون لکھ رہا تھا کہ وہ فیض اور ندیم کے پائے کے شاعر بن جاتے مگر......'' ہم نے پوچھا: ''مگر کیا اس نے شاعری چھوڑ دی؟'' کہا: ''نہیں وہ ریٹائر ہو گئے۔'' یہی حال ان کے ریٹائرمنٹ کے اعلان کے بعد ہوا۔ اگرچہ سیاست میں ریٹائرمنٹ کا اعلان بھی سیاست کرنا ہی ہے۔ سیاست دان تو کہے کہ میں مر چکا ہوں، تب بھی سمجھیں اپنی قیمت بڑھا رہا ہے کہ ہاتھی سفید ہی کیوں نہ ہو۔ زندہ لاکھ کا اور مردہ سوا لاکھ کا۔ کچھ تو سیاست میں زندہ ہی اسی صورت رہ سکتے ہیں کہ وہ مر جائیں۔ تاہم مہاجر حسین یہ بھی کہیں کہ میں مر گیا تو سننے والا یہی پوچھے گا: ''کس پر؟'' وہ جب ہسپتال میں ہوتے تو صرف ایک آدھے بندے کو پتہ ہوتا کہ وہ کس بیماری کے ساتھ داخل ہیں کیونکہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ''بیماری'' کو ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا جاتا۔ ویسے بھی ہسپتال میں تبدیلی دل کے آپریشن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن بندہ کسی پارک میں تبدیلی دل کرتا پکڑا جائے تو کوڑے پڑ جائیں۔ بہرحال ہم تو مہاجر حسین کے بارے میں جاننے کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ دولت، عزت، صورت اور سیرت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔

خندہ پیش آنیاں

بندہ جب محسوس کرتا ہے کہ زندگی بے کار ہے تو وہ خودکشی کرنے کا سوچتا ہے یا سفر کرنے کا۔ دونوں کام نہ کر سکے تو شادی کر لیتا ہے۔ لیکن ہم نے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ دنیا کا سب سے دشوار سفر غریبی سے امیری تک کا ہے البتہ اس میں واپسی کا راستہ بڑا آسان ہے۔ سفر کے معاملے میں اپنی یہ حالت ہے کہ ہم کہیں کہ باہر جا رہے ہیں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے کمرے سے باہر جا رہے ہیں۔ بیرون ملک جانے میں یہی قباحت ہوتی ہے کہ وہاں دوست نہیں ہوتے۔ ہم اس پر خوش تھے کہ وہاں ہمارے بہت سے دوست نہیں ہوں گے۔ ہم روسیاح تو تھے تو سیاح نہ تھے۔ سیاح اور مسافر میں یہ فرق ہوتا ہے کہ مسافر سفر ختم ہونے پر شکر ادا کرتا ہے اور سیاح شروع ہونے پر۔ روسی لطیفے سنے تو بہت تھے یہ سفر ہم نے اس لیے کیا کہ ہم انہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ویسے اپنے ملک کو پسند کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں۔ لیکن پاکستان پسند کرنے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ ہی باہر جانے کی ضرورت تھی۔ ازبکستان کے بارے میں پتہ چلا کہ وہاں لڑکیاں پاکستانیوں کو دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ لیکن ہمارے وہاں جانے میں اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اب دیکھ کر ہنسنے لگی تھیں۔ ہم یہ ہنسیاں اکٹھی کر لائے ہیں۔ ہم سے ایک امریکہ یافتہ نے پوچھا۔ ''آپ ازبکستان میں کیا کر کے آئے ہیں؟'' شکل دیکھ کر خود ہی کہنے لگا ''لگتا ہے آپ تو سفر ہی کر کے آگئے۔'' پھر بولا ازبکستان کے بارے میں بتائیں؟ اس سے پہلے کہ ہم سانس لیتے اس نے بتانا شروع کر دیا کہ امریکہ کیا ہے؟

قہقہہ سالی

جیسے پیرانہ سالی سے مراد وہ سالی نہیں جو بوڑھی ہو چکی ہو ایسے ہی قہقہہ سالی وہ سالی نہیں جو قہقہے لگائے۔ ہم یہ جاننے کے لیے ازبکستان گئے تھے کہ وہ کس بات پر ہنستے ہیں؟ آپ بتائیں وہ کس بات پر ہنستے ہیں؟ وہ ہنسنے والی بات پر ہنستے ہیں۔ ایک بار روسی، فرانسیسی، پاکستانی اور امریکی اس پر بحث کر رہے تھے کہ خوشی کیا ہے؟ پاکستانی نے کہا۔ خوشی یہ ہے کہ کام کیے بغیر ہر ماہ تنخواہ مل جائے۔ امریکی نے کہا۔ خوشی یہ ہے کہ اپنی کار اور اپنی ہی فیملی کے ساتھ بندہ کنٹری سائیڈ پر جائے۔ فرانسیسی نے کہا، خوشی یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے ساتھ جھیل کے کنارے رہوں، کھاؤں، پیوں اور پھر...... ؟ پھر کیا؟ بولا: پھر کھاؤں اور پیوں۔” روسی نے کہا میرے نزدیک تو خوشی یہ ہے کہ میں ماسکو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں جب کے جی بی کا بندہ دروازہ کھٹکھٹائے اور میرے بارے میں پوچھے تو میں کہوں وہ تو ساتھ والے گھر میں رہتا ہے۔ ازبک نے کہا۔ ہماری خوشی تو بوتل میں بند ملتی ہے اسے واڈ کا کہتے ہیں۔ ویسے جو قوم واڈ کا پی سکتی ہے وہ ہر تلخی پی سکتی ہے لیکن یہ جاننا مشکل ہے کہ کون سی قوم کس بات پر ہنستی ہے کیونکہ اگر یہ پتہ چل جائے تو وہ قوم اس بات پر **ہنسنا** چھوڑ دے۔ ہم نے ایک دوست سے پوچھا۔ ہم پاکستانی پر کس بات پر ہنستے ہیں؟ تو وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

پریوں کے پرے

ہم نے جس سے بھی پوچھا ازبکستان میں کیا ہوتا ہے؟ اس کی باتوں سے یہی لگا کہ وہاں ہر چیز کا قحط ہے سوائے قحط النساء کے۔ ہم نے کبھی قحط سالی نہ دیکھی تھی سو اس سالی کو اسی سال دیکھنے کا ارادہ کرلیا۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ یہ علاقہ پریوں کا دیس ہے۔ سوچا ہر طرف پریوں کے پرے کے پرے ہوں گے۔ ایک محقق نے تو یہ بھی بتایا کہ فرغانہ دراصل پری خانہ ہے جو بگڑ کر فرغانہ بن گیا۔ پوچھا ''پریاں بگڑ کر کیا بنیں؟ کہا ''اکثر بیویاں بن گئیں'' کہتے ہیں چار سو قبل مسیح میں یہاں چالیس قبائل آباد تھے۔ جن کی سردار نہایت حسین و جمیل لیکن بے حد جنگجو خواتین ہوتی تھیں۔ وسط ایشیا کو شاید انہیں زنانہ قبیلوں کی وجہ سے پریوں کا دیس کہا جاتا ہو۔ واقعی وہ پریوں کا دیس ہے وہاں کے کالجوں میں اتنے خوب صوت طالب علم ہیں کہ لگتا ہے داخلے کے لیے بنیادی کوالیفکیشن خوب صورتی ہی ہے۔ اب تو کوئی پوچھے کہ ازبکستان میں بدصورت عورت کو کیا کہتے ہیں؟ تو جواب ہے ''ٹورسٹ''۔

مسز اچار

ڈاکٹر دوست سے پوچھا کہ زادِ سفر کے لیے کیا لے جاؤں۔ اس نے میری نبض اور بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کہا ''نائیلون کے دوپٹے لے جانا'' جب سے مولانا عبدالقادر آزاد نے لیڈی ڈیانا کو دوپٹہ اوڑھایا ہے تب سے ہمارے دل میں یہ خواہش تو تھی کہ جہاں کوئی ننگا سر نظر آئے اسے دوپٹہ زن کر دیا جائے۔

ہمارے ایک خان صاحب تو بے پردگی کے اتنے خلاف نکلے کہ انہوں نے تین ماہ میں چار سروں پر دوپٹے اوڑھا دیئے۔ ابھی ایک اور کو اوڑھانے ہی والے تھے کہ ان کے والد نے کہا۔ ''بس بیٹا شروع میں چار سے زیادہ کی اجازت نہیں'' ہمارے لیے یہ طبی مشورہ ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی اکیلی لڑکی کہیں سفر پر جائے تو اسے کہا جائے کہ شیونگ کا سامان لیتے جانا۔ ایک صاحب نے کہا ساڑھی لے جانا۔ ہم نے کہا اگرچہ یہ بہت اچھا لباس ہے لیکن ہم نے ابھی تک اسے پہننا شروع نہیں کیا۔ ساڑھی کو ہم مسز لاچا کہتے ہیں کہ یہ واحد لباس ہے جسے پہننے کے لیے کسی آزار بند کی ضرورت نہیں۔ اسے تو اتارنے کے لیے بھی اتارنے کی ضرورت نہیں۔ مسز اندرا گاندھی نے ایک بار کہا تھا ''پاکستان میں حکمران یوں بدلتے ہیں جیسے میں ساڑھیاں بدلتی ہوں۔'' اس تشبیہ سے موصوفہ کو مشتبہ ہی کیا کیونکہ ہمارے ہاں تو حکمران ہمیشہ عوام سڑکوں پر آ کر بدلتے ہیں۔ بہرحال ایک روسی مزاحیہ فنکار یاکوف سمرنوف سے کسی نے پوچھا کہ روس جانے والے کو ساتھ کیا لے جانا چاہیے؟ تو اس نے کہا ''ریٹرن ٹکٹ''۔

لپ اسٹک

ایک شاعر دوست نے کہا آپ کے ہم سفر جوش صاحب ہینڈ اسٹک ساتھ لے جا رہے ہیں۔ آپ لپ اسٹک لے جائیں کہ ازبکستان میں عاشقوں کو ان ہی اسٹکس سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ساتھ یہ بھی بتایا کہ شریف لڑکی وہ ہوتی ہے جس

کے پرس میں لپ اسٹک نہیں ہوتی وہ جو گھر سے لگا کر نکلتی ہے اسی میں پورا شہر پھر کر آ جاتی ہے۔ لپ اسٹک یعنی سرخی لگانا ہی نہیں اتارنا بھی فن ہے۔ اس فن کے ماہر کو گھروں میں ہمسایہ اور دفتروں میں باس کہتے ہیں۔ ہم نے گورا صاحب سے پوچھا کہ یہ لپ اسٹک مردوں کے کس کام آتی ہے؟ کہا کسی مرد سے پوچھیں؟ ہمارا سرخی سے صرف اتنا تعلق ہے کہ ہم عورت اور اخبار کی سب سے پہلے سرخی دیکھتے ہیں۔ ہمارے اخباروں کی طرح وہاں کے اخباروں کی سرخیاں بھی اب سیاہ ہی ہیں۔ کمیونزم کے دور میں وہاں کے سب سے بڑے اخبار پراودا نے بہترین سیاسی لطیفے کا خصوصی مقابلہ کروایا۔ مقابلے میں جیتنے والے کے لیے بیس سال سائبیریا میں قیام کا مفت انتظام تھا۔ یہ وہی اخبار ہے جس کے بارے میں وہاں کے اسّی سالہ ایکٹر نے کہا تھا ''میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے پراودا دیکھتا ہوں۔ اگر اس میں میری موت کی خبر نہ ہو تو کپڑے پہن کر تھیٹر چلا جاتا ہوں۔'' بہر حال ہمیں شاعر دوست کی طرف سے لپ اسٹک لے جانے کی منطق سمجھ نہ آئی۔ البتہ ایک مشہور انگریزی اخبار کی رپورٹر آئی جس کی سرکولیشن اخبار جتنی ہی تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے پوچھا۔ آپ نے جب مجھے آٹھ کالمی سرخی دینا ہو تو آپ اس کے لیے کیا تیاری کرتی ہیں؟ بولی میں سب سے پہلے قریبی سٹور پر جاتی ہوں اور میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک خریدتی ہوں۔''

پاکستان سے جاتے ہوئے ہمارے ساتھ ایک مسکراہٹ تھی اور ایک قہقہہ۔ جی ہاں طاہر اسلم گورا اور اے جی جوش۔ اے جی جوش ہمارے وہ ساتھی ہیں کہ جہاں بھی کوئی خاتون اپنے خاوند کو کہے ''اے۔ جی سنئے'' تو یہ جوش میں آجاتے ہیں۔ صحت ایسی کہ انہیں دیکھنے میں جتنی دیر لگتی ہے اتنی دیر میں آپ شاہی قلعہ دیکھ سکتے ہیں۔ جبکہ طاہر اسلم گورا صاحب تو کسی بیوی کی آواز سن کر بھی یوں مؤدب ہو جاتے ہیں کہ بیوی تک کو ان پر اپنے خاوند ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ گورا صاحب جب بھی اپنے سامان کے لیے ایئرپورٹ پر ٹیگ لینے جاتے۔ تو جوش صاحب کے لیے بھی ٹیگ لاتے، جوش صاحب کے سامان کے لیے الگ سے ٹیگ لاتے۔ ویسے بندہ سٹیشن یا ایئرپورٹ پر اترے اور پورٹر کے لیے اس کے پاس اٹھانے کو کچھ نہ ہو تو اس سے نظر نہیں ملا سکتا۔ لکھنؤ میں تین مسافر اترے۔ ایک مسافر نے قلی کو بلایا اور اپنا بریف کیس اسے اٹھانے کو دے دیا۔ دوسرے نے قلی کو بلوایا اور اپنی چھڑی اسے اٹھانے کو دے دی۔ تیسرے نے سوچا کہ کہیں وہ پیچھے نہ رہ جائے اس نے قلی کو بلایا اور اسے اٹھانے کے لیے اپنی ٹکٹ دے دی۔ ایک بار سٹیشن پر ہم نے ایک صاحب کو دیکھا جو بہت موٹی بیوی کے ساتھ ٹرین سے اترے اور قلی کو کہا سامان اٹھاؤ گے۔ قلی نے دیکھا اور بولا ''اس سامان کو اللہ ہی اٹھا سکتا ہے۔''

جو......لائی

جولائی ہمارے لیے جو۔لائی وہ گرمی ہی تھی۔ اتنی گرمی کہ دھوپ میں نکلنے والے کے ٹھنڈا ہونے کا ڈر رہتا۔گرم ہونے کے لیے جولائی ضروری نہیں۔گرم ہونا تو اتنا آسان ہے کہ ایک پاکستانی عورت نے روسی خاتون کو بتایا کہ ہمارے ہاں مردوں کو گرم کرنا کون سا مشکل کام ہے انہیں آپ ٹھنڈی چائے دیں تو گرم ہو جائیں گے۔ازبکستان جتنے پاکستانی جاتے ہیں ان میں سے اکثر کو ''لو'' لگی ہوتی ہے۔جب ہمارے ہاں گرمیوں میں بارہ بجتے ہیں تو ازبکستان میں اسی وقت اچھے موسم میں بارہ بجتے ہیں۔کہتے ہیں اس موسم میں وہ پسینہ خشک کرنے دھوپ میں کھڑے ہوتے ہیں۔سردیوں میں وہاں جس طرف دیکھو سردی پڑی ہوتی ہے۔ پہلے تاشقند میں محکمہ موسمیات نہیں تھا۔لوگ کے جی بی سے پوچھتے کون سا موسم ہے؟ اگر وہ کہتے موسم گرما تو وہ ہیٹر تیز کر کے سویٹر اور کمبل اتار دیتے۔سائبیریا میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ پہلے حکومت مخالفین کو وہاں بھیج دیتی۔پوچھا ''ان لوگوں کے سردی سے دانت تو بجتے ہوں گے''۔کہا ''نہیں حکومت نے اس کا انتظام کیا تھا۔البتہ جن کے ہوتے تھے ان کے بجتے تھے۔'' سائبیریا میں اتنی سردی ہوتی ہے کہ وہاں لوگ کھانے کے لیے ہاتھ دھوتے ہیں تو وہ بھی دستانے اتارے بغیر۔ ایک سابق کامریڈ کے بقول یہ امریکہ کا پراپیگنڈہ ہے وہاں برف پڑتی ہے مگر یہ برف اتنی ٹھنڈی نہیں ہوتی اس لیے سائبیریا میں اتنی سردی نہیں ہے، خاوند دور ہو تو بیوی کا سر بھاری رہتا ہے، پاس ہو تو یہ بھاری پن سر سے پاؤں میں کھسک آتا ہے۔لیکن موسم کوئی بھی ہو مسافر کے سامان کی سب سے بھاری چیز اس کی خالی جیب ہوتی ہے۔

H....AIR HOSTESS

ہوائی چیزوں کا ہمارے ہاں ایک ہی استعمال رہ گیا ہے۔ وہ ہے ہمیں ڈرانا۔ سو پی آئی اے کے جس جہاز سے ہم ازبکستان کے لیے روانہ ہوئے وہاں بھی ''ہوائی'' چیزوں سے یہی کام لیا گیا۔ ایئر ہوسٹس رکھتے ہوئے اس میں یہ خوبی دیکھی جاتی ہے کہ وہ کم سنتی ہو، کم دیکھتی ہو مگر دکھتی زیادہ ہو۔ اگر یہ خوبیاں نہ ہوں تو اسے پی آئی اے میں رکھ لیتے ہیں۔ ایئر ہوسٹس کو دیکھ کر ہمیں پتہ نہیں چل رہا تھا اس کے سر کے بال لمبے ہیں یا بازوؤں کے۔ ساتھی نے کہا، ''مجھے مونچھیں پسند آئیں'' ہم نے احتیاطاً پوچھ لیا، ''سٹیوارڈ کی یا ایئر ہوسٹس کی۔'' ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسی ایئر ہوسٹس ہوتے ہوئے مسافروں کو بیلٹوں سے باندھ کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی ہم نے کہہ دیا تھا ہم کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھیں گے کیونکہ کم ہوا سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس ایئر ہوسٹس میں اس قدر ممتا تھی کہ اسے دیکھتے ہی بچے ماؤں سے دودھ مانگنے لگتے۔ جہاز جب ذرا ڈولتا، گورا صاحب گھبرا کر جوش صاحب کی طرف دیکھتے۔ وہ سمجھ جاتے اور پہلو بدلنا بند کر دیتے۔ جہاز جب پاکستان کی حدود سے نکلا تو ایئر ہوسٹس پوچھنے آئی ''کیا پینا پسند کرو گے؟'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جہاز لڑکھڑانے لگا تو ہم نے کہا ''ہمیں بھی وہی پلا دیں جو پائلٹ پی رہا ہے۔''

اسلام آباد سے جہاز الماتہ جا کر رکا۔ اسے رکے اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اسلام آباد سے سوار ہوتے وقت ہمیں جہاز میں جو مکھیاں نظر آئی تھیں ان کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پچھلی سیٹ والے نے نیند کے عالم میں باہر دیکھتے ہوئے کہا ''دیکھیں انسان کیڑیاں لگ رہے ہیں'' ہم نے دیکھا اور کہا ''واقعی جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ہے ہی کیڑیاں۔ کیونکہ جہاز ابھی اڑا نہیں۔'' ہمیں جو پوچھنا ہوتا گورا صاحب سے پوچھتے کیونکہ ہم پاکستانیوں کو گورے کی بات پر جلد اعتبار آ جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا۔ جہاز کیوں نہیں اڑ رہا؟ تو گورا صاحب نے کہا ''قذاق آ رہے ہیں۔'' قذاق کا لفظ سنتے ہی ہم گھبرا گئے کہ لٹنا ہی تھا تو اپنے ملک میں لٹتے۔ اپنے کسی ہم وطن کا بھلا ہوتا مگر یکدم چند حسینائیں اندر داخل ہوئیں پتہ چلا یہی قذاق ہیں۔ تو تسلی ہوئی چلو لٹنے میں مزا تو آئے گا۔ مگر ان کے ہتھیار دیکھ کر ہم گھبرائے، ہر کسی کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ ہم نے سوچا شادی شدہ ہوں گی اسی لیے خود ساختہ ہتھیار اٹھا رکھے ہیں۔ ویسے بھی تیلا تیلا امید کے ساتھ اکٹھا کرو تو گھونسلا بنتا ہے۔ اگر بے دلی سے اکٹھا کیا جائے تو جھاڑو بنتی ہے۔ قذاقستان کے باشندوں کی حالت ہمیں جھاڑوؤں کی زبانی پتہ چلی۔ وہ جہاز میں جھاڑو دینے لگیں۔ جہاز اور ہمارا ذہن چٹکیوں میں صاف ہو گیا۔

مویشی بخیر

الماتہ قذاقستان کا دارالخلافہ ہے۔ ہمارے ہاں دارالخلافہ وہ جگہ ہوتی ہے

جہاں بڑے بڑے خلیفہ پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی قذاقستان وہ **ملک** ہے جہاں زیادہ تر لوگ قذاق ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملیں تو پوچھتے ہیں بال بچے کیسے ہیں؟ لوگ تو امجد اسلام امجد سے پوچھ لیتے ہیں ''بال'' بچے کیسے ہیں؟ قذاق جب ایک دوسرے کو ملیں تو پوچھتے ہیں۔ آپ کے مویشی کیسے ہیں؟ شادی کے بعد تو بندہ جواب دے دیتا ہے۔ ہم ان قذاق خواتین سے ان کے مویشیوں کا حال پوچھا چاہتے تھے۔ گائیڈ بک سے ہمیں مویشی کی روسی نہ ملی بھینس کی ملی۔ لیکن ہم صحت مند خواتین کے سامنے کبھی بھینس کا ذکر نہیں کرتے۔ ایک فلم ڈائریکٹر کے سامنے ایک صحافی نے ایک اداکارہ کو بھینس کہہ دیا جس پر فلم ڈائریکٹر ناراض ہوگیا کہ آپ نے بھینس کو اداکارہ کیوں کہا ہے۔ قذاقستان کا پرانا دستور ہے کہ انہوں نے کسی کو دعا دینا ہو تو کہتے ہیں خدا تجھے ایک ہزار بھیڑیں، اسّی اونٹ اور آٹھ شادی شدہ بیٹے دے۔ بد دعا دینا ہو تو کہہ دیتے ہیں خدا تجھے شادی شدہ بہویں دے۔

Funnyخرابی

بقول شخصے الماتہ سے جہاز پیدل تاشقند روانہ ہوا۔ جب تاشقند ائیر پورٹ پر اترا تو ساتھ ہی ہمارا چہرہ بھی اترا۔ یوں لگا جیسے ہم جہاز میں سوئے رہے اور جہاز آ کر لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا۔ وہاں ہمیں صرف وہی چیز اچھی لگی۔ جو ہم نے نہیں دیکھی۔ جہازیوں کھڑے تھے جیسے پرندوں کی ڈاریں بیٹھی ہوں۔ لگتا تھا ہم

پاس سے گزرے تو پھڑ پھڑا کراڑ پڑیں گے۔ چھوٹے جہاز چوزوں کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ آزادی کے بعد سے یہاں اس لیے پڑے ہیں کہ وہاں اتفاق فونڈری نہیں ہے۔امیگریشن آفیسر کے ساتھ سیکورٹی گارڈ واڈکا کی بوتل پکڑے یوں کھڑا تھا جیسے اس کی حفاظت پر مامور ہو۔گورباچوف نے اپنے دورِاقتدار میں ایک بار پینا بند کروا دیا تھا۔وہ ایک کارخانے میں گیا۔مزدور کام کر رہے تھے۔اس نے شراب پر پابندی کی افادیت بتاتے ہوئے کہا اگر تم ایک بوتل واڈکا پیو گے تو کیا اتنا کام کرسکو گے؟ مزدور نے کہا ''ہاں کرسکوں گا۔'' گورباچوف نے کہا چلو اتنا تو ہے ہی لیکن یہ بتاؤ اگر تم دو بوتل واڈکا پیو گے تو کیا اتنا کام کرسکو گے؟ کہا ہاں کرسکوں گا۔گورباچوف نے کہا چلو اگر تین بوتل واڈکا پیو گے پھر تو اتنا کام نہیں کر سکو گے نا؟ تو مزدور بولا ''کر تو رہا ہوں''۔

ہوائیاں

ہم پی آئی اے کے جہاز پر اتنا سوار نہیں رہے جتنا وہ ہم پر سوار رہا۔ڈاکٹر طاہر اسلم گورا نے اسلام آباد سے جو اٹیچی کیس جہاز میں رکھوایا تھا اس میں سے اٹیچی تو یہاں نہ پہنچا تھا صرف کیس ہی پہنچا تھا۔اس میں گورا صاحب کے کپڑے تھے۔ سوچا پی آئی اے والوں نے شاید اس لیے نہ پہنچایا ہو کہ تاشقند کا ماحول مغربی ہے۔وہاں کپڑوں کی کیا ضرورت؟ بہر حال گورا صاحب اس پر بھی خوش تھے کہ شکر ہے میں نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں ان پر پی آئی اے والوں کی نظر نہیں

پڑی۔ ویسے تو پی آئی اے سے مراد ہے ''پہنچیں گے انشاءاللہ'' جہاز کی لڑکھڑاہٹ دیکھ کر تو ایک پنجابی نے کہا تھا ''ایہہ ضرور گجھ پی آئی اے؟'' جبکہ آئی اے سے مراد ہے ''انفارم اللہ'' اور ایس اے ایس سے مراد ہے ''سیکس اینڈ ٹیسٹیفیکیشن''۔

پاکستان میں ایئر پورٹ سے نکلیں تو ہر طرف مرد ہی مرد نظر آتے ہیں وہاں ایئر پورٹ سے باہر نکلے تو ہر طرف عورتیں ہی عورتیں نظر آئیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمیں نظر ہی وہی آئیں جو عورتیں تھیں۔ یوں لگا جیسے یک دم بلیک اینڈ وائیٹ چلتی فلم کے بعد رنگین فلم چلنے لگے اور فلم بھی ایسی کہ ہم گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ کہیں ہمیں کوئی دیکھتا ہوا نہ دیکھ لے۔

تاش......قند

ہمارے میزبان آ گئے۔ میزبان شروع ہی میز سے ہوتا ہے۔ اس لیے مہمانوں کے سامنے بچھا بچھا رہتا ہے۔ وہ ہمیں خالی سڑکوں اور بھرے جسموں والے شہر تاشقند سے یوں گزار رہے جیسے چاہ رہے ہوں کہ تاشقند کو پتہ نہ چلے۔ اس شہر میں عورتیں اور دکانیں جلد کھل جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو گھر اور دیواریں پینٹ ہوتی ہیں یہاں بھی پینٹ ہوتی ہے۔ بہار کا موسم سارے شہر پر پھول پینٹ کر دیتا ہے۔ تاش ازبک میں پتھر کو اور قند شہر کو کہتے ہیں۔ یہ دو ہزار سال پرانا شہر ہے۔ مگر ہماری ملاقات اس بزرگ شہر کی بجائے 28 سالہ تاشقند سے ہوئی جس کی ساری حرکتیں ایسی تھیں جیسی اس عمر کے لوگوں کی ہوتی ہیں۔ تاشقند کی سڑک

کے کنارے کوئی پرانی چیز نظر آئے تو سمجھ لیں وہ کوئی خاتون یا مرد ہوگا۔ ساری عمارتیں 1966ء کے زلزلے کے بعد کی ہیں۔ کہتے ہیں یہ شہر تین شہیں یعنی جنت کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ جہاں قلعے اور تاریخی عمارتیں تھیں۔ میز بان نے ہمیں ایک پتھر دکھایا اور کہا ''یہ پتھر ایک ہزار تین سال دو ماہ پرانا ہے'' ہم نے پوچھا ''یہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ اتنے سال دو ماہ پرانا ہے'' کہنے لگے ''ایک ماہر ارضیات آیا تھا اس نے مجھے بتایا تھا یہ پتھر ایک ہزار سال پرانا ہے۔ اور یہ بات اس ماہر نے تین سال دو ماہ پہلے کہی تھی۔''

دس تر خوان

میز بان ہمیں سیدھے اپنے گھر کی میز پر لے گئے۔ ازبکوں کی رسم کے مطابق وہ دستر خوان ہی کیا جس پر کم از کم دس تر خوان نہ ہوں۔ ازبک مہمان کو یوں دیکھتے ہیں جیسے اس نے آ کر ان پر احسان کیا ہے ہمارے ہاں بھی مہمان کو یوں دیکھتے ہیں جب وہ جانے لگتا ہے ازبک روٹی توڑ کر لقمے مہمان کو پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کی روٹی کوشش کر کے ہم خود بھی توڑ سکتے تھے۔ وہاں تب تک ڈشیں آتی رہتی ہیں جب تک میز پر ذرا سی جگہ بھی خالی ہے۔ اس کے بعد سے ہم جس گھر بھی گئے کوشش کی کہ سب سے چھوٹی میز پر بیٹھیں۔ ہم سوچ رہے تھے اتنے کھانے پکانے میں اتنا وقت لگ جاتا ہوگا کہ ان کے پاس تو انہیں کھانے کا وقت بھی نہ بچتا ہوگا۔ انگریز کہتے ہیں مچھلی اور مہمان تیسرے دن بو دینے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک

دن مہمان، دوسرے دن مہمان تیسرے دن وبال جان۔ لیکن ان کے ہاں کوئی مہمان آئے تو پہلے تین دن کھانے سے اس کا منہ بند رکھتے ہیں، تیسرے دن پوچھتے ہیں، اب بتائیں کیسے آنا ہو؟ تب تک وہ اپنے آنے کی وجہ بھول چکا ہوتا ہے۔ بہر حال اس دستر خوان سے ہم تب اٹھے جب تھک چکے تھے۔

گرفتار ہم ہوئے

میز بان نے ہمیں اپنے گھر کا ایک کمرہ دکھایا کہ آپ یہیں رہیں گے۔ یہ سن کر ہم تو رہ گئے کہ اگر ہمیں گھر میں ہی رہنا تھا تو اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے ہاں تو بہت دیر تک ٹھہرنے والے مہمانوں سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ گھر کے افراد کا سا سلوک کیا جائے۔ کہتے ہیں اچھا میز بان وہ ہے جس کے ہاں مہمان کو یہ محسوس ہو کہ وہ اپنے گھر میں ہی ہے۔ کاش وہ اپنے گھر میں ہی ہوتا۔ یہاں تو گھر کا سا ماحول تھا۔ یعنی یہاں کوئی ہماری بات نہ سنتا تھا سنتا تھا تو سمجھتا نہ تھا اور سمجھتا تھا تو بولتا نہیں تھا۔ ہمارے ایک مزاح نگار دوست کو دوسرے ملک جا کر جب اپنے گھر کی یاد ستاتی وہ اداس ہو کر ساتھ والے کسی گھر میں بغیر اجازت گھس جاتے اندر سے تھوڑی دیر تک برا بھلا کہنے کی آوازیں آتیں پھر وہ باہر نکلتے تو خود کو دوبارہ اوکے محسوس کرتے۔ ہمارے میز بان اونچا سنتے ہی نہیں سمجھتے بھی اونچا تھے۔ تین گھنٹے وہ یہ سوچتے رہے کہ اتنی رات گئے کسی ہوٹل میں ہمیں جگہ مل سکتی ہے یا نہیں۔ کمیونزم کے دور میں البتہ مل جاتی، باہر نکلتے ہی

کے جی بی والے لے جاتے۔ان دنوں ایک شخص کے بیڈ روم کا دروازہ بار بار کھٹکھٹایا جارہا تھاوہ کھول نہیں رہا تھا۔آخر کسی نے کھڑکی کھول کر کہا جلدی سے باہر نکلو تمہارے گھر کو آگ لگی ہوئی ہے تو اس نے جلدی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ''تھینک گاڈ میں تو سمجھا کے جی بی والے آئے ہیں''۔

از بک بک

آدھی رات کو ہوٹل کی تلاش میں ہمارے میزبان کی گاڑی سڑک پر چل رہی تھی۔اس کے علاوہ اگر کچھ چل رہا تھا تو وہ میزبان کی زبان تھی۔سڑکیں ویران تھیں کسی کے نہ ہونے کا ڈر،کسی کے ہونے کے ڈر سے زیادہ ڈرانے والا ہوتا ہے۔ان کو گھبرائے دیکھ کر ہم گھبرانے لگے کہ کہیں اتنی رات گئے تاشقند میں ہوٹل ڈھونڈنا جرم تو نہیں اسی لیے اگر وہ کسی زنانہ نام کے ہوٹل کا نام لیتے تو ہم گھبرا کر فوراً ''نہ'' کہہ دیتے۔کہاوت ہے چھوٹی سڑک کہتی ہے ''جاؤ'' چھوٹا گھر کہتا ہے۔ ''ٹھہرو'' اور بڑا **ملک کہتا** ہے ''آؤ''۔چھوٹی سڑک وہ ہوتی ہے جس پر کوئی پبلسٹی سائن بورڈ نہ ہو۔اس لحاظ سے تاشقند میں کوئی بڑی سڑک نظر نہ آئی۔البتہ اتنی کھلی سڑکیں کہ جوش صاحب کو سڑک پار کرنے کے لیے ٹیکسی لینا پڑے۔پٹرول ضائع ہو رہا تھا پٹرول وہاں اتنا مہنگا ہے کہ جس کے پاس گاڑی ہو لوگ اس کے ہمدردی کرتے ہیں کہ اس کا گزارا مشکل سے ہوتا ہوگا۔پانچ دس گیلن پٹرول کسی کے پاس ہو تو وہ گاڑی خریدنے کا سوچنے لگتا ہے۔ہر ہوٹل سے یہی جواب ملتا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔گوجرانوالہ ہوتا تو ہم کہتے آپ کمرہ دے دیں خالی ہم خود کروا لیں گے۔دانشور جوناتھن رابان کہتا ہے۔غیر ترقی یافتہ ممالک کا پانی پینے کے قابل نہیں ہوتا اور ترقی یافتہ ممالک کی ہوا سانس لینے کے قابل نہیں ہوتی۔یہاں کی ہوا ہمیں غیر ترقی یافتہ ممالک والی لگی، اس ہوا میں نشہ تھا۔ہمیں نیند آ گئی یکدم گاڑی کی بریکیں چیخیں ہم نے دیکھا کہ پولیس نے گاڑی کو گھیرے میں لے رکھا

تھا۔

TERRIFIC POLICE

ہمارے میزبان نے ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی کی تھی اور رات گئے بھی پکڑ لیا گیا تھا۔اس نے کہا ''میں نے پہلی بار ایسی غلطی کی ہے''۔لیکن اس کے کہنے کے انداز سے لگ رہا تھا،اس کا اشارہ ہمیں لے کر چھڑ نے کی طرف تھا۔ وہاں رات کو بھی گاڑیاں اشاروں پر رکتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو رات کو اشارے ہی رکتے ہیں گاڑیاں چل رہی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو آٹو میٹک نظام ہے یعنی جونہی سرخ بتی سبز ہوتی ہے آٹو میٹکلی آپ کے پیچھے والی گاڑی کا ہارن بجنے لگتا ہے ۔وہاں لیفٹسٹ آج کل ڈرائیور ہی رہ گئے ہیں جو سڑک پر بائیں ہاتھ گاڑی چلاتے ہیں کچھ ملکوں میں سڑک کے دائیں ہاتھ چلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں درمیان میں چلاتے ہیں البتہ ہمارے ہاں اشاروں پر مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ رکتی ہیں۔ہمیں ٹریفک پولیس کا محکمہ اچھا لگتا ہے کہ یہ واحد محکمہ ہے جس میں آنے جانے والوں کو سیٹیاں مارنے کے بھی پیسے ملتے ہیں۔یہ ایشیا کا وہ شہر ہے جس میں زیر زمین ریلوے ہے۔ویسے ہماری ریلوے بھی ایسی ہے کہ اسے زمین کے نیچے ہی دبا دینا چاہیے۔

کنجیاں گنج کی

آخر ہمیں ہوٹل تاشقند میں کمرہ مل گیا۔ ایک مس ہمیں لیڈ کرتی ہوئی کاؤنٹر تک لائی اور ایک چابی دی۔ مس لیڈ ہونا ہمیں کبھی اچھا نہیں لگا۔ مس بھٹو نے اس لیے شادی کی تھی کہ لوگ پی پی پی والوں سے پوچھتے ''آپ کو کون لیڈ کر رہی ہے؟'' تو وہ کہتے مس لیڈ کر رہی ہے۔ اس مس نے ہمیں یوں چابی دی کہ ہماری تھکاوٹ اتر گئی۔ ہمارے ہاں لاہور میں جب کوئی معزز مہمان آتا ہے تو اسے میئر صاحب لاہور کی کنجیاں پیش کرتے ہیں۔ ہم نے ایک بار میئر صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ آپ باہر سے کسی مہمان کے آتے ہی لاہور کو تالے کیوں لگوا دیتے ہیں جو کنجیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندہ دلوں کے شہر لاہور کا تالہ، تالی سے کھلتا ہے۔ نیویارک سٹی میں ایک ایسی تقریب میں وہاں کے میئر نے غیر ملکی مہمان کو سٹی پن دی اور کہا اس سے آپ نیویارکر بن گئے ہیں۔ اگر آپ یہ کیب ڈرائیور کر دکھائیں گے تو وہ آپ سے کرایہ نہیں لے گا۔'' تو حاضرین میں سے آواز آئی اگر آپ اس پر یقین کریں گے تو ابھی آپ نیویارکر نہیں ہیں۔ تاشقند والے معزز مہمان کو جو سب سے پہلا تحفہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کی آنکھ حسن سے بھر دیتے ہیں۔ ہوٹل کے کاریڈوروں میں خوب صورتیاں ہمارے دماغ میں تیز چل رہی تھیں۔

مسٹر معلوم نہیں

اس مس نے پتہ نہیں کیا پوچھا؟ ہم نے کہا ''معلوم نہیں''۔ وہ رجسٹر پر لکھنے لگی، ''مسٹر معلوم نہیں''۔ فکر تونسوی صاحب کہتے ہیں ایک بار ایک سیاح نے لال قلعہ

دیکھ کر کہا کہ اس کو تعمیر کرنے والا کون تھا؟ قریبی مقامی باشندے نے کہا، معلوم نہیں، بدیسی سیاح بڑا متاثر ہوا۔ اس نے سوچا مسٹر معلوم نہیں کوئی بڑا عظیم آدمی ہو گا جس نے یہ سب بنایا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مسٹر معلوم نہیں کو ضرور ملے گا۔ لال قلعے سے بارہ آیا تو کچھ لوگ ایک جنازہ اٹھائے جا رہے تھے۔ سیاح نے ایک راہگیر سے پوچھا یہ کون انتقال کر گیا ہے؟ اس نے کہا ''معلوم نہیں'' مسٹر معلوم نہیں کہ انتقال پر بدیسی سیاح کو بہت افسوس ہوا۔ اُہ، وہ بیچارہ ایک عظیم آدمی سے ملاقات سے محروم رہا۔

بائیں بازو والی

محترمہ بائیں ہاتھ سے لکھ رہی تھی جس سے پتہ چلا کہ لیفٹسٹ ابھی یہاں ہیں بعد میں پتہ چلا کہ اس کا تعلق بائیں بازو سے ہے نہ دائیں بازو سے اس کا تعلق تو بانہوں سے ہے۔ لینن جس کا قد ایسا تھا کہ اسے ہر کسی سے سر اٹھا کر بات کرنا پڑتی اور سر ایسا کہ سکول کے بچوں سے پوچھا جاتا کہ دنیا کا سب سے بے آباد اور ویرانہ خطہ کہاں واقع ہے؟ تو جواب ہوتا لینن کی ٹوپی کے نیچے۔ وہ مقبول ترین لیڈر ہونے کے باوجود اپنے لباس اور حلیے کی ذرا پروا نہ کرتا۔ وہ چینی کے بغیر چائے پیتا۔ ہم نے صرف ایک بار چینی کے ساتھ چائے پی یہ چینی لڑکی لاہور کے ایک ہوٹل میں ہماری ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ لینن نے اپنے کام میں مدد لینے کے لیے سیکرٹری یا ملازم نہ رکھا تھا۔ وہ سارے خطوں کے جواب خود اپنے قلم سے دیتا

تھا۔ جب اس کے دائیں ہاتھ پر فالج گرا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی کوشش کی اور باقی عمر بائیں ہاتھ سے لکھتا رہا۔ شاید اسی لیے اس کے ماننے والے بائیں بازو والے کہلائے اب تو بیشتر دائیں بائیں ہو گئے ہیں۔

چاک و چوبند

زبان نہ آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ آپ اشاروں سے جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو جس کو زبان آتی ہے اسے بھی جو لڑکیوں کو کہنا ہوتا ہے اشاروں میں کہتا ہے جلد ہی ہم اشاروں میں اتنے ماہر ہو گئے کہ ٹریفک پولیس میں بھرتی ہو سکتے تھے۔ کمرے میں ہم نے سب سے پہلے جا کر گھڑی دیکھی موجود نہ پا کر خوشی ہوئی۔ لاہور ہوسٹل میں ہمارے کمرے میں تین گھڑیاں ہیں۔ ہر گھڑی پر مختلف وقت ہوتا ہے۔ ایک بڑی گھڑی تو پنکھے کا کام بھی دیتی ہے۔ اگر سب گھڑیوں پر ایک ہی وقت ہو تو پھر تین گھڑیوں کی کیا ضرورت، تینوں سے ہم اپنی مرضی کے حساب سے وقت دیکھتے۔ اگر صحیح وقت معلوم کرنا ہو تو بیل دے کر نوکر کو بلا کر پوچھ لیتے۔ ویسے پاکستان میں گھڑی کا ایک ہی استعمال رہ گیا ہے۔ یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ بندہ کہاں کہاں سے کتنا کتنا لیٹ ہے۔ ہوٹل میں اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے ہم نے اتنی صحت مند خواتین اتنے چست لباس میں دیکھیں کہ ہمیں بار بار لگ رہا تھا کہ یہاں پشتو فلموں کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ رات گئے تک یہ سٹاف اتنا "چاک" و چوبند تھا۔ کہتے ہیں ایک روسی خاتون کو امریکہ

میں جاب ملی تو کمپنی والوں نے کہا کام آٹھ گھنٹے روزانہ ہوگا اور ہفتے میں ایک چھٹی ملے گی۔تو روسی خاتون بولی۔ بہت بہت شکریہ لیکن سر مجھے پارٹ ٹائم جاب نہیں چاہیے۔''

گورستان

ہوٹل تاشقند میں گورا صاحب اور میں ایک کمرے میں آ گئے اور جوش صاحب کے لیے الگ کمرہ لینا پڑا۔ ہمیں پتہ چلا کہ جوش صاحب یہاں اپنا علیحدہ ہوٹل بنوانا چاہ رہے ہیں۔ ہم نے کہا ''جوش صاحب چند دنوں کے لیے علیحدہ ہوٹل بنوانے کی کیا ضرورت ہے!'' ایک ان جیسا پنجابی جاپان گیا اور ایجنٹ کو کہا اتنے کم پیسوں میں کسی جگہ رہنے کے لیے کمرہ لے دیں۔ ایجنٹ نے بڑی کوشش کے بعد کہا اس کرائے میں ایک ہی جگہ مل سکتی ہے۔ مگر چھوٹی ہے۔ پوچھا کتنی چھوٹی ہے؟ اس نے پھر فون پر رابطہ شروع کیا۔ جاپانی نے ایک دو جگہ فون کر کے گفتگو کی اور پھر فون ہولڈ کر کے پوچھا آپ کتنے لمبے ہیں؟ جوش صاحب اکیلے کمرے میں رہتے اور کبھی کبھی کمرے میں اکیلے بھی رہتے۔ میں اور گورا صاحب مل کر اکیلے رہتے۔ دوسرے ملک میں دو شریف آدمیوں کا ایک ساتھ اکٹھے رہنا جتنا مشکل ہے اتنا دو غیر شریف آدمیوں کا نہیں کیونکہ غیر شریف آدمیوں کی سرگرمیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر شریفوں کی مختلف۔ کہتے ہیں ملا کے ساتھ رہنا ملا ہونے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کہاوت ہے روم میں ہو تو وہ کرو جو رومن کرتے ہیں۔ اگر

آپ کسی اور جگہ ہیں تو وہ کریں جو کسی اور جگہ کرنا چاہیے اور کسی اور جگہ جا کر ہم نے بھی وہی کیا جو کسی اور جگہ جا کے ہی کرنا چاہیے۔

ABROAD MINDED

ہم Broad Minded تو ہیں مگر Abroad Minded نہیں۔ سونے کے بعد ہم پاکستان میں ہوتے البتہ صبح آنکھ تاشقند ہوٹل میں ہی کھلتی۔ یوں جتنی راتیں وہاں رہے سونے کے بعد لاہور آ جاتے۔ اب جب سے لاہور آئے ہیں اکثر سونے کے بعد تاشقند ہوتے ہیں اور رات وہاں گزار کر صبح لاہور میں تھکے تھکے اٹھتے ہیں۔ ہوٹل کے ہر کمرے میں ٹی وی تھا بقول باب ہوپ وہاں آپ کو دیکھنے کے لیے ہر ہوٹل میں ٹی وی ہوتا ہے۔ ہم نے ٹی وی لگایا چینل بدلا تو ڈر گئے ہمیں یاد آ گیا کہ ایک بار ایک روسی نے ٹی وی لگایا تو برژنیف کی تقریر لگی تھی۔ دوسرا چینل بدلا اس پر بھی وہی تقریر۔ تیسرا چینل بدلا اس پر بھی وہی تقریر تھی۔ اس نے تنگ آ کر چوتھا چینل بدلا تو ایک کے جی بی کا بندہ ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا کہ خبردار اب پھر چینل بدلا تو...... ہم نے اسی ڈر سے فرج نہ کھولی۔ پانی پینے کے جگ کی طرف بڑھے تو اس میں قہوہ تھا۔ وعدہ روسی میں پانی کو کہتے ہیں اور پانی کا یہاں صرف وعدہ ہی ہوتا ہے جتنا پانی ان کے گھروں میں ہوتا ہے اس سے زیادہ تو ان کی عورتوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہاں گھروں اور ہوٹلوں میں فینز نہیں ہمارے ہاں تو اداکارائیں فینز کے بغیر سردیاں نہیں گزار سکتیں۔ پانی

اتنا مہنگا ہے کہ کوئی امیر آدمی ہی وہاں پانی افورڈ کر سکتا ہے۔غریب غربا شراب پر ہی گزارہ کرتے ہیں۔ہم نے سنا تھا وہاں کے ہوٹل میں بندہ راکھ جھاڑ دے تو ہفتہ بعد جا کر اپنی راکھ پہچان سکتا ہے شاید اس لیے کمرے میں جگہ جگہ راکھ بکھری تھی کہ ہم سے پہلے رہنے والوں نے ہفتے بعد اسے پہچاننے آنا ہوگا۔

ماہ غسل

نہانے کے لیے غسل خانے جانے لگے تو ساتھی سے پوچھا ''غسل خانے میں پانی ہے؟'' بولے ''غسل خانے میں تو ہے مگر ٹونٹیوں میں نہیں'' اندر گئے تو اندر سارا کمیونزم نظام تھا۔کچھ پتہ نہ چلتا کہ جب ٹونٹی کھلے گی تو پانی کہاں سے نکلے گا۔رات کو پینے کے پانی کے جگ کی بجائے قہوہ کا جگ ملا تو خدشہ ہوا کہ یہاں لوٹے میں بھی پانی کی بجائے قہوہ ہی ملے گا۔سو پانی دیکھ کر تسلی ہوئی البتہ باتھ روم دیکھ کر لگا کہ یہ روم باتھ کے علاوہ اور کسی کے کام کے لیے موزوں ہے۔پرائیویسی کا اس قدر انتظام تھا کہ باتھ روم کے شیشے میں سے کوئی آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا یہاں تک کہ آپ خود اپنے آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔پتہ چلا پاکستانی یہاں آ کر اس قدر نہاتے ہیں کہ لگتا ہے ماہ غسل منا رہے ہیں۔ایک پاکستانی کو بار بار نہاتے دیکھ کر تو ایک شخص نے پوچھ ہی لیا کہ کیا بھابی ساتھ آئی ہیں؟ آرٹسٹ لوگ ذرا کم نہاتے ہیں۔امریکہ کے ایک اخبار میں یہ اشتہار چھپا تھا ''ایک کمرہ کرائے کے لیے موجود ہے۔غسل خانہ نہیں ہے۔آرٹسٹ حضرات کے لیے نادر موقع''۔ہم

نے ملازم کو بلوایا کہ غسل خانے سے پانی لیک کر رہا ہے۔ اسے ایک جگہ اشارہ کر کے سمجھایا کہ یہ پانی لیک کر رہا ہے۔ وہ جلد مرمت کر کے چلا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ اب پانی اس جگہ سے لیک نہیں کر رہا تھا دوسری جگہ سے کر رہا تھا۔ مستری کو دوبارہ بلوا کر نٹ کسنے والی چابی سے اس کے سامنے نٹ کس کر بتایا کہ لیک بند ہو سکے اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔ پانچ منٹ بعد وہ مستری آیا اور اس نے ہمارے بستر پر غسل خانے کی تمام ٹونٹیاں لا کر رکھ دیں۔

ڈاکٹر یونس گدھے

ہم ابھی باتھ روم میں ہی تھے کہ ہمیں کمرے میں کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو ایک حسینہ گورا صاحب سے کچھ کہہ رہی تھی۔ گورا صاحب نے پتہ نہیں اس کے کس سوال کے جواب میں کہا ڈاکٹر یونس۔ تو وہ بولی ڈاکٹر یونس گدھے۔ ہمارا ذہن فوراً کے جی بی کی طرف چلا گیا کہ ان کا جاسوسی نظام اتنا تیز ہے کہ ابھی رات کو ہم یہاں آئے ہیں اور انہیں ہمارے بارے میں اتنا کچھ پتہ ہے۔ جتنا پاکستانیوں کو بھی پتہ نہیں۔ گورا صاحب نے بتایا کہ اس سے ان کی زبان میں یہ مراد ہے کہ ڈاکٹر یونس کہاں ہے؟ ایک ایسا ہی واقعہ ہمارے دوست ڈاکٹر رفیق کے ساتھ پیش آیا۔ وہ سعودی عرب گئے۔ ائیر پورٹ سے باہر نکلے ٹیکسی سٹینڈ کی طرف آئے تو ہر ڈرائیور انہیں ان کے نام سے بلا رہا تھا۔ ہر کوئی انہیں آواز دے رہا تھا۔ یا رفیق...... ٹیکسی بازار گئے تو وہاں بھی اسے دیکھتے ہی

دکان دار کہنے لگے۔ یار فیق! اس نے ہمیں خط میں لکھا کہ سعودی عرب کی جاسوسی اتنی تیز ہے کہ ائیر پورٹ پر اترنے سے پہلے ہمیں انہیں میرے نام کا پتہ چل گیا تھا۔

محبت خانم

صبح تیار ہو کر کمرے سے نکلے تو سامنے ایک سونے کے دانت والی عورت نظر آئی۔ یہی دانت اس کے جسم کا سب سے قیمتی جز و تھا۔ وہ آتی ہوئی تو نہیں البتہ جاتی ہوئی اچھی لگتی تھی۔ وہ ہمارے پاس آ کر رکی، اس کی زبان ہمیں سمجھ نہ آ رہی تھی۔ وہ بار بار جوش صاحب کے کپڑوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ شرما گئے تو گورا صاحب نے بتایا وہ انہیں کپڑوں کا تاجر سمجھ رہی ہے۔ حالانکہ جوش صاحب کے کپڑوں کو اتنا بھی کپڑا نہیں لگتا۔ پتہ چلا کہ اس نام محبت خانم ہے۔ محبت خانم کی شکل ایسی تھی جیسی شکل ہمارے ہاں مولوی محبت کی پیش کرتے ہیں۔ پتہ چلا وہ عورت بڑی کھلاڑی ہے۔ ہمیں تو وہ کھلاڑی سے زیادہ کھیل لگی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم کچھ بیچتے نہیں تو اس نے جو کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ بیچتے نہیں تو کچھ خرید ہی لو وہاں بوڑھی عورتیں انڈسٹری لگا لیتی ہیں جبکہ جوان تو خود انڈسٹری ہوتی ہیں۔

علی شیر تلخ نوائی

ہوٹل میں ہمارا کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ چوتھی منزل سے ہم نے دیکھا تو سامنے

علی شیر نوائی تھیٹر یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی حسینہ کے سبز دوپٹے پر کاڑھا ہوا ہو۔علی شیر نوائی ان کے قومی شاعر ہیں۔ ازبک جس کی عزت کرنا چاہیں اسے شاعر سمجھنے لگتے ہیں وہ تو ظہیر الدین بابر کو بھی ایک شاعر کے طور پر جانتے ہیں۔ہم تو جسے نہیں سمجھتے ہیں۔ پتہ چلا تاشقند میں غالب محلّہ بھی ہے۔ جس کی خوبی یہ ہے کہ وہاں کوئی شاعر نہیں رہتا۔ پوچھا اس کا نام غالب محلّہ کیوں رکھا ہے؟ ایک ستم ظریف بولا''یہاں کے لوگ بھی قرضے لے کر واپس نہیں کرتے۔''وہاں کے ایک بڑے ادیب آئیبک نے بیس سال کی محنت سے ناول ''علی شیر نوائی'' لکھا جس پر اتنی تلخ نوائی ہوئی کہ اس دکھ سے اس کی زبان بند ہوگئی پھر کئی برس وہ زندہ رہے۔مگر کسی سے نہ بولے۔ ہمارے علامہ اقبال کو تو قوالوں نے تالیوں سے پیٹ دیا لیکن علی شیر نوائی کو قدرت نے قوم سے بچانے کے لیے یہ کیا کہ جب علی شیر نوائی کی پانچسوویں سالگرہ منانے کا پروگرام تھا تو ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ 25 سال بعد پانچسو پچیسویں سالگرہ کے جشن کا اہتمام کیا جا رہا تھا تو تاشقند میں زلزلہ آ گیا پورا شہر غائب ہو گیا۔ 1991ء میں اس کی 550ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تو روس کا شیرازہ بکھر گیا۔

لائے، مائے، چائے

ہمارے ہاں دودھ پینے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں ایک کا نام چائے ہے۔ وہاں چائے سے مراد قہوہ ہوتا ہے۔ جو بڑے کولر جیسے برتن میں ملتا ہے۔گرم گرم پی

لوتو چائے۔ اگر چائے ٹھنڈی کر لوتو ٹھنڈا تیار۔ ہمیں تو لگتا تھا ہم نے آئس کریم بھی مانگی تو چائے کو ہی فرج میں رکھ کر بنائیں گے۔ اندرے پوف کے زمانے میں واڈکا پینے پر پابندی لگی تو یہاں کے لوگ چائے دانی میں پینے لگے۔ چائے کو وہ لائے، مائے، چائے کہتے ہیں۔ پہلے اسے پیالے میں ڈالتے ہیں وہ لائے ہوتی ہے یعنی مٹی، پھر اسے دوبارہ چائے دانی میں انڈیل دیتے ہیں آدھ منٹ بعد پھر پیالی میں ڈالتے ہیں یہ مائے ہوتی ہے یعنی تیل، تیسری مرتبہ ڈالوتو چائے ہوتی ہے۔ جس سے اندازہ لگائیں ان کے پاس کتنا وقت ہوتا ہے۔ ناشتے کے لیے کیفے ٹیریا گئے تو وہاں بھی زبان کا مسئلہ تھا۔ ایک حسینہ ایسی زبان بول رہی تھی کہ دل چاہا ایسی زبان ہمارے منہ میں ہو۔ بہر حال انچارج خاتون کو تصویر بنا کر بتایا کہ ناشتے میں کیا چاہیے؟ ہماری طرح ایک آئرش سیین نامی جو فرنیچر کا بزنس کرتا تھا۔ اس نے فرانس کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ جب وہ واپس آئر لینڈ آیا تو اس کے دوست برنیڈان نے پوچھا فرانسیسی کا تو تمہیں ایک لفظ نہیں آتا۔ پھر تم نے وہاں کیسے گزارا کیا؟ سیین نے کہا میں بتاتا ہوں مجھے ایک ہوٹل نظر آیا میں نے وہاں کاغذ پر پلیٹ اور کھانے کی تصویر بنائی اور کھانا کھالیا۔ ناچتے لوگوں کی تصویر بنائی ڈانس کلب پہنچ گیا۔ تم حیران ہو گے کہ رات کو ایک لڑکی میرے کمرے میں آئی اس نے پین سے بستر کی تصویر بنائی۔ برنیڈان حیرانی سے بولا ”سیین تو بول کر تو بتا نہیں سکتے تھے پھر اسے کیسے پتہ چل گیا کہ تمہارا فرنیچر کا بزنس ہے۔“

ہم نے گورا صاحب سے کہا ہمیں کچھ جوک بکس دکھائیں۔وہ ہمیں لے کر تاشقند ہوٹل کے اس کونے میں آ گئے جہاں سکھ ٹھہرے ہوئے تھے۔سکھوں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ پتہ نہیں چلتا وہ واقعہ سنا رہے ہیں یا لطیفہ۔وہ سنجیدہ گفتگو کر رہے ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں انہوں نے پی رکھی ہے۔ان میں اتنی سینس آف ہیومر نہیں ہوتی جتنی نان سینس آف ہیومر ہوتی ہے۔وہ سکھ تو تھے مگر پنجاب کے نہ تھے۔ پنجاب کے سکھ دوسرے علاقوں کے سکھوں سے زیادہ سکھ ہوتے ہیں۔بڑے ڈرے ڈرے لگے۔پتہ چلا دو سال قبل اس ہوٹل پر چھاپہ پڑا تھا اس وقت تو یہ بچ گئے بعد میں انہیں حالات کی سنگینی کا پتہ چلا تب سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔کہ اگر چھاپے میں پکڑے جاتے تو......ایک سکھ نے بتایا ''ہم رقیب برداشت نہیں کر سکتے۔جس کا حل یہ ہے کہ ہمیشہ بدصورت لڑکی سے فلرٹ کرو۔جس کے لیے بڑی محنت چاہیے کیونکہ یہاں بدصورت لڑکی تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔'' اس نے بتایا میں نے دو سال قبل جوتوں کا کاروبار شروع کیا۔اب میرے پاس کل دو جوتے ہیں۔ایک سردار نے کہا میں بزنس میں اس لیے ناکام ہوا کہ میں نے کسی کے مشورے پر عمل نہ کیا۔دوسرے سردار نے کہا میں بزنس میں اس لیے ناکام ہوگا کہ میں نے ہر کسی کے مشورے پر عمل کیا۔ایک سردار جو کئی ماہ سے تاشقند میں رہ رہا تھا واپس وطن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔اسے بیوی نے خط لکھا تھا۔جتنی جلدی ہو سکے گھر لوٹ آؤ نہیں تو میں وہ کچھ یہاں بیچنا شروع کر دوں گی جو میں سمجھتی ہوں تم وہاں خرید رہے ہو۔

کھر گوشیاں

ہم تو عورتوں سے سرگوشیاں کرنے کو کھر گوشیاں ہی سمجھتے ہیں۔ اور کھر گوشیوں کے لیے ٹیلی فون سے بہتر کوئی شے نہیں۔ ازبکستان میں ٹیلی فون فری ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں لوگ ٹیلی فون پر فری ہوتے ہیں۔ ایک آفس میں ملازم اتنی پرسنل کالز کرتے کہ انچارج نے لکھ کر لگا دیا کہ پرائیوٹ کال کرنا منع ہے۔ اگلے ہی ایک ملازم فون کر رہا تھا، منیجر نے پوچھا کیا یہ پرائیوٹ کال ہے؟ کہا نہیں سر میں تو اپنی بیوی کو فون کر رہا ہوں۔ کہتے ہیں جو بیوی اور خدا سے نہیں ڈرتا وہ اچھا آدمی نہیں ہوتا۔ ہمارے دوست بیوی سے یوں ڈرتے ہیں جیسے خدا سے ڈر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ خدا سے یوں ڈرتے ہیں جیسے بیوی سے ڈر رہے ہوں۔ ٹیلی فون سے ہمیں وہ لطیفہ یاد آ گیا جو ازبکستان کے طنز و مزاح کے رسالے مشتم میں 1989ء میں لطیفوں کے مقابلے میں اول آیا۔ ”بندہ اخبار پڑھ رہا تھا فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بیوی کو کہا۔ تم فون اٹھاؤ اگر میرا پوچھے تو کہہ دینا میں نہیں ہوں۔“ بیوی نے فون اٹھایا اور کہا ”میرا شوہر ادھر ہی ہے۔“ خاوند بولا میں نے تمہیں کہا تھا میرا فون آئے تو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔ بیوی نے کہا۔ وہ آپ کا فون نہیں تھا۔

ڈاکٹر تاشقند مرزا

ڈاکٹر تاش مرزا تاشقند کی ایسی شخصیت ہیں کہ آپ انہیں ڈاکٹر تاشقند مرزا

کہہ سکتے ہیں۔آج کل وہ پاکستان میں ازبک سفارت خانے میں خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔انہیں اردو آتی ہے۔پاکستان سے ازبک جانے سے پہلے سوچتے ہیں کہ ان سے ازبک زبان سیکھیں گے مگر ان کو مل یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان سے اردو سیکھنی چاہیے۔ہم میں چونکہ زبان سیکھنے کی صلاحیت نہیں۔اگر ہوتی تو ہم ان سب سے پہلے اردو زبان سیکھتے۔وہ ہمارے لیے ہوٹل میں گھر سے جو پراٹھے بنوا کر لائے وہ ایسے تھے کہ انہیں کھانے کے لیے بندہ لاہور سے تاشقند جا سکتا ہے۔ہم نے انہیں بتایا کہ ہم یہاں کے ہنستے لوگ دیکھنے آئے ہیں اور ان کی ہنسیاں اکٹھی کرنے کا ارادہ ہے۔ہم سمجھتے ہیں مزاح یہ ہے کہ بندے کو اس کی خامیاں اس طرح بتائی جائیں کہ وہ سنے تو مسکرانے لگے۔اور اس کا ہمسایہ سنے تو ہنسنے لگے۔انہوں نے کہا یہاں مزاح اور مزاح کے بارے میں میری اردو دان بیٹی نگار مرزا ئیوف بتا دے گی۔جبکہ ہنسیوں سے ملوانے کے لیے دادا جان نوری آئیں گے۔دادا کا لفظ سن کر ہم ڈر گئے سوچا آ کر نصیحتیں ہی کریں گے لیکن انہیں دیکھا تو الٹا انہیں نصیحتیں کرنے کو دل چاہنے لگا۔انہوں نے آتے ہی ہمیں یوسف صاحب کہنا شروع کر دیا۔کوئی لڑکی یہ بات کہتی تو بات ہی اور تھی۔ہم نے انہیں کہہ دیا دادا جان ہمارا نام یونس ہے۔انھوں نے تھوڑی دیر توقف کیا اور کہا ''میرا نام دادا خان ہے''۔

دادا دلدادا

دادا خان نوری ازبکستان کی ادبی ٹرین ہیں۔ جو چلتی یوں ہی ہے جیسے ہماری ٹرین چلتی ہے۔ یعنی جس دن مقررہ وقت پر پہنچ جائے لوگوں سے کہنا پڑتا ہے۔ ہم زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ وہ اتنے متحرک ہیں کہ کھڑے بھی ہوں تو لگتا ہے حرکت کر رہے ہیں۔ عینک رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ ایک دن ایسے ہی کہیں عینک بھول گئے۔ دکان پر گئے۔ نئی عینک خریدی رقم ادا کی اور عینک وہی بھول آئے۔ ایک روز باہر سے واپس آئے اور کہا دیکھا بیگم آج میں عینک بھول کر نہیں آیا میرے ہاتھ میں موجود ہے۔ تو بیوی نے کہا۔ مگر آج تو آپ گھر سے عینک لے جانا ہی بھول گئے تھے۔ ان کو اردو آتی ہے جسے سن کر لگتا ہے ہمیں اردو نہیں آتی۔ اس سفر میں وہ ہمارے ترجمان بھی رہے۔ وہ اتنی ترجمانی نہ کرتے جتنی اپنی کرتے۔ اک ایسے ہی ترجمان کے بارے میں ہے کہ اس نے اناؤنسمنٹ کی کہ اب آپ کے سامنے **ملک** کے ذہین ترین اور سب سے بڑے شاعر، غالب ثانی اور بہت بلند پایہ مقرر کو بلاتا ہوں جنہوں نے میرے لیے یہ اناؤنسمنٹ بھی لکھی۔ وہ ممکن کام کو ناممکن بنا سکتے ہیں۔ ان جیسے ایک ادیب نے جاپان میں بہت کم پیسوں میں ایک شخص کے تین دن اور دو راتوں کے قیام کا یوں انتظام کیا کہ اس شخص نے پوچھا اتنا سستا یہ کیسے ممکن ہوا؟ کہا دن جو ملے ہیں وہ 11,12,13 جولائی ہیں۔ جبکہ راتیں 12,22,23 جولائی ہیں۔ دادا خان جس رفتار سے سوچتے ہیں اس رفتار سے بولتے نہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا اصل تلفظ کیا ہے سمر قند یا ثمر قند کہا ثمر قند۔ ہم نے کہا بہت مہربانی آپ کی رہنمائی کی۔ کہا، آپ کا بھی شکریہ۔

GET TWO GETHER

دادا خان نے آتے ہی کہا ہمارے عوامی ادیب حمید غلام کی سترہویں سالگرہ ہے۔ آپ کو اس GET TWO GETHER پر لے جاتے ہیں۔

راستے میں گورا صاحب نے پوچھا ''آپ دادا خان کی علم دوستی سے متاثر ہوئے یا مہمان نوازی سے؟'' تو ہم نے کہا ''ان کی ڈرائیونگ سے'' اتنی اچھی ڈرائیونگ کرتے ہیں کہ لگتا ہے گاڑی بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہے۔ اس تقریب حمید میں ہمیں بھی تقریر کرنا تھی۔ گاندھی جی نے کہا ہے خاموشی بہترین تقریر ہے، اس لیے ہم اس وقت اکثر خاموش ہوتے ہیں جب تقریر کر رہے ہیں۔ تقریب میں ہم نے بتایا کہ جوش صاحب کافی بڑے شاعر ہیں، ہماری باتوں پر سب کو یقین آ رہا تھا صرف ایک بندے کو یقین نہیں آ رہا تھا وہ جوش صاحب خود تھے۔ ہمارے اکثر شاعروں کی گہرائی، جوش صاحب کی موٹائی اور چوڑائی سے زیادہ نہیں۔ وہاں ہم نے جو تقریر کی اس کا ترجمہ دادا خان نوری کر رہے تھے۔ ہم سنجیدہ بات کرتے وہ ایسا ترجمہ کرتے کہ لوگ ہنسنے لگتے۔ ہم نے مزاحیہ بات کی تو انہوں نے ایسا ترجمہ کیا کہ لوگ سنجیدہ ہو گئے۔ ہم نے حمید غلام کی تقریب پر کہا ان کی سترہویں سالگرہ پر دل چاہتا ہے ان کی سوویں سالگرہ پر بھی شرکت کریں۔ ہم نے ایک لمبا سا لطیفہ سنایا۔ دادا خان نوری نے ایک جملے میں اس کا پتہ نہیں کیا ترجمہ کیا کہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ہم نے بعد میں پوچھا ''دادا خان آپ نے ہمارے طویل لطیفے کا ایک جملے میں کیا ترجمہ کیا تھا'' بولے میں نے کہا ''معزز

مہمان نے لطیفہ سنایا ہے ہنسیں‘‘۔

محبت کا ٹمپریچر

جاپانی کہاوت ہے محبت ایسا لفظ ہے جو سردیوں میں تین مہینے گرم رکھ سکتا ہے۔ ویسے تو منٹو کے افسانے پڑھ کر بھی سردیاں گرم ہو سکتی ہیں۔ حمید غلام کی شاعری محبت کی شاعر ہے۔ تقریب میں چھوٹے چھوٹے بچوں نے جو نظمیں سنائیں ان کا مفہوم یہ تھا کہ بابا آپ نے بڑوں کے لیے محبت کی شاعری کی، چھوٹی کی محبت پر بھی شاعری کریں اور ساتھ دعا دی کہ آپ سو سال کے ہو جائیں شاید یہ انہوں نے اس لیے کہا ہو کہ جب تک وہ بچے نہ بنیں گے بچوں کی محبت پر کیسے لکھیں گے؟ تقریب میں حمید غلام کے ڈراموں کے مشہور کردار آ کر اپنے خالق کی تعریف کرتے رہے۔ ڈرامے کا ایک حصہ بھی دکھایا گیا ہیروئن کہتی ہے ’’آپ کو ذرا میرا خیال نہیں۔ دیکھتے نہیں انجیلا کا خاوند اس سے کتنی محبت کرتا رہتا ہے۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے؟ اس کا خاوند جواب دیتا ہے کر تو میں بھی ایسا سکتا ہوں پر انجیلا کو تو راضی ہونا چاہیے۔‘‘

شاہ و گدھا

تقریب میں ایک دانشور نے کہا ’’کلچر کی دنیا میں شاہ و گدھا سب ایک ہوتے ہیں۔‘‘ ہمارے خیال میں تو کلچر کی دنیا میں شاہ ہوتا ہے یا گدھا۔ البتہ جہالت بھی

وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے۔حمید غلام نے بتایا ان کی شادی کو 55 سال ہو گئے۔ہم نے کہا ''یہ تو بڑا لمبا عرصہ ہے ایک شخص کے ساتھ رہنے کے لیے۔'' بولے یہ نہ ہوتی تو اس کے بغیر یہ عرصہ اور لمبا ہوتا۔'' انہوں نے بتایا کہ میری بیوی اتنی بہادر ہے کہ اس نے میری ساری کتابیں پڑھی ہیں۔میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ میں رائٹر ہوں اور اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ میری بیوی رائٹر نہیں ہے۔انہوں نے بتایا گھر وہ جگہ ہے جہاں کھلے دل سے بندہ ہنس سکتا ہے۔بشرطیکہ گھر اپنا نہ ہو۔ہمیں یہ حیرت ہوئی کہ وہاں اکثر بڑے ادیبوں کے نام کے ساتھ غلام لگتا ہے جیسے غفور غلام وغیرہ۔ہم نے انہیں بتایا کہ اب آپ آزاد ہو چکے ہیں۔غفور غلام لکھتے ہیں یتیم کے بہت سے باپ ہوتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں اشارہ تھا کہ بیوہ کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔ہم نے کہا آپ رائٹروں کی ایک بات ہمیں اچھی نہیں لگی آپ سب بوڑھے ہیں؟بولے میں تو اتنا بزی ہوں کہ میرے پاس آئندہ دس پندرہ سال تک بالکل بوڑھا ہونے کے لیے وقت نہیں۔تاشقند ادیبوں کے لیے لاہور ہے۔غفور غلام لکھتے ہیں چڑیا تک جس نے تاشقند کے دانے چگے ہوں خود جنت سے اڑ کر تاشقند واپس آ جاتی ہے۔ایک بوڑھے ادیب سے ہم نے پوچھا ''34 سال آپ کی شادی کو ہو گئے۔تب سے آپ دونوں میاں بیوی جاب بھی کرتے ہیں اس طویل خوش گوار ازدواجی زندگی کا راز کیا ہے؟'' کہا ''وہ دن کو کام پر جاتی ہے اور میری رات کو ڈیوٹی ہے۔''

دل خراج

رقص اعضاء کی شاعری ہے جتنے پائے اعلیٰ اتنی یہ شاعری اعلیٰ پائے کی ،خوشی کے موقع پر یہاں جو رقص پیش کرتے ہیں اسے دل خراج کہتے ہیں۔ان لوگوں کا اتنا اچھا ڈانس دیکھ کر ہم نے پوچھا ''آپ کے مشہور ڈانس ڈائریکٹر کون کون گزرے ہیں'' کہا ''سٹالن سے برژنیف تک ہر کوئی نچانے میں ماہر تھا۔'' کھانے کے لیے ان کے اچھے ہوٹل میں گئے وہاں مینو کارڈ میں رقص بھی شامل تھا تا کہ آنکھوں کو بھی فوڈ ملے۔وہاں پیانو بجانے والے نے کہا میں پہلے یہاں وائلن بجاتا تھا اور لوگ میری ہر نوٹ پر میری طرف نوٹ اچھالتے۔پوچھا ''پھر آپ نے وائلن بجانا بند کیوں کر دیا؟'' کہا ''جس کے پاس نوٹ نہ ہوتے وہ بیئر کا گلاس اچھال دیتا''۔ایک ہوٹل میں ہمیں پتہ چلا کہ ڈانسر آ کر اپنا لباس اتا دیتی ہے وہاں تین ڈانسرز آئیں دیر تک ڈانس کرتی رہیں مگر کسی نے وہاں آ کر لباس نہ اتارا۔جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کے پاس اتارنے کے لیے لباس ہی نہیں تھا۔ ہم نے ان کو پیسے دیئے تو ساتھی بولا ''آپ تو پانی پی رہے ہیں پھر یہ حرکت کیوں کی؟'' عرض کیا ''ہم نے انہیں کپڑوں کے لیے پیسے دیئے ہیں''۔

ٹپ ٹاپ

ہوٹل تاشقند کے نیچے کیفے ٹیریا سے ہم جب بھی کھانا کھا کر نکلتے تو دروازے پر بیٹھا دربان اپنے حقہ نما برتن سے ہم پر خوشبو چھڑکتا اور پھر اس کے پیسے مانگتا۔ خوشبو ایسی تھی کہ اگلے ہی روز ہمیں پوچھنا پڑا کہ آپ خوشبو نہ چھڑکنے کے کتنے

پیسے لیں گے۔ ہوٹل میں پاکستانیوں کے لیے کمرے ایسے تھے کہ ان کو وہاں اجنبیت کا احساس نہ وہ گھر کا ماحول لگے۔ پوچھا اس کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟ کہا اس کے ہم یہ کرتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کرتے۔ عرض کیا ہمیں سمجھ نہیں آئی۔ کہا آسان ہے کمرے کی ایک ہفتہ صفائی نہ کریں کمرہ پاکستانیوں کے لیے تیار۔ ہم دوپہر کو کھانے کے ضرور سوتے ہیں پہلے دن ہم بستر پر لیٹے ہی تھے کہ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک بندہ نشے میں لڑکھڑا رہا تھا۔ ہم نے کہا۔ دیکھ نہیں رہے تم غلط کمرے میں گھس رہے ہو۔ وہ بولا ''میں غلط کمرے میں نہیں گھس رہا۔ تم غلط دروازے سے باہر آئے ہو۔''

موسم گردا

تاشقند میں جو سب سے دلچسپ چیز ہم نے دیکھی وہ تھے پاکستانی ٹورسٹ۔ وہاں سردیوں کے موسم میں آ کر بندہ سوچتا ہے کہ مقامی لوگ یہاں کیوں رہتے ہیں؟ اور گرمیوں کے موسم میں پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ یہاں کیوں رہتے ہیں! شہر اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیے کہ بندے کو شہر سے نکلنے میں کئی دن لگ جائیں۔ تاشقند شہر کو آتی تو ہم نے بے شمار سڑکیں دیکھیں مگر وہاں سے جاتی سڑک نظر نہ آئی ایسے ہی جیسے ہم لاہور سے جانا چاہتے مگر دس سال ہو گئے یہاں کی کوئی سڑک باہر لے جاتی ہی نہیں۔ لاہور میں پہلے موسم گرما پھر موسم سرما اب دونوں ملا کر موسم گردا بن گیا ہے۔ لیکن تاشقند میں آپ کو گرد ملے گی نہ آوارہ گرد۔ وہاں مہینوں جوتے

پالش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہاں موچی پتہ نہیں کیا کام کرتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں ایسا لڑکیاں ہیں کہ ان کا سوچو تو نیند آنے لگتی ہے۔ وہاں سوچو تو وہ آنے لگتی ہے۔ البتہ ہوٹل کے سرہانوں میں مرغیوں کے پر بھرے تھے۔ جو اتنے نرم تھے کہ فوراً نیند آ جاتی۔ جوش صاحب نے ایک دن کہا کہ مجھے سرہانے کی وجہ سے نیند نہیں آتی اس دن ہمیں پتہ چلا کہ کچھ سرہانوں میں مرغوں کے پر بھی بھرے ہیں۔

گُم سم

تاشقند میں دو بڑی مارکیٹیں ہیں گم اور سم۔ جہاں بیوی کے ساتھ والا کئی دن گم سم رہتا ہے۔ ہم نے سم جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ کھل جا سم سم کہنے سے پہلے ہی کھل جاتا ہے۔ ٹرام بیٹھے۔ یہاں مسافر اترتے وقت کرایہ دیتے ہیں ہمارے ہاں چڑھتے ہی لے لیتے ہیں شاید اس لیے کہ ہمارے ہاں کوئی پتہ نہیں مسافر منزل تک زندہ سلامت پہنچتا بھی ہے یا نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ٹکٹ ہی نا قابل انتقال ہوتے ہیں۔ آج وہاں اللہ اور ڈالر سب سے بڑا ہے۔ سوم وہاں کی کرنسی ہے۔ گورا صاحب نے چار سو ڈالر تڑوائے اتنے سوم مل گئے کہ وہ ڈر رہے تھے اگر میں ہزار ڈالر تڑوا لیتا تو مجھے سوم اٹھانے کے مزدور کی ضرورت پڑتی۔ بٹوے میں جتنے پیسے آتے ہیں اتنے میں وہاں بٹوہ نہیں آتا۔ سوم کا سوئم ہونے والا ہے۔ وہ اتنا سستا ہے کہ ایک سوم کی اتنی ہی قیمت ہے جتنی سادہ کاغذ پر سوم پرنٹنگ کرنے پر آتی ہے۔ بازار میں لوگ چیزیں خریدتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ گھر لاتے لاتے ان کا بھاؤ بدل جاتا ہے۔ وہاں ایسی بے چینی ہے کہ ایک شخص سے پوچھا ”آپ کو پتہ ہے تین چار سال بعد آپ کا مستقبل کیا ہوگا؟ کہا مستقبل کا کیا پتہ! ہمیں تو یہ پتہ نہیں تین چار سال بعد ہمارا ماضی کیا ہوں گا؟“ اڈولف ہٹلر کے آخری دور میں لوگوں کو اپنے کاروبار میں نقصانات اٹھانے پڑتے تو ایک لطیفہ اکثر محفلوں میں سنایا جاتا۔ وہ یہ تھا کہ ایک جرمن شہری کو برلن کی عدالت نے کسی جرم میں سزا سناتے ہوئے یہ حکم دیا ”اسے دو دکانیں الاٹ کر دی جائیں۔“

بازار باتیں

یہاں بچوں کے لیے دکانیں ہیں یا بڑوں کے لیے۔ مرد عورت میں کوئی تخصیص نہیں البتہ یہ ہے جو کم محنتی اور کاہل ہو اسے مرد کہتے ہیں۔ قیمتیں اور آبادی ہوتی بڑھنے کے لیے ہے یہاں ہر چیز مہنگی ہے۔ یہاں تک کہ تنخواہ تک بڑی مہنگی ہے۔ گاہک کو یہاں بھی کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔ ڈاکٹر اسے مریض، ہوٹل والے مہمان، وکیل اسے موکل، ٹیچر اسے سٹوڈنٹ، ایئر لائن والے مسافر، سیاست دان اسے ووٹر اور عورتیں اسے فرینڈ کہتی ہیں۔ وہاں دکاندار ہی دکاندار ہیں خریدتا کون ہے پتہ نہیں؟ ہر شخص کچھ نہ کچھ بیچ رہا ہے۔ ایک محلے سے خرید کر دوسرے محلے لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ اس لیے جب ہم کسی بندے کو خاتون کے ساتھ دوسرے محلے جاتے دیکھتے ہیں تو ہمیں وسوسے گھیر لیتے۔ ہم نے وہاں جوتے دیکھے مگر کوئی جوتی دل کو نہ لگی ایک لگی مگر پاؤں کو ہی لگی۔ کپڑوں کی دکان پر سیلز گرل نے جو لباس پہن رکھا تھا اس سے تو لگتا تھا کہ اسے خود کپڑے خریدنے چاہئیں مگر لباس، پہننے والیوں سے بھی کئی ڈالر مہنگے تھے۔ قیمتیں فکس ہیں جنھوں نے ازبکوں کو فکس کر رکھا ہے۔ دکانداروں سے بات کرنے کی ضرورت نہیں صرف وہی بات کرتے ہیں جنھوں نے کچھ نہ خریدنا ہو۔ وہاں کے لباس کی کوالٹی ایسی ہے کہ مجبوری میں ہی پہنے جاتے ہیں۔ اتارے تو پہلے ہی مجبوری میں جاتے ہیں۔ ایک دن ہمارے ساتھی نے پوچھا۔ ’’ہوا مذکر ہے یا مونث‘‘۔ ہم نے کہا ’’مونث۔‘‘ تو بولے ’’میں نہیں مانتا ہوا سامنے والی لڑکی کی سکرٹ کے ساتھ جو

کچھ کر رہی ہے یہ کسی مذکر کی حرکت ہی ہو سکتی ہے۔"

گم

گم تاشقند کی وہ مارکیٹ ہے جہاں پہلے آنے والے گم ہو جاتے تھے۔ اب تو یہ خود گم ہو رہی ہے۔ یہ تو شکر ہے سٹالوں پر سیلز گرلز ہوتی ہیں ورنہ بندہ کس کا بھاؤ تاؤ کرتا۔ گم کے سامنے جوش صاحب نے پانی دیکھ کر اسے پینا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پیاس لگی ہے اس لیے پی رہا ہوں کہ کہہ سکوں میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔" ہم نے پوچھا "گم حکومت کے کنٹرول میں ہے یا نجی سیکٹر کے کنٹرول میں ہے؟ جواب ملا "ڈالر کے کنٹرول میں ہے۔" لڑکیاں روسی ہوں یا ازبک ان کا پسندیدہ نام مسٹر ڈالر ہی ہے۔ سب لوگ حیران پھر رہے تھے جیسے انہوں نے عبدالعزیز خالد کے شعر سن لیے ہیں۔ ہمارے ہاں کے دکاندار ان سے زیادہ سچے ہیں۔ لاہور میں ہم نے خود دیکھا ایک نقلی مال بنانے والی دکان پر یہ بورڈ لگا تھا "نقالوں سے ہوشیار رہیں۔"

ملا نصر الدین

انصار الدین صاحب کو اردو بھی آتی تھی اور لطیفے بھی۔ وہ پاکستان میں ازبک پڑھاتے رہے ہیں۔ ان کا گھر اتنا صاف تھا کہ ایسی صفائی تو کوئی چور ہی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کام چور نہ ہو۔ پوچھا اتنی صفائی سے تو لگتا ہے آپ سارا دن یہی

کرتے رہتے ہوں گے؟ کہا بالکل نہیں ہم صفائی نہیں کرتے۔ پوچھا پھر آپ کیا کرتے ہیں؟ کہا گندگی نہیں پھیلاتے، ہم نے کہا ہم نے تاشقند میں ناجائز تجاوازت نہیں دیکھیں، انہوں نے بتایا علی شیر نوائی نے خمسہ لکھا۔ ان کی پانچ داستانیں ہیں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، صد سکندری، حیرت الابرار اور پانچویں میں بھول گیا۔ ہم نے پوچھا۔ میں بھول گیا کس کے بارے میں ہے؟ انہوں نے گھر فون کیا تو بیوی نے بتایا پانچویں سب بھئی سیار ہے۔ ہمارے ادیب بھی اپنی بیوی سے لکھنے میں مدد لیتے ہیں۔ جو یہ ہوتی ہے کہ بیوی کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جاتی ہے۔ ہمارے ایک ادیب تو یہ تک پوچھنے کے لیے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں اپنی بیوی کو فون کرتے ہیں۔ انصار الدین کے ہاں ہم نے جلدی جلدی رات کا کھانا کھایا یعنی صرف تین گھنٹوں میں کھا لیا۔ ہم نے اپنے ایک عرب دوست کو بتایا ازبک اپنے مہمان کو کبھی خالی میز پر نہیں بٹھاتے، وہ بولا ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں خاتون ہو تو اسے خالی کرسی پر بھی نہیں بٹھاتے۔

مُشتم

مشتم کا مطلب ہے مٹھی۔ اس نام سے تاشقند سے طنز ومزاح کا ایسا ہفت روزہ نکلتا ہے جسے پڑھنے میں دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اس کے پہلے چیف ایڈیٹر عبداللہ قادری کو 1937ء میں قتل کر دیا گیا۔ اب مشتم کا دفتر بلند عمارت کی آخری منزل پر واقع ہے۔ رسالے کا چیف ایڈیٹر غلطی کرے تو اسے اوراوپر بھیج دیا جاتا

ہے۔ رائٹر قلم سے سانس لیتا ہے سو اگر کسی رائٹر کی سانس اکھڑنے لگے تو اس کے منہ سے آکسیجن لگانے کے بجائے اسے قلم دینا چاہیے۔ لیکن حکومت نے 70 سالہ مشتم کے کئی چیف ایڈیٹروں کی سانس روک دی۔ اس کی اشاعت 1970ء ...... 1980ء کے دوران چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ آج کل اس کے چیف ایڈیٹر وہاں کے عوامی ادیب اور ممتاز مزاح نگار نعمت امینوف ہیں۔ کاغذ کی وہاں اتنی قیمت ہے کہ آج کل سب سے قیمتی ادب ازبکستان میں لکھا جا رہا ہے۔ رائٹر کو خود اپنا ایک جملہ کئی سوم میں پڑتا ہے۔ مشتم میں ادیبوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے کارٹون بھی ہوتے ہیں لیکن وہ احتیاطاً لکھ دیتے کہ ان میں سے ادیبوں کی تصویریں کونسی ہیں۔

یوسفانے

ہمیں تاشقند کی جو نعمتیں بھائیں ان میں ایک نعمت امینوف بھی تھے۔ شخصیت ایسی کہ مزاح نہ بھی لکھتے تب بھی لوگ انہیں مل کر ہنستے۔ دوائیاں وہاں میڈیکل سٹوروں پر نہیں ملتیں۔ وہاں ڈپریشن کی دوائی نہیں ملتی، لیکن یہ خبر پہلے کی تھی۔ اب وہاں یہ دوائی ملتی ہے، مشتم کے چیف ایڈیٹر کی کرسی پر۔ نعمت امینوف کہتے ہیں۔ طنز کی روٹی بڑی سخت ہوتی ہے اسے کھانے کے لیے لوہے کے دانت چاہئیں۔ وہاں ادیب کے لیے سب سے بڑا حکومتی اعزاز ''عوامی ادیب'' ہے۔ نعمت امینوف وہ مزاح نگار ہیں جنہیں یہ درجہ ملا۔ ہمارے ہاں تو مزاح نگاروں کو

شادیوں پر بلاتے ہیں۔ایک مرتبہ اسلامی جمعیت طلبہ نے کئی سنجیدہ ادیبوں کے ساتھ ہمیں ایک تقریب میں بلایا۔ہم خوش ہوئے کہ ہمیں کسی نے تو سنجیدگی سے لیا۔ ہماری باری آئی تو اناؤنسمنٹ ہوئی کہ اب ڈاکٹر یونس بٹ اپنا پروگرام پیش کریں گے ۔نعمت امینوف کی وہاں جتنی عزت ہے ہمارے ہاں اتنی عزت اسی صورت میں مل سکتی تھی۔ اگر وہ ادیب نہ ہوتے ۔ہم نے انہیں اپنی کتابیں پیش کیں تو تصویر دیکھ کر کہنے لگے آپ کا نام یوسف ہونا چاہیے تھا۔پھر بولے ''اللہ نے آپ کی شکل آپ کی تصویر دیکھ کر بنائی ہے مبارک ہو''۔

غیر زنانہ کام

نعمت امینوف کی موجودگی میں ڈاکٹر گورا صاحب نے کہا کہ طنز و مزاح غیر زنانہ صنف سخن ہے۔وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ظاہر ہے انہوں نے یہ بات طبی معائنے کے بعد ہی کہی ہوگی لیکن ہمیں لگتا ہے وہ عورتوں کی سنجیدہ تحریریں نہیں پڑھتے ۔ورنہ یہ نہ کہتے کہ عورتیں مزاح نہیں لکھتیں۔ حالانکہ عورتیں اس میدان میں مرد سے اتنا آگے ہیں کہ ہم نے ہر جگہ مردان کے پیچھے ہی دیکھے۔ ہمارے کیلنڈر میں ابھی دسواں مہینہ ہوتا ہے ان سے کہو تو شرما کر کہتی ہیں پہلا مہینہ لگ بھی گیا، خواتین میں یہ بڑی ہے کہ وہ ہمیشہ وہ کام نہیں کرتیں جس پر انہیں عبور ہوتا ہے ۔جیسے ان سے اچھا نقاد کون ہو سکتا ہے۔مگر اردو تنقید میں گنج گراں مایہ سب مرد ہی ہیں۔ایک ادبی تقریب میں ہم نے ایک خاتون کو افسانے پر تنقید کرتے سنا

وہ بولیں ''یہ کہانی مجھے آج کی نہیں لگتی، کیونکہ کہانی میں ہیروئن نے جو کپڑے پہنے ہیں وہ پرانے فیشن کے ہیں۔''نعمت امینوف نے کہا واقعی یہ سوچنے والی بات ہے کہ عورتیں مزاح کیوں نہیں لکھتیں۔ گورا صاحب نے کہا اس پر سنجیدہ بحث ہونی چاہیے۔ امینوف صاحب نے کہا اس پر سنجیدہ بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ اس مسئلے کا تعلق مزاح سے ہے۔''بہر حال انہوں نے کہا عورت کا مزاح اس کا ناز نخرہ ہی ہے یہ ان کا سوچنے کا انداز ہے جیسے وہ ایک پول کی اونچائی معلوم کرنا چاہتے تھے پاس سے ایک سنجیدہ ادیب گزرے پوچھا۔ کیا کر رہے ہو؟ بولے میں جاننا چاہتا ہوں یہ پول کتنا بلند ہے؟ اس نے کہا یہ کون سا مشکل ہے اور پول کو لٹا کر فیتے سے ماپ کر بتا دیا۔ یہ ٹھیک 24 فٹ ہے۔ پھر پول کر اسی طرح لگا دیا تو نعمت امینوف بولے۔ ہیں ناں آپ پروفیسر میں نے پول کی بلندی جاننے کے لیے کہا تھا آپ مجھے اس کی لمبائی بتا رہے ہیں۔

SENSE OFF HUMOUR

کہتے ہیں مزاح کو سمجھنے کی حس ان عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ جن کے دانت خوب صورت ہوتے ہیں بہ نسبت ان کے جن کے دانت خوبصورت نہیں ہوتے۔ لیکن وہ طنز و مزاح میں اس لیے نہیں آتیں کہ وہ جس کے ساتھ شگفتہ بات کرتی ہیں فوراً سنجیدہ ہونے کی کرتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود ان کا مزاح پر بڑا احسان ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے عورت نکال دی جائے تو کیا بچے گا؟

کہا:عورت بچے گی۔ خواتین کا طنز و مزاح سے اتنا کم واسطہ ہے کہ ان کا تو سراپا لکھا جائے تو اسے خاکہ نہیں غزل کہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا میری جس خاتون سے منگنی ہوئی تھی اس میں بڑی حس مزاح تھی مگر میں نے اس سے جان چھڑا لی۔ پوچھا ''کیسے؟'' بولے شادی کر کے ویسے خاوند تو بیوی کو مزاح نگار ہی سمجھتا ہے اس کی بات سنجیدگی سے نہیں لیتا اور کوئی مزاح نگار کسی محفل میں سنجیدہ گفتگو کرے تو سننے والے سمجھتے ہیں اس نے چڑھا رکھی ہے۔ مزاح کی تعریف کئی نقادوں نے کرنے کی کوشش کی مگر مکمل تعریف آج تک ہم نے نہیں پڑھی سو ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ مزاح کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوتی ہے۔ پطرس بخاری تو کہا کرتے تھے مزاح کی وضاحت کرنے کی مقابلے میں مزاح تخلیق کرنا زیادہ آسان ہے۔ حالی نے ہماری شاعری پڑھ کر کہا تھا لگتا ہے ہمارے سب شاعر، ایک ہی روز، ایک ہی شہر میں پیدا ہوئے۔ ایک جیسے حالات سے دوچار رہے، ایک ہی محبوبہ سے محبت کی اور سب نے ایک ہی روز وفات پائی۔ البتہ ہمارے مزاح نگار ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنی ان کی شکلیں۔ ضمیر جعفری صاحب اتنے وسیع و عریض ہیں کہ لگتا ہے بندہ انہیں نہیں دیکھ ان کا کام دیکھ رہا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے ہاں یونیفارم ہیومر ہے اور کرنل محمد خاں کے ہاں ہیومر ان یونیفارم ہے۔ جدید مزاح کے جو نادر نمونے ہیں ان میں اکثر نمونے سیاست میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

''کوک والا''

کوک دلا از بک میں ہرے کھیت کو کہتے ہیں۔ یہ اس انعام کا نام ہے جو مزاح نگاروں کو دیا جاتا ہے۔ مشتم کے زیر اہتمام اس سال پہلے نمبر پر آنے والے مزاح نگار کو پانچ ہزار روبل اور ایک مینڈھا انعام دیا جاتا ہے۔ مزاح نگار اس مینڈھے کے ساتھ تصویر کھنچواتے ہیں جو اخبارات میں چھپتی ہے۔ اکثر مینڈھا اتنا صحت مند ہوتا ہے کہ لگتا ہے مینڈھے کو انعام میں مزاح نگار ملا ہے۔ دوم آنے والے کو تین ہزار روبل اور ایک مادہ بھیڑ دی جاتی ہے۔ بھیڑ میں ایک ہی خوبی ہوتی ہے۔ کہ یہ مادہ ہوتی ہے اور ادیب زیادہ تر ''مادہ'' پرست ہوتے ہیں۔ بھیڑ کے چلن سے زیادہ اس کی چال مشہور ہے۔ تیسرے کو ڈیڑھ ہزار روبل اور ایک بکرا دیا جاتا ہے۔ چوتھے کو ایک ہزار روبل اور ایک مرغا ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد آنے والے کو مرغا بنایا جاتا ہے۔ اس تقریب میں پندرہ ہزار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ مینڈھے، بھیڑ، بکرے اور مرغ کو کون کون سا مزاح نگار ملتا ہے۔

ہمارے مشہور بھانڈ منیر احمد کے پر دادا کو رنجیت سنگھ نے خوش ہو کر ہاتھی دے دیا۔ وہ سارا دن ہاتھی کی خوراک اکٹھی کرنے میں لگا رہتا۔ آخر تنگ آ کر اس نے ڈھول ہاتھی کے گلے میں باندھ کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ جب کان ہلاتا تو ڈھول بجتا۔ راجہ نے وجہ پوچھی تو بولا ہم نے اسے کہا ہے خود ہی کما اور خود ہی کھا۔

مشتمیات

مشتم سے چند نثر پارے آپ کو بھی پڑھاتے چلیں۔ ایک دفعہ میخائل

گورباچوف ایک میٹنگ سے لیٹ ہو گئے تو اپنے شوفر سے کہا۔ جلدی کرو، شوفر نے کہا، اگر میں گاڑی تیز چلاؤں گا تو قانون کی خلاف ورزی ہو گی۔ تیز رفتاری کے لیے قانون جو ہے۔ سو گورباچوف نے اسے حکم دیا تم پچھلی سیٹ پر بیٹھو اور خود سٹیرنگ سنبھال لیا۔ چند میل ہی گئے تھے کہ گشتی پولیس نے دھر لیا۔ سنئیر آفیسر نے اپنے ماتحت کو بھیجا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پکڑ کر لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پولیس والا واپس آ گیا اور کہا کہ گاڑی والا اتنی اہم شخصیت ہے کہ اس کا چالان نہیں ہو سکتا۔ پولیس چیف نے پوچھا وہ کون ہے؟ کہا اس کا تو مجھے پکا پتہ نہیں لیکن کامریڈ گورباچوف اس کے شوفر ہیں۔"

☆☆☆

دو بزنس مین اپنے مسئلے ڈسکس کر رہے تھے۔ ایک بولا آج کل اتنا مندا ہے کہ جولائی میں پچھلے سات سالوں کی سب سے کم سیل رہی، اگست جولائی سے بدتر رہا اور ستمبر تو ستمگر نکلا۔ دوسرا بزنس مین بولا "تم سمجھتے ہو صرف تم ہی تکلیف میں ہو۔ میں نے اپنی بیوی کو تاشقند میں گھر لے کر دیا۔ پھر نیا فرنیچر، نئی گاڑی بمع شوفر لے کر دی۔ ایک ماہ ماسکو رہنے کے بعد واپس آیا تو میں نے دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا۔ گاڑی میں خراب تھی بیوی کہہ رہی تھی۔ شوفر تنخواہ لیتا ہے اسے کچھ تو کام کرنا چاہیے، اس سے زیادہ برے حالات بھی ہو سکتے ہیں۔"

دوسرا بولا "ہاں ہو سکتے ہیں اکتوبر آ رہا ہے۔"

☆☆☆

پہلی سالگرہ پر میں نے اپنی بیوی سے کہا اگر میں مر گیا اور تمہیں پھر شادی کرنا پڑی تو کیا تم اسی گھر میں رہو گی جہاں ہم دونوں رہتے ہیں؟ بولی ہاں کیونکہ اس کی قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ پوچھا تم اسے یہ کار بھی استعمال کرنے دو گی؟ بولی ہاں اس کی قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ پوچھا کیا تم اسے میرے کپڑے بھی پہننے کے لیے دو گی؟ کہا نہیں۔ خاوند نے خوش ہو کر پوچھا کیوں؟ بولی تمہارے کپڑے اسے تنگ ہیں۔

☆☆☆

ایک ستر سالہ روسی ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس نے کہا میں نے پچھلے دنوں 26 سالہ قذاق لڑکی سے شادی کی ہے لیکن ہر رات جونہی میں بستر پر قدم رکھتا ہوں مجھے نیند آ جاتی ہے۔ کوئی دوا تجویز کر دیں۔ ڈاکٹر نے اسے نسخہ لکھ کر دیا۔ روسی نے بڑی خوشی سے ڈاکٹر کو دیکھا اور کہا ''کیا میں بھی......''

''نہیں'' ڈاکٹر نے کہا۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ کر سکتا ہوں کہ وہ بھی سو جایا کرے گی۔

☆☆☆

مسکراہٹ

وہاں کے مزاح کی حالت مزاح نگاروں کی حالت سے ہمیشہ بہتر رہی۔ حالانکہ کہتے ہیں جو کمیونسٹ ہنستا ہے وہ کمیونسٹ نہیں رہتا۔ لیکن وہاں کے مزاح نگار ہنستے رہے بیشتر اپنے آپ پر ہنستے رہے۔ ایک مزاح نگار نے کہا ''کے جی بی والے پکڑ لیں تو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس دن کام نہیں کرنا پڑتا۔'' وہاں کا مشہور کامیڈین ایوگنی پیتروسیاں کہتا ہے۔'' مجھے اپنے آئین کی شق 206 پسند نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے جیل جانا پڑا۔ میں نے گھر کی دیوار پر ایک قابل اعتراض لفظ لکھا جو تین حرفوں پر مشتمل تھا سو مجھے تین سال جیل ہوئی مگر یہ فائدہ ہوا کہ اسے مٹانے کے بہانے میری دیوار پر رنگ کرا دیا گیا۔'' ایک مزاح نگار لکھتا ہے۔ ہمارے ہاں جگہ جگہ لکھا ہوتا ہے۔ یہ مت کرو وہ مت کرو۔ اس لیے جب میری شادی ہوئی تو میں نے بستر عروسی پر جاتے وقت ادھر اُدھر اچھی طرح دیکھ لیا کہ کہیں یہ تو نہیں لکھا۔''

ہا ہی ہو، ہاہا

ایک صاحب نے پوچھا ''آپ نے وہاں کی موسیقی سنی؟'' ہم نے کہا ''ہاں ہم نے لڑکیوں کو ہنستے سنا''۔ اب تو جدید تحقیق بتا رہی ہے کہ موسیقی کی NOTES کی طرح ہنسی کی بھی نوٹس ہوتی ہے جیسے سا، رے، گاما، پا اسی طرح ہا ہی ہو ہاہا کی بھی نوٹس ہیں۔ البتہ قہقہہ سننا ایسے ہی ہے جیسے پاپ میوزک سننا۔

جیسے غم میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ بولتا نہیں ایسے ہی پاپ میوزک میں یہ خوبی ہے کہ اس کی آواز کے ہوتے ہوئے آپ کو اردگرد کی ٹریفک یا لاؤڈ سپیکروں کا شور ڈسٹرب نہیں کرتا۔ زندگی جتنی مشکل ہوتی ہے اس میں اتنے ہی زیادہ لطیفے ہوتے ہیں۔ لطیفوں کے مصنف عوام ہوتے ہیں۔ کامیڈین تو وہ ہوتا ہے جو پرانے لطیفے تخلیق کرتا ہے۔ لطیفہ زندگی کا عکس ہوتا ہے تمام اصناف زمانہ زندگی کے آگے ہاتھ کھڑے کر دیتی ہیں مگر مزاح نہیں کرتا۔ قوم کا ہیومر قوم کا ہیرو ہوتا ہے۔ کھلے معاشرے میں جرنلزم ترقی کرتا ہے اور پابندی اور گھٹن کی فضا میں ادب اور مزاح۔

NOT A LAUGHING MATTER

1991ء سے پہلے ہم روس کو ان لطیفوں کے حوالے سے جانتے تھے جو امریکہ نے اس کے بارے میں مشہور کر رکھے تھے۔ کہتے ہیں ان میں ایک دو ہی لطیفے تھے باقی سچے واقعات تھے۔ لطیفے ہمیشہ ڈکیٹڑوں کے دور میں پروان چڑھتے ہیں، اسی لیے آج بھی ضیاء الحق دور کے کئی لطیفے اونچی پوسٹوں پر فائز ہیں۔ لیکن آپ پوچھیں گے پھر امرتسر میں اتنے لطیفے کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ حالانہ اس کی وجہ وہاں محکمہ منصوبہ بندی کا مؤثر نہ ہونا ہے۔ روس نے ثابت کیا کہ آج کے دور میں کسی ملک کی حفاظت اس کے لشکر نہیں کرسکتے۔ اب ملک اپنے لشکروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ دنیا کی سپر پاور کو امریکیوں نے چٹکلوں اور لطیفوں سے توڑ دیا کیونکہ

روسیوں کے پاس ان لطیفوں کا توڑ نہ تھا۔ اسّی کی دہائی کے کچھ مشہور لطیفے درج ہیں۔

☆

مالوتوف بھاگم بھاگ سٹالن کے پاس گیا۔ ''کامریڈ ابھی ابھی تصدیق ہوئی ہے۔ کہ آدم و حوا روسی تھے۔'' ''کوئی ٹھوس ثبوت؟ ورنہ وائس آف امریکہ اسے روسی پراپیگنڈہ سمجھے گا۔''

سٹالن نے پوچھا۔ مالوتوف نے جواب دیا۔ کامریڈ ان کے پاس پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ وہ صرف سیب کھاتے تھے، رہنے کو ذاتی گھر نہیں تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ جنت میں رہتے ہیں۔ اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا ان کے روسی ہونے کا۔

سٹالن نے ماسکو کا چکر لگایا کہ میرے بعد یہ تو بہت آزاد ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا رہا تو کمیونزم کو خطرہ ہے۔ یہاں دوبارہ ڈسپلن قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کریملن گیا تو پولیٹیکل بیورو کے ممبران نے سٹالن کو اٹھ کر جگہ دی۔ سٹالن نے اپنا مخصوص پینے والا پائپ نکالا اور بولا ''پہلے ہمیں صوبائی نمائندوں کو ماردینا چاہیے اور پھر موزولینی (جہاں لینن کی ممی ہے) کو سبز رنگ کرنا چاہیے؟ ایک سرکردہ لیڈر کھڑا ہوا اور کہا ''کامریڈ سٹالن سبز رنگ کیوں؟'' سٹالن نے کہا ''مجھے پتہ تھا پہلے حصے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

☆

برژنیف ایک دن ریڈ سکوائر میں سیر کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا سورج کو سلام کروں۔ اس نے سلام کیا تو سورج نے جواب دیا ''آپ کی عنایت ہے، کامریڈ'' برژنیف بہت حیران ہوا کریملن جا کر اس نے اپنے پولیٹیکل بیورو کے ممبران کو بتایا وہ سارا دن اس پر بحث کرتے رہے اور شام کو یہ حیرت انگیز منظر دوبارہ دیکھنے ریڈ سکوائر پہنچے۔ برژنیف نے اسی جگہ پر ہیٹ اتار کر سورج کو سلام کیا۔ تو سورج نے جواباً کہا ''بڈھے کوئی عقل کا کام بھی کر لیا کر'' برژنیف بڑا حیران ہوا، اس نے پوچھا ''اب تم ایسے کیوں بول رہے ہو، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' سورج نے کہا ''اب میں مغرب میں ہوں جو چاہے بول سکتا ہوں۔''

☆

چرنینکو جب فوت ہوا تو دوسری دنیا کے دروازے کے پاس برژنیف کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ چرنینکو نے پوچھا آپ کا حال کیسا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میں دوزخ میں ہوں۔ چرنینکو نے پوچھا 'دوزخ کیسا لگا؟' برژنیف نے کہا دو دوزخ ہیں۔ ایک سوشلسٹ دوزخ اور دوسرا ڈیموکریٹک دوزخ۔ البتہ میں سوشلسٹ دوزخ میں ہوں۔ اس لیے کہ سوشلسٹ دوزخ زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں کے جلادوں اور سزا دینے والوں نے پی رکھی ہوتی ہے۔ کام پر آتے ہی نہیں، آئیں بھی تو ان کے سزا دینے والے ہتھیار اور اوزار صحیح کام نہیں کرتے۔

☆

لڑکے نے سکول سے آ کر باپ سے کہا مجھے ایک روبل دیں۔ ہم سکول والے افریقی ممالک کے بھوکوں کے لیے پیسے اکٹھے کر رہے ہیں۔ باپ نے اخبار پڑھ کر بتایا بیٹا وہاں بھوکے نہیں ہیں۔ اگلے دن لڑکے نے پھر سکول سے آ کر کہا افریقی ممالک کے لیے پیسہ چاہیے۔ وہاں قحط سالی ہے ان کی مدد کے لیے ایک روبل دے دیں۔ باپ نے اخبار پڑھ کر کہا۔ ''بیٹا افریقہ کے ممالک میں قحط سالی نہیں ہو گی''۔ تیسرے دن بیٹے نے آ کر کہا۔ ابا مجھے افریقی ممالک کی کمیونسٹ پارٹی کی مدد کے لیے ایک روبل چاہیے۔ تو باپ نے جیب سے تین روبل نکال کر دیئے اور کہا ''اگر وہاں کمیونسٹ پارٹی ہے تو پھر وہاں بھوکے بھی ہوں گے اور قحط سالی بھی''۔

''نان'' سینس

ہم نے دادا خان سے پوچھا تاشقند کی آج کل مشہور چیز کیا ہے بولے ''آج کل میں بھی تاشقند میں ہی رہتا ہوں، ہاں البتہ یہاں چالیس قسم کے نان ملتے ہیں'' ہم ان کی ''نان'' سینس پر خوش ہوئے۔ حمید غلام کے ڈرامے ''آبادیات'' میں ایک ڈائیلاگ ہے کہ دنیا میں دو چیزیں مقدس ہیں نان اور چراغ۔ ایک اندر روشنی کرتا ہے دوسرا باہر۔ وہاں جو نان ملتے ہیں ان میں شیریں نان، مہمان نان، سوتلی نان، آبی نان، سادہ نان، روغنی نان، آئی لانان، گیرہ دہ نان، شیر مائی نان، پچتہ نان، پیازلی نان، خواجہ نان، طوئی نان مشہور ہیں۔ ہمیں تو نان سینس بھی

نانوں کی ایک قسم لگا۔ البتہ داداخان نے بتایا فرغانہ میں ڈیڑھ میٹر لمبی چھپکلیاں ملتی ہیں۔ وہ ان کی لمبائی یوں بتا رہے تھے کہ ہم نے پوچھا۔ آپ اتنی چھپکلیوں کا کیا کرتے ہیں؟ کہا ان کی لمبائی ماپتے ہیں۔ ازبک وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ گھنٹوں کھڑے وقت کی قدر کر رہے ہوتے ہیں۔ روسی مزاح نگار میخائل ذاولینستیکی کہتا ہے۔ ''جب ماسکو میں ایک گھنٹہ وقت تبدیل کیا گیا تو کیف والوں نے کہا ''ہم سے مشورہ نہیں کیا گیا'' سو ہم پرانے وقت پر ہی قائم رہیں گے۔'' سو لاکھوں لوگ ریلوے سٹیشنوں اور ایئر پورٹوں پر لائن میں ماسکو کے وقت کے حساب کھڑے ہوتے اور کیف کے وقت کے حساب سے روانہ ہوتے۔

تاکستان

تاشقند میں ہر پھل ملتا ہے یہاں تک کہ صبر کا پھل بھی مل جاتا ہے۔ مگر آم نہیں ملتے۔ آم میٹھے ہوں اور عام ہوں یہ تو عام بندہ بھی چاہتا ہے۔ علی سردار جعفری نے ایک بار کہا تھا ''روس میں سب کچھ ملتا ہے۔ مگر چوسنے کے لیے آم نہیں ملتے۔'' تو مجاز نے کہا ''کیا ہوا وہاں آم نہیں ملتے عوام تو ملتے ہیں''۔ وہاں ہر گھر پھل دار درختوں سے باغ باغ ہوتا ہے۔ لگتا ہے گھروں میں درخت اگائے نہیں گئے درختوں میں گھر اگائے گئے ہیں۔ جو فلیٹوں میں رہتے ہیں وہ سانس لینے کے لیے نیچے آتے رہتے ہیں۔ وہاں خاتون خانہ یہ بات فخر سے بتاتی ہے کہ اس نے کھانے کے لیے جو ڈشیں تیار کیں سب گھر کی چیزیں سے کیں۔ بازار

سے کھانے کا سامان منگوانا وہاں خاتون خانہ کی بے عزتی کرنا ہے۔گھر میں انگور اور اس کی بیٹی کی حکومت ہے وہ اسے تاک کہتے ہیں۔وہاں جا کر لگتا ہے بندہ پاکستان سے تاکستان میں آ گیا۔ وہ کہتے ہیں نوجوان لڑکی بیل کی طرح ہوتی ہے۔یعنی جو درخت قریب ہوا اس پر چڑھ جاتی ہے۔ ہر گھر میں خاتون خانہ کی پسند کے درخت ہوتے ہیں۔ایک ایسی خاتون نے نرسری میں جا کر کہا ''میں ایسا کچھ چاہتی ہوں جو زیادہ نہ پھیلے۔مگر سایہ دار ہو۔اس سے پتے بھی نہ گرتے رہیں بلکہ پتے کبھی نہ گریں اور سردیوں میں مجھے سورج بھی نظر آئے۔''نرسری کے ملازم نے کہا ''محترمہ آپ کو پودا نہیں چھتری چاہیے۔''

جوؤں کا بازار

مشتاق یوسفی تو جینز کو جوؤں کی نرسری کہتے ہیں۔تاشقند میں ان کا بازار ہے جسے بیت بازار کہتے ہیں۔اس میں کوئی چیز بھی فرسٹ ہینڈ نہیں ہوتی۔ دکانوں پر سیلز گرلز دیکھ کر ہمیں اس کا یقین بھی آ گیا۔ایک دکان پر کچھ نئی چیزیں نظر آئیں جو اس دکان سے پرانی چیزیں خرید رہی تھیں۔ یہ بازار ہمیں بے زار لگا۔ہم تو انٹیک بھی وہ خریدتے ہیں جو نئی ہو۔ یہاں ازبکوں کے رنگ اور روسیوں کے ڈھنگ دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں سٹالن کا کوٹ بڑا تاریخی تھا۔اس نے 25 سال ایک اوورکوٹ میں گزارے۔اسی کو پہنتا اور اسی کو اوڑھ کر سو رہتا۔اس زمانے میں نیا اوورکوٹ پہننا کمیونزم کی خلاف ورزی کرنا تھا۔ بیت بازار میں سیلز

گرل ایک لباس دکھا رہی تھی کہ اسے پہن کر بچی بھی چالیس سال کی لگنے لگتی ہے۔ ہم نے کہا اس لباس کو تو کوئی عورت نہ خریدتی ہو گی۔ بولی ساٹھ سال کی عورتیں اسے بڑے شوق سے خریدتی ہیں۔

من بھاتا خواجہ

ملانصرالدین ان کا من بھاتا خواجہ ہے کہتے ہیں یہ ترکی سے وسط ایشیا میں آیا، اسی لیے ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی دیتا۔ ملا نے دنیا کا ہر پیشہ اختیار کیا سوائے دنیا کے پہلے پیشے کے۔ کہتے ہیں خواجہ نے ایک بار کنجوس مہاجن جعفر کی جان بچائی تو اس نے اپنی جان بچانے کا اسے آدھا تنگہ دیا تو ملا نے یہ کہہ کر بخوشی قبول کرلیا کہ مجھے یہ لیتے ہوئے اس لیے برا نہیں لگ رہا کیونکہ تمہاری زندگی کی قیمت اس سے زیادہ نہیں۔ ملانصرالدین کا گدھا خرایشاء ہے۔ ازبک خوش مزاج قوم ہے وہ کہتے ہیں خوش مزاج بچھڑا دو ماؤں کا دودھ پیتا ہے۔ ملانصرالدین کے لطیفے کمیونزم کے دور میں بھی حالات پر بڑا طنز ہوتے۔ ایک بار ملانصرالدین نے ایک قیدی سے پوچھا تمہیں کتنی سزا ملی؟ کہا مجھے پانچ سال کی سزا ملی ہے پر میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟ ملانصرالدین نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے کوئی جرم نہ کیا ہوتا تو میری طرح دس سال سزا ہوتی۔

خرداد خان نوری

ملا نصر الدین کے گدھے کے بعد دادا خان نوری کا گدھا مشہور ہے۔ کہنے لگے میں اپنی کار کو گدھا کہتا ہوں۔ واقعی جب وہ کار پر بیٹھتے تو یہی لگتا ہے۔ ان کی کار میں ہمیں بڑی اپنائیت نظر آئی۔ اس میں مٹی کی تہ جمی دیکھ کر ہم دادا خان کے تہہ دل سے مشکور ہوتے کہ کار میں بیٹھتے ہی ہمیں لگتا ہم کار کے اندر نہیں اپنے ملک کے اندر ہیں۔ جب الیکسائی آئی سالفوسکائی کو ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کا ایک بین الاقوامی ایوارڈ ملا تو وہ حیران ہو گیا کہ اتنی رقم ملے گی جس سے مرسڈیز خریدی جا سکتی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ ایک ہجوم تیزی سے اس کی طرف آئے گا اور چھین لے جائے گا۔ سو اس نے اپنے پرانے سائیکل کا نام مرسڈیز رکھ کر کام چلایا۔ دادا خان نوری کی کار میں یہی خرابی ہے کہ یہ اس وقت اسٹارٹ ہو جاتی ہے جب آپ نے ڈیوٹی پر جانا ہو لیکن اس وقت اسٹارٹ نہیں ہوتی جب ڈیوٹی سے آنا ہوتا ہے۔ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہاں صرف زبان ہی چل سکتی ہے۔ لیکن دادا خان ایسی ڈرائیونگ کرتے کہ لگتا ہے جہاز بائی روڈ جا رہا ہے اور آتے ہوئے لگتا ہے کار بائی ایئر آ رہی ہے۔ ویسے وہ جس عمر میں دادا کہلوا رہے ہیں اس سے اندازہ لگا لیں کہ وہ کتنے تیز رفتار ہیں۔ اس تیز رفتاری کے بارے میں باب ہوپ نے کہا۔ ہم اتنا تیز سفر کر رہے تھے کہ جب ہم سپوکین سے رخصت ہوئے تو ہمارے پاس دو خرگوش تھے اور جب ہم کو پیکا میں اترے تو ابھی تک ہمارے پاس دو خرگوش ہی تھے۔

داچا

حکومت نے پہاڑوں پر ادیبوں کے لیے گھر بنوائے جنہیں داچا کہتے ہیں۔ یہ ایسی جگہ پر ہیں جہاں ذہن میں برا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ اور ایسی جگہ پر ادب کیا تو جا سکتا ہے۔ ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں ہمیں کوئی غیر شریفانہ چہرہ نظر نہ آیا جس کی دو وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ ہم وہاں سے باہر ہی نہ نکلے اور دوسری یہ کہ ہم جس کمرے میں تھے وہاں شیشہ نہ تھا۔ دادا خان، ساتھ کے داچے والی افسانہ نگار خاتون سے مانگ لائے مگر شیشہ ایسا تھا کہ اس میں بندے کو اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھوں سے زیادہ اچھی یادداشت چاہیے تھی۔

وہاں درخت پھلوں سے لدے ہوئے نہ لگتے بلکہ لگتا پھل ان پر لادے ہوئے ہیں۔ اس قدر خاموشی کہ وہاں خاموشی تک صاف سنائی دیتی۔ دادا خان یہاں آ کر پلاؤ پکانے میں جت گئے۔ پہلے ادیب دیکھے جو خیالی پلاؤ کے علاوہ بھی کچھ پکا سکتے تھے۔ ویسے بندے کو ہر وقت ادیب نہیں رہنا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے لیے انسان بھی بن جانا چاہیے۔ داچے میں ہمیں گھوڑے بہت نظر آئے پوچھا۔ ادیبوں کی بستی کے ساتھ کیا سیاست دانوں کے داچے ہیں؟

دریائے چرچک

اسے دریائے چرچک اس لیے کہتے ہیں کہ پانی چلنے سے اس میں سے چڑیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ یہ دریا پہاڑوں سے پانی، ٹھنڈی ہوا اور موسیقی لے کرتا شققند آتا ہے۔ دادا خان نے پوچھا۔ جب آپ دریائے چرچک پر شال کی

طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہو گا؟ ہم نے کہا ''ہماری انگلیاں''۔ دریائے چر چک کے کنارے قصبہ غزل کینٹ واقع ہے۔ سنا ہے یہاں لڑائی بھی ہو تو اس کی فضا مشاعرے کی سی ہوتی ہے۔ غزل کینٹ میں ہمیں ایک بھی غزل نظر نہ آئی۔ ایک آزاد نظم نظر آئی جو وزن سے آزاد تھی اور بحر کے حساب سے پورا بحر تھی۔ یہاں تیز رفتاری کی وجہ سے پولیس نے پکڑ لیا۔ دادا خان کچھ دیر باہر جا کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے سوچا گاڑی کے کاغذات لینے آئے ہوں گے۔ انہوں نے ہمیں اپنی کتاب نکالنے کو کہا۔ ہمیں بمع کتاب پولیس آفیسر کے پاس لے گئے۔ پولیس آفیسر کو پتہ چلا ہم رائٹر ہیں تو اتنی عزت سے پیش آیا کہ وہاں کوئی اتنی عزت سے پیش نہیں آتا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہاں اکثر لوگوں نے ہماری کتابیں پڑھی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جب بھی پولیس اپنی طرف آتی نظر آتی ہم بیگ سے اپنی کتاب نکالنے لگتے۔ دادا خان نے ہمیں محاورہ سنایا کہ اگر پہاڑ پر نہیں چڑھے گا تو دولانہ (میوہ) نہیں ملے گا اور جان قربان نہیں کرے گا، تو جانا نان نہیں ملے گا۔ یہ محاورہ سن کر تو ہمارا کچھ بھی کرنے کو دل نہ چاہا۔ دادا خان تھوڑے تھوڑے وقفے کے گاڑی روک کر کہتے میں اپنی دوست سے مل لوں۔ مگر ہر بار وہ دوست لڑکا ہی نکلتا جس سے یہی نکلتا ہے کہ خان کہیں کا بھی ہو خان ہی ہوتا ہے۔

کمیونسٹ مویشی

ہم نے وہاں گائے بھینسیں یوں آزاد پھرتی دیکھیں جیسے 1991ء میں انہیں بھی آزادی ملی ہے۔ان کی ہی طرح ازبک بھی حیران پھر رہے تھے کہ ان کے دن کیسے پھر گئے ۔اس سے پہلے جانوروں کو کولیکٹیو فارمز میں رکھا جاتا تھا۔وہاں کام کرنے والے ایک منتظم نے کہا تھا اگر کولیکیو فارم کا انچارج کہے تو ہم سب گائیوں کا دودھ دیں گے۔اگر کمیونسٹ پارٹی کہے گی تو بیل بھی دودھ دیں گے۔ دادا خان نوری نے بتایا کہ اس نے آندی جان سے ہمارے لیے بھیڑ کا گوشت منگوایا ہے کیونکہ یہاں تو بھیڑ ذبح کرنا جرم ہے۔مرغ بھی کم ہی ملتا ہے۔مرغ پکانے کے ان کے ہاں سو طریقے ہیں ان میں سے ایک طریقہ ایسا بھی ہے جس میں مرغ کو پیدا ہونے سے پہلے پکاتے ہیں۔ایوگیتی پتروسیاں کہتا ہے ''باہر کے ممالک میں جا کر لوگ مجسموں کے ساتھ تصویریں بنواتے ہیں میں نے جرمنی جا کر گوشت کے ساتھ تصویریں بنوائیں ۔سب حیران ہو کر دیکھتے ہیں۔میں کسی مجسمے یا دیوتا کے ساتھ تصویر کھنچواتا تو کون دیکھتا۔کوئی دیوتا اٹھ کر میری کمر میں ہاتھ بھی ڈال دیتا پھر بھی اس تصویر کو کوئی پانچ پانچ بار نہ دیکھتا۔کمیونسٹ پارٹی کی 24ویں کانفرنس میں برژنیف کو کہا گیا کہ حضور ملک میں گوشت کی کمی کیوں ہے؟ برژنیف نے کہا ہم کمیونزم کی طرف اتنی تیزی سے جا رہے ہیں کہ مویشی اتنا تیز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔'' خروشچیف کے دور میں دیہات میں گدھوں پر ٹیکس عائد کیا گیا۔ایک گدھے کے دام اس وقت پچاس روبل تھے لیکن ٹیکس ان پر سو روبل فی گدھا لگایا گیا تھا۔لوگوں نے تنگ آ کر سارے گدھے سڑکوں پر چھوڑ دیئے یوں فی گدھا پچاس روبل بچا لیے گئے کیونکہ لوگ گدھے نہیں تھے۔

گھوڑے کا دودھ

داچے سے واپسی پر دادا خان ہمیں ایک مسجد کے افتتاح پر لے گئے جس کی وجہ ہمیں اب تک سمجھ نہیں آئی۔ مسجد کے کلین شیو امام نے پینے کے لیے دودھ دیا تو دادا خان نے ہمیں کہا پیو یہ گھوڑے کا دودھ ہے۔ ہم نے کہا پی لیتے اگر گھوڑے کا نہ ہوتا۔ ویسے آپ کمال ہیں جو گھوڑا دوہ لیتے ہیں ہم تو گھوڑی نہیں دوہتے۔ دادا خان کو جو بندہ وقت کا پابند ملے اسے کمیونسٹ طبیعت کہتے ہیں۔ خود بڑی آزاد طبیعت پائی ہے۔ پتہ نہیں گھڑی کیوں باندھتے ہیں۔ کہنے لگے اب ہماری زندگی میں اسلامی طریقے آ رہے ہیں۔ اب ہم پلاؤ دائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ پوچھا۔ پہلے کس سے کھاتے تھے؟ کہا چمچ سے۔ بندے کو کامیابی ملتی ہے صحیح فیصلہ کرنے پر اور صحیح فیصلہ بندہ تب کرتا ہے جب اسے تجربہ ہو اور تجربہ بندے کو غلط فیصلے کر کے ہی حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال ہمارا تجربہ حاصل کرنے کا موڈ نہ تھا۔ دادا خان نے پھر کہا۔ گھوڑی کا دودھ پینے سے عقل آ جاتی ہے۔ ہم نے کہا یہ دودھ جب گھوڑی کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اسے عقل کیوں نہیں آتی۔ بہر حال ہمارے ساتھیوں نے اسے پیا ہم انہیں دیکھتے رہے کہ شاید انہیں عقل آ جائے تھوڑی دیر بعد ہی گورا صاحب نے کہا۔ یار دودھ پی کی حماقت ہی کی۔ ہم نے کہا واقعی گھوڑی کا دودھ پینے سے عقل آ جاتی ہے۔

فلم بر داشتہ

ہماری فلموں کی طرح ان کی فلموں میں بھی اتنی لڑائی ہوتی ہے کہ فلم دیکھنے والے اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ہیرو نے انہیں نہیں مارا۔ وہاں فلمیں سیکسی نہیں ہوتیں دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بار ایسی فلم جس میں ہیروئن ننگی تھی سینما گھر میں چل رہی تھی جس پر حکومت نے پابندی لگا دی کہ یہ فلم بیرون ملک جائے گی تو بڑی شرمندگی ہوگی۔ وہ سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں لباس کی قلت ہے۔ وہاں بھی ہیروئن بننے کے لیے بڑی صلاحیتیں چاہئیں۔ صلاحیتیں ہی کیا ہر چیز بڑی چاہیے۔ وہاں بھی کامیاب ادکارہ وہی ہوتی ہے جو ناکام بیوی ہو۔ پتہ نہیں وہ گھر میں اچھی اداکاری کیوں نہیں کر پاتیں۔ وہاں کی ایک مقبول اداکارہ نے بتایا میری دونوں شادیاں ناکام ہو گئیں۔ پہلا خاوند مجھے چھوڑ گیا اور دوسرا خاوند مجھے چھوڑتا نہیں۔ داداخان نوری ہماری داچا کی ہماری سیر کی فلم بنانے کے لیے ایک نوجوان کو ساتھ لایا تھا جس کا نام بہادر تھا۔ ہم جیسے ایسی ہی فلموں میں مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی کہے میں نے تین فلموں میں مرکزی کردار ادا کیا تو اس کا مطلب ہوگا اس نے تین شادیاں کیں اور فلمیں بنوائیں۔ داچہ میں ہم بیٹھے تھے پیچھے چیری کے درختوں کی اوٹ سے پرندے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے بہادر سے پوچھا "یہ آواز اس درخت سے آ رہی ہے۔ بہادر نے کہا نہیں، یہ آواز میرے کان سے آ رہی ہے۔"

بل بلانا

ہم تو لوڈشیڈنگ سے بل بلا اٹھتے ہیں پوچھا ''آپ کے ہاں بجلی بند نہیں ہوتی'' کہا نہیں۔ ہم نے کہا اچھا آپ کے ہاں واپڈا کا محکمہ نہیں ہے۔ دادا خان نے کہا ہمارے ہاں تو گاؤں میں بھی لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی۔ ہم نے کہا ہمارے گاؤں میں بھی لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری حکومت اہل دیہات کے مسائل حل کرنا چاہتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گاؤں میں بجلی ہوتی ہی نہیں۔ انہوں نے کہا جہاں تک بل کی بات ہے ہمارے ہاں بجلی کے استعمال کرنے پر بل نہیں آتا۔ ہم نے کہا۔ ہمارے ہاں بھی بجلی استعمال کرنے پر بل نہیں آتا۔ اس کے بغیر ہی آتا ہے۔ ایک ہمارے ادیب نے کہا۔ پچھلے کئی ماہ جتنا بل میرا آ رہا ہے دوسروں کا اس سے آدھا بھی نہیں آتا ہو گا۔ میرے گھر میں کوئی بچہ نہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ سارا دن دفتر میں رہتے ہیں اب آپ بتائیں ہمارا بل اتنا کیسے آ سکتا ہے؟ تو ایک صاحب بولے ''یہ آپ کا بل نہیں یہ بجلی کا بل ہے''۔

علماء کرائم

ہمارے ہاں سب سے صحت مند طبقہ مولوی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ مولوی اس لیے صحت مند ہوتے ہیں کہ غیر مرغن غذاؤں اور کم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن دولت مند نہیں ہوتے۔ ہم

نے کہا ہمارے ہاں اکثر مولویوں کے پلے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس پر دادا خان بولے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ آپ کے چند مولویوں کی تقریریں میں نے بھی سنی ہیں۔ ''مولویوں کو ہم کچھ نہیں کہتے جو کہنا ہوتا ہے وہی کہتے ہیں۔ ایک پادری کہتا ہے۔ ''نن ہونا ایسے ہی جیسے پاپ کارن سے سنگسار ہونا''۔ سنا ہے وہاں کے علماء نے پینے کی آزادی دے رکھی ہے ہم جس بھی گھر گئے وہاں دستر خوان پر شراب یوں تھی جیسے ہمارے ہاں پانی ہوتا ہے۔ کچھ امیر گھروں میں دستر خوان پر پانی بھی ملا۔ کہتے ہیں دو پادری عبادت کرتے وقت سگریٹ پیئے بغیر نہ رہ سکتے مگر ان کا ضمیر انہیں اس پر کچوکے لگاتا رہتا۔ دونوں نے اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے علیحدہ علیحدہ پوپ کو خط لکھے۔ تین ہفتے بعد جب خط کا جواب آیا تو ایک خط کا جواب آیا تو ایک پادری کو پوپ نے سگریٹ پینے سے منع کر دیا تھا جبکہ دوسرے کو اجازت دے دی تھی۔ انہوں نے اپنے خط نکالے تو ایک پادری نے پوچھا تھا۔ میں جب عبادت کر رہا ہوں سگریٹ پی سکتا ہوں؟ جواب ملا، نہیں۔ جبکہ دوسرے نے پوچھا تھا ''کیا میں جب سگریٹ پی رہا ہوں عبادت کر سکتا ہوں۔ جواب ملا، ہاں۔''

ارال سی۔ سی تھرو ہو گیا

دادا خان نوری بار بار ارال سمندر کا ذکر کرتے ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کون سا سمندر ہے۔ داچے سے تاشقند جاتے ہوئے انہوں نے ایک نالے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ ہمارا فلاں دریا ہے۔'' تو ہمیں اندازہ ہوا ارال سمندر کتنا بڑا ہے۔ روسیوں کو پینے کی اتنی عادت ہے کہ وہ ازبکیوں کا سمندر پی گئے۔ ارال قزاقستان اور ازبکستان کے نقشے پر یوں لرز رہا ہے جیسے خشک گالوں پر آنسو۔ ارال سی کا اب یہ حال ہے کہ جہاں کبھی بحری جہاز چلتے تھے اب وہاں جیپیں چلتی ہیں۔ چاول اور کپاس زیادہ اگانے کے لیے وہاں سے دو دریاں نکالے گئے۔ جو ارال کو ڈیک لگا کر پی گئے۔ اب تو وہاں چاول کا ایک دانہ ایک گلاس پانی کے برابر ہے۔ ازبک سمجھتے ہیں ان کے ہاں موسم میں جو تبدیلی آ رہی ہے وہ ارال سمندر کے خشک ہونے کی وجہ سے ہیں۔ ایک روسی بتا رہا تھا ارال خشک ہونے کی وجہ سے ہمارے ماحول پر عجیب اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ جیسے میری شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو گیا ورنہ جب سمندر 1/3 خشک نہیں تھا بچے نو ماہ بعد پیدا ہوتے تھے۔ کہتے ہیں ایک روسی کی شادی کے تین ماہ بعد ہی بچہ پیدا ہو گیا تو اس نے بیوی سے اس کی انکوائری بعد میں کی پہلے یہ انکوائری کر لی کہ ارال سمندر میں پانی کتنا کم ہو گیا ہے؟

افریقہ کی برف

ارال کے خشک ہونے سے ماحولیاتی آلودگی بڑھ رہی ہے۔ آلودگی کی وجہ سے سائبیریا کے صنعتی علاقوں میں ایسی برف پڑتی ہے کہ اس کا رنگ دیکھ کر لگتا ہے یہ افریقہ کی برف ہے۔ ہم نے احتیاطاً پوچھ لیا وہاں دودھ کا رنگ کون سا ہوتا ہے؟ وہاں بندہ چل کر بھی آئے تو اس کی سانس کی رفتار سے لگے گا وہ سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لے کر آیا ہے۔ 1965ء تک متحدہ روس میں اوسط عمر 66 سال تھی جواب کم ہو کر 61 سال ہو گئی ہے۔ روس جلد ان ممالک میں آ جائے گا جہاں آپ کو کوئی بوڑھا نہیں ملے گا۔ ہمارے ہاں بھی ماحولیاتی آلودگی کے خلاف احتجاج اکثر ہوتے ہیں۔ شرکاء ٹائر جلا کر احتجاج کرتے ہیں۔ روس ریاست لیتھوینیا کے باشندے گھروں کو کیروسین آئل سے گرم رکھتے ہیں اور یہ تیل وہ بارشوں کے پانیوں سے یوں اکٹھا کرتے ہیں جیسے دودھ سے بالائی۔ یہ زیر زمین سٹوریج ٹینکوں سے رس کر آتا ہے۔ آذر بائیجان جسے ہم پہلے آذر بھائی جان لکھتے تھے لیکن وہاں کی لڑکیوں کی تصویریں دیکھ کر "آذر" بائی جان لکھنے لگے ہیں۔ وہاں آگ لگنا اس قدر عام ہے کہ عورتیں دو وقت کھانا پکانے کے لیے ماچس استعمال نہیں کرتیں اتنی بار تو محلے میں خود ہی آگ لگ جاتی ہے۔

ڈر۔ آمہ

ہمارے ہاں ڈرامے میں یہی ڈر رہتا ہے کہ کہانی ہوئی تو چلے گا نہیں۔ ہم نے

ازبکستان کے ایک ڈرامہ نگار سے پوچھا۔ ''آپ ڈرامہ لکھنے میں کتنی دیر لگاتے ہیں؟''تو وہ یہ بتانے کے لیے واڈکا کی بوتلیں گننے لگا۔وہاں ہر منہ سے شراب کی بوآتی ہے۔جس سے نہ آئے اس کا پولیس والے منہ سونگھتے ہیں۔ڈاکٹر تاش مرزا ہمیں عبداللہ قہار تھیٹر میں ڈرامہ ''تابوت سے آواز'' دکھانے لے گئے جو اتفاق سے عبداللہ قہار ہی کا لکھا ہوا تھا۔ٹکٹ اتنی ہی کم تھی جتنے دیکھنے والے۔ہم نے بتایا کہ ہم نے بھی اسٹیج ڈرامہ ''بوائز ہوسٹل کمرہ نمبر 302'' لکھا اور ٹکٹ داخلہ پچھتّر روپے تھی کہا ''اس سے تو کم پیسوں میں ہمارے ہاں گرلز ہوسٹل جاسکتے ہیں۔'' ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے ڈراموں میں بھی نوکری بادشاہ ہے۔ڈرامے میں ملا کا کردار وہی تھا جو ہماری فلموں میں اسلم پرویز کا ہوا کرتا تھا۔ڈرامے میں اس ملا کو محلّہ چھوڑنا پڑتا ہے تو ہمسائی اداس ہو جاتی ہے۔ملا اسے تسلی دیتا ہے کہ پریشان نہ ہو،میری جگہ کوئی اچھا ملا آجائے گا۔''تو وہ کہتی ہے،اسی لیے تو پریشان ہوں''۔

بہوؤں کی بغاوت

بہو مستقبل کی ساس کو کہتے ہیں گویا یہ ڈرامہ مستقبل کی ساسوں کی ماضی کی ساسوں کے خلاف بغاوت پر مبنی تھا۔ ساس ایسی نظر آتی ہے کہ ایک بندے نے کہا ایک مرتبہ ایک آنسو میری ساس کی آنکھ سے نکلا، گال تک پہنچا اور چہرے کو ایک نظر دیکھتے ہی آنکھ کی طرف واپس دوڑ پڑا۔ ساس بہو کا جھگڑا وہاں نہیں ہوتا۔ جہاں ساس بہو نہیں ہوتی۔ البتہ ازبکستان میں خاوند بیویوں کو نہیں مارتے جوتا یا ڈنڈا تو کیا وہ بیوی کو آنکھ تک نہیں مارتے۔ ایک نسل کا دوسری نسل سے اختلاف تو ہمیشہ سے رہا ہے۔ ایک مزاح نگار کہتا ہے۔ جب کہیں جا کر مری اس عمر کا ہوا کہ اپنے باپ کی بات سے متفق ہو سکوں تب تک میرا بیٹا اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ میری اس بات سے اختلاف کر سکے۔ ہماری ملاقات عبداللہ قہار تھیٹر میں مزاح نگار عوامی ادیب سعید احمد سے ہوئی۔ وہ ڈرامہ 'تابوت سے آواز' کے دوران پچھلی سیٹوں پر سو رہے تھے۔ ہمیں تو یہ اس ڈرامے پر تبصرہ ہی لگا۔ ہم نے سعید احمد صاحب سے پوچھا۔ آپ کس لیے لکھتے ہیں؟ بولے سنجیدہ پڑھنے والوں کے لیے۔ غیر سنجیدہ لوگوں کے لیے تو ہمارے ہاں اداریئے لکھے جاتے ہیں۔ سعید احمد نے ایک بار ایک پبلشر کے بارے میں کہہ دیا کہ وہ مر چکا ہے اس پبلشر کو پتہ چلا تو اس نے سعید احمد سے شکوہ کیا کہ میں زندہ ہوں اور آپ نے میرے مرنے کی خبر دے دی ہے۔ اس پر سعید احمد صاحب نے کہا آپ نے خود ہی کہا تھا اگر میں زندہ رہا تو آپ کا ناول تین سال تک چھاپ دوں گا۔ ناول تین سال تک نہ چھپا تو میں سمجھا

آپ یقیناً مر گئے ہوں گے۔"

غنچہ کا غنچہ

تاشقند کے سینما غنچہ میں ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ جسے دیکھ کر وہاں کی لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ ہندوستانی مرد سارا دن محبت ہی کرتے رہتے ہیں۔ پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کے مردوں سے زیادہ دنیا میں کوئی باوفا نہیں ہوتا، اس لیے وہ ان کو پسند کرتی ہیں۔ ہمیں دن میں کئی کئی بار اس کا یقین دلایا جاتا۔ پھر افغانیوں نے بیرون ملک پاکستان کی بڑی عزت بنائی ہے۔ افغانی ایسے کام کرتے ہیں اب باہر کے لوگ پاکستانیوں کو اچھا سمجھنے لگے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ہمارے ہاں مرد ہر وقت محبت ہی نہیں کرتے رہتے، آخر انہیں اپنے گھر بھی جانا ہوتا ہے۔ ایسی بیویاں بھی ہیں جو شادی کے بعد بھی محبوبہ رہتی ہیں بشرطیکہ خاوند کو پتہ نہ چلے۔ ہمارے ہاں شادی شدہ آدمی کی دو خواہشیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا اپنا گھر ہو اور دوسرا اپنی گاڑی ہو جس پر بیٹھ کر وہ گھر سے دور جا سکے۔ وہاں کی لڑکیاں محبوب کو خدا سمجھتی ہیں۔ ہمارے ہاں نہیں سمجھتیں کیوں کہ خدا تو سب کا ہوتا ہے۔ لیکن محبوب تو صرف آپ کا ہوتا ہے۔ میاں بیوی دنیا کے ہر خطے میں میاں بیوی ہی ہوتے ہیں۔ وہاں ایک بیوی لڑ رہی تھی کہ تم میری ہر بات پر اختلاف کرتے ہو۔ پانچ سالوں میں ایک بار بھی تم نے مجھ سے کسی بات پر اتفاق نہیں کیا۔ خاوند بولا۔ تم غلط کہہ رہی ہو ہماری شادی کو پانچ سال نہیں ہوئے۔ بہر حال

ہم نے ان کو بتایا کہ پاکستان میں گھروں میں بڑے بڑے فیصلے مرد کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بیویاں۔ جیسے مرد یہ فیصلہ کرتا ہے خلیج کی جنگ میں امریکہ کے عزائم کیا تھے؟ روس کیوں ٹوٹا؟ گلیوں میں جرائم میں اضافہ یا بجٹ میں خسارہ اور عورتیں چھوٹی چھوٹی باتوں کا فیصلہ کرتی ہیں جیسے گھر، کار یا کپڑے کیسے خرید نے ہیں۔ رات کو کیا پکانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ری کال گرل

وہاں اب ہر طرف آزادی ہی آزادی ہے۔ سیکس سے بچنے کی اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے وہ ہے بندہ شادی کرلے۔ اب وہاں یہ حالات ہیں ایک راہنما نے کہا عورتیں میرے دائیں بیٹھیں اور مرد بائیں۔ اس نے ہر گھر کے سربراہ سے کہا۔ وہ سامنے آئے اور چندہ دے۔ تمام مرد اٹھے لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ زیادہ تر مردوں کو رقم لینے کے لیے اپنی بیویوں کے پاس جانا پڑا۔ کسی دوسرے ملک کی زبان جلد سیکھنے کا یہ طریقہ ہے کہ اس ملک کی لڑکی سے دوستی کرلو۔ البتہ عورت کے لیے ایسا نہیں کہا گیا۔ کہتے ہیں ایک انگریز لڑکی روسی سیکھنے آئی اس نے روسی لڑکے سے دوستی کرلی اور ایک ہی ماہ میں لڑکا فر فر انگریزی بولنے لگا۔ ہوٹلوں کے باہر کالجوں کی لڑکیاں کال کی منتظر ہوتی ہیں یا ری کال کر رہی ہوتی ہیں۔ میں اور گورا صاحب توران ہوٹل کے سامنے پارک کے غنودہ راستے پر چل رہے تھے۔ گورا صاحب نے کہا تھا یہاں قابل اعتراض حرکتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یوں

دیکھنے کے علاوہ وہاں کوئی قابل اعتراض حرکت نظر نہ آئی۔ واپس آنے لگے تو حرکت ہوئی مگر جھاڑیوں میں۔ ہم نے سوچا جوڑا ہوگا۔ باہر نکلا تو واقعی ہی جوڑا تھا ایک کتا کتیا کے ساتھ جھاڑیوں سے نکلا۔ کتے کا منہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا پورا جسم اس کے اپنے منہ میں آسکتا تھا۔ کتا کتنا ہی کتا کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی کوئی تو خوبی ہے کہ انسان کا وفادار ساتھی ہے وہ کتا بھونکنے لگا۔ وہ پانچ منٹ بھونکا ہمیں دس منٹ سنائی دیا۔ کتے سے تو کتے تک ڈرتے ہیں۔ گورا صاحب نے ہمیں ڈراتے ہوئے کہا کاٹنے والے کتوں سے بچنا چاہیے۔ ہم نے کہا مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا یہ کاٹنے والا کتا ہے۔ کہا جونہی وہ کاٹے گا فوراً پتہ چل جائے گا۔

اگر چہ وہاں تمام عورتیں روسیوں کی طرح ہیں۔ اگر آپ وہی کریں جو وہ چاہتی ہیں تو وہ آپ کو عقل مند اور امن پسند کہیں گی۔ جونہی آپ نے ان کے ساتھ عقل کی بات کی تو وہ کہیں گی آپ ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ ازبکستان کو آزاد ہوئے عرصہ ہوگیا لیکن ہوٹلوں اور دفتروں میں زیادہ تر روسی ہی کام کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ ازبک انہیں اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے پہلے روسی انہیں دیکھتے تھے۔ 1980ء کے دور کا لطیفہ اب بھی تازہ ہی لگتا ہے۔ ایک جاپانی، روسی اور ازبک سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو چیلنج کیا کہ ان کی قوم کے پاس جو کچھ کثرت میں ہے وہ ضائع کر دیتے ہیں۔ جاپانی نے اعلان کیا کہ اس کے ملک میں ویڈیو کیمرے بہت ہیں لہذا اس نے اپنا کیمرہ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ روسی نے کہا۔ اس کے ہاں واڈکا

شراب بہت ہے اس نے واڈکا کی بوتل باہر پھینک دی۔ازبک نے کچھ نہ کہا اور چند لمحے سوچنے کے روسی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

نگار خانہ

نگار مرزا ائف ڈاکٹر تاش مرزا کی اردو دان بیٹی ہیں۔ہم نے ان سے وہاں کے طنز و مزاح کے رسالے مشتم کے کئی سالوں کے پرچے پڑھے اتنا اچھا پڑھاتیں کہ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمیں ازبک زبان نہیں آتی۔نگار مشتم کے صفحے پر نظر ڈالے رکھتی اور ہم اس چہرہ دیکھتے رہتے۔جونہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہمیں پتہ چل جاتا کہ اس کی نظر کسی لطیفے پر پڑ گئی ہے۔لیکن ہم اسے اصول نہ بنا سکے کیونکہ کئی بار پر نظر پڑنے پر بھی وہ ہنس پڑی۔نگار نے پوچھا۔اب تک کیا دیکھا ہے؟ ہم نے کہا اب تک وہ ہی دیکھا ہے جو سامنے آیا ہے۔ہمارے ہاں گھر کا کام وہ ہوتا ہے جو ہماری عورتیں فون کالز کے درمیان کرتی ہیں۔وہاں خواتین اتنا کام کرتی ہیں کہ جس دن کام کم ہو تھک جاتی ہیں۔ہم نے کہا "روس سے ہمارا مزاجی رشتہ ہے اور ازبکستان سے مزاجی"۔نگار نے تعلیم کے ساتھ ہماری تربیت بھی شروع کر دی۔کہا کسی سے بات نہ کرنا ورنہ اس کو پتہ چل جائے گا کہ آپ غیر ملکی ہیں۔سو جب بھی کسی کو پتہ چلا کہ میں غیر ملکی ہوں میری چپ سے ہی پتہ چلا۔نگار نے کہا۔گم بھی ہو گئے تو پتہ اس سے پوچھنا جو شکل سے بہتر لگے۔سو ہم پہلے کوئی بہتر شکل والا ڈھونڈتے پھر راستے بھولتے۔

ایوگینی پتروسیان

ایوگینی پتروسیان ٹی پر شو کرتا ہے۔ جس میں وہ ممتاز مزاح نگاروں کی تحریروں کے ٹکڑے سناتا ہے۔ مزاح کا یہ روسی پروگرام نگار نے ہمیں دکھایا اور ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی کرتی رہی اس شو کی چند جھلکیاں:

س: Mistress کسے کہتے ہیں؟

ج: جو Mister اور Mattress کے درمیان ہوتی ہے۔

☆

س: دنیا کے سب سے برے تین سوال

ا۔ کیا آپ سوئے ہوئے ہیں؟

۲۔ آپ کب بڑے ہوں گے؟

۳۔ آپ میں حس مزاح نہیں ہے؟

☆

س: پچھلے سال یوم مئی پر ماسکو کے ریڈ سکوائر میں جو ملٹری پریڈ ہوئی اسے 400 اکانومسٹ کیوں لیڈ کر رہے تھے۔

ج: اس لیے کہ سوویت یونین کی سب سے تباہ کن فورس یہی ہے۔

☆

حکومت عوام سے ہر چیز خفیہ رکھتی ہے۔سکول کے بچوں کو ایسی تربیت دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اچھے ماہر بن سکیں۔مگر اکثر یہ بات خفیہ رکھی جاتی ہے۔کہ وہ کن چیزوں کے ماہر بنتے ہیں۔

☆

''باس نے میری سپیڈ سے خوش ہو کر میری نوکری پکی کر دی۔

''سپیڈ......ٹائپنگ سپیڈ؟''

''نہیں باس کے کمرے سے نکلنے کی سپیڈ جب اس کی بیوی آجائے''۔

☆

میری بیوی ڈاکٹر نہیں پھر بھی اس جیسی پٹی کوئی نہیں کرسکتا۔

وہ پٹی کرنے کے لیے کیا کرتی ہے؟

''پہلے زخم لگاتی ہے''۔

وسط ایشیائی ریاستیں

آزادی کے بعد یہ وسط ایشیائی ریاستیں آزاد خیال ہوگئیں۔ پرائیوٹ بزنس شروع ہوا لیکن وہ زیادہ ہی پرائیوٹ بزنس کرنے لگے۔ انڈسٹریل دور آیا اور جوان عورتیں خود انڈسٹری بن گئیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں کیف جو پر کیف اور روس کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں کے بادشاہ باسل نے بازنطینی اثرات کے تحت فیصلہ کیا کہ کفر چھوڑ کر کوئی مذہب اختیار کیا جائے لیکن کون سا؟ ایک دور میں اس کا رحجان اسلام کی طرف بہت زیادہ تھا لیکن مسلمان ہونے والا تھا تو کسی نے کہہ دیا مسلمانوں کو شراب نوشی کی اجازت نہیں۔ ابن انشاء لکھتے ہیں مجھ جیسا مبلغ ہوتا تو اسے تھوڑی سی رعایت دے دیتا کہ میاں کوئی بات نہیں چھپ کر پی لینا۔ لیکن موصوف بدک گئے اور عیسائیت اختیار کر لی۔ ولاڈی میر کے نام سے مشہور ہوئے ورنہ پورا روس مسلمان ہوسکتا تھا۔ دیکھا شراب کتنی بری چیز ہے؟ ولاڈی میر کی آٹھ سو بیگمات تھیں۔ ایک بار اسے ایک خوب صورت لڑکی نظر آئی۔ اس نے اسے شادی کا پیغام بھیجا تو وہ بولی حضور میری آپ کی شادی نہیں ہوسکتی کیونکہ میں تو پہلے ہی آپ کی بیوی ہوں۔

کہہ کہے

آزادی کے بعد مختلف ریاستوں کے بارے میں وہاں کے لوگوں کے مزاج

کو بتاتے لطیفے سامنے آئے۔ آرمینیا والوں کو کنجوس کہتے ہیں جبکہ جارجیا کے لوگ بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک آرمینی اندھیرے میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ جارجیا کے خوش فکرے نے پوچھا۔ اے برادر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اس نے کہا۔ خاص نقصان ہو گیا پانچ روبل کا نوٹ تھا جو گر گیا۔ جارجیا نے جھٹ سے دس روبل کا نوٹ نکالا ماچس سے اسے آگ لگائی اور کہا ''لو میں روشنی کیے دیتا ہوں ڈھونڈ لو'' روسی اور امریکیوں میں یہ فرق ہے کہ روسی لمبے نہیں ہوتے۔ امریکی تو ہوتے ہیں مگر اونچے نہیں ہوتے اب تو روس اور امریکہ میں یہی ایک قدر مشترک رہ گئی ہے۔ کہ روبل کی کسی ملک میں کوئی قدر نہیں۔ کہتے ہیں ''ایک روسی اور امریکی دریا کے کنارے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ امریکی مسلسل ''کنڈی'' سے مچھلیاں پکڑے جا رہا تھا۔ آخر کار روسی نے تنگ آ کر کہا۔ جان تم مسلسل مچھلیاں پکڑے جا رہے ہو لیکن میرے ہاتھ ایک مچھلی بھی نہیں آ رہی۔ تو امریکی نے کہا میاں تم دریا کے جس حصے میں ہو وہ روسی علاقہ ہے اور وہاں مچھلی منہ کھولنے سے ڈرتی ہے۔'' متحدہ روس کے زمانے میں ازبکستان کے بارے میں یہ لطیفہ بڑا مشہور تھا کہ متحدہ روس کے ایوان صدر کو ریاست بالورشیا کی ری پبلک کی سپریم سوویت کی طرف سے خط ملا کہ ہمارے ہاں منسٹری آف میرین یعنی وزارت بحر ہونی چاہیے۔ ایوان صدر نے جوابی خط لکھا کہ آپ یہ وزارت کیوں چاہتے ہیں؟ جبکہ وہاں تو کوئی واٹر باڈی نہیں۔ تو اس پر جواب آیا اگر ازبکستان میں منسٹری آف کلچر ہو سکتی ہے تو ہمارے ہاں منسٹری آف میرین کیوں نہیں ہو سکتی۔

باشنی

نگار نے بتایا کہ روسی زبان میں جانوروں کا ادب بھی ہے۔ جس میں جانوروں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔جن میں جانور بولتے ہیں اسے باشنی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ریختی ایک صنف ہے جس میں عورتیں اپنے مردانہ جذبات کا اظہار کرتی ہیں لیکن اس میں زیادہ مردوں نے ہی زنانہ جذبات کا اظہار کیا۔ظہیر الدین بابر کی نسل کا محمد شاہ رنگیلے اوراس کے بیٹے احد شاہ تک کا سفر دراصل غزل سے ریختی تک کا سفر ہے۔اسی لیے احمد شاہ کو آتے دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہوتا کہ بادشاہ سلامت آرہے ہیں یا آرہی ہیں۔مغلیہ سلطنت کے آخری دنوں ایک ایسے بادشاہ کو سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ دشمن کی فوجیں قلعے میں داخل ہو چکی ہیں بھاگ چلیں۔تو وہ بولے کیسے بھاگ جائیں جوتے پہنانے کے لیے ملازم تو ہے نہیں۔ روس میں جب انسانوں کا بولنا بند ہوا تو جانور بولنے لگے۔ باشنی میں کریلوف بہت بڑے ادیب کے طور پر سامنے آئے۔ان کی باشنی کے کچھ نمونے حاضر ہیں۔

(الف) چڑیا اور گھر

ایک شخص چڑیا گھر گیا اور کہنے لگا میں وہاں تین گھنٹے بسر کر کے آیا ہوں۔ میں نے وہاں ہر چیز دیکھی، ہر شے کا بغور مطالعہ کیا۔میری حیرت کا وہاں اتنا سامان تھا کہ سب کچھ بیان کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔بخدا اس چڑیا گھر میں سب کچھ

ہے سوائے چڑیا اور میرے گھر کے۔ یہ عجائبات کا محل ہے قدرت کی قوت ایجاد کا کوئی ٹھکانہ نہیں کیسے کیسے پرندے اور چرندے وہاں جمع ہیں۔ کیسی کیسی مکھیاں، تتلیاں، پتنگے اور جھینگر وہاں قید کر رکھے ہیں اور ننھے منے کیڑے مکوڑے بعض تو ان میں سے اتنے باریک ہیں کہ سوئی کے نکے سے گزر جائیں۔

سننے والے نے پوچھا، مگر یار تم نے ہاتھی بھی دیکھا بھلا کتنا بڑا ہے؟ جب تم اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہوگے تو تمہیں لگا ہوگا جیسے پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو۔

پوچھا، تم وثوق سے کہتے ہو کہ ہاتھی نام کا جانور بھی وہاں موجود ہے۔

وہ بولا۔ہاں بالکل۔

کہا دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ میں نے غور سے نہیں دیکھا کہ کیا خبر وہاں ہے بھی کہ نہیں۔

(ب) عینک اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہوگئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بھی بدقسمتی کی بات نہیں۔ بس اتنا ہے کہ عینک لگالینا چاہیے چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا، کبھی دم پر باندھنے کی کوشش کی کبھی سونگھا، کسی کو چاٹا، پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں اضافہ نہ کیا۔

واہیات! اس نے کہا احمق ہیں وہ جو جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انہوں نے بالکل زٹل ہانک دی ہے ان کا تو ذرا بھی فائدہ نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ آدمی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے۔ اور اگر تھوڑا بہت اختیار رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

(پ) اودبلاؤ

عدالت میں اودبلاؤ کے خلاف ایک استغاثہ دائر ہوا کہ اس نے جوہڑ کو اپنی غلاظت پسندی کے باعث رہنے کے ناقابل بنا دیا ہے۔ شہادت کے طور پر چھکڑا بھر ثبوت مہیا کیا گیا اور جیسا کہ مناسب تھا، ملزم کو ایک بڑے ٹب میں بٹھا کر کمرہ عدالت میں لایا گیا۔ جج صاحبان ذرا سے فاصلے پر مصروف تھے۔ ان کے اسمائے گرامی اب بھی قدیم دستاویزوں میں محفوظ ہیں۔ دو عدد گدھے، چند ایک بڈھے گھوڑے اور دو یا تین بکرے۔ آخر میں ایک عدد لومڑ کو بھی شامل کر لیا گیا تا کہ کسی لائق ہستی کے زیر معائنہ سب کاروائی ہو۔

اب صورت حال یہ تھی کہ افواہوں کے مطابق اودبلاؤ، لومڑ کی ضیافت کے لیے مچھلیاں فراہم کرتا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، عدالت میں جانبداری کا شائبہ نہ تھا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اس معاملے میں اودبلاؤ کی بدمعاشی عدالت سے مخفی نہیں رہ سکتی

اور اس افواہ کے جھوٹ سچ سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ آخر فیصلہ تجویز کیا گیا جس میں اود بلاؤ کو سنگین ترین سزا دی گئی تھی یعنی دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے، اس کو درخت میں پھندا ڈال کر پھانسی دینے کا حکم دیا گیا۔

''محترم جج صاحبان'' لومڑ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا ''پھانسی تو معمولی سزا ہے۔ میرے خیال میں تو ملزم کو ایسی سزا ملنا چاہیے۔ کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے اور بد معاش ہمیشہ قانون سے خائف رہیں اور سزا کی دہشت سے لرز اٹھیں، میری ناقص رائے میں اود بلاؤ کو دریا برد کر دینا چاہیے۔''

کیا کہنے کیا کہنے! جج صاحبان نے اسے داد دی اور یک زبان ہو کر اس کی تجویز قبول کر لی۔ چنانچہ اود بلاؤ کو سزا کے طور پر دریا برد کر دیا گیا۔

بچوں کا ملک

پاکستان بوڑھوں کا ملک ہے۔ یہاں بوڑھوں کو جو مقام حاصل ہے شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ لیکن متحدہ روس کا سب سے مراعات یافتہ طبقہ بچے تھے۔ وہاں بچوں کو یہ مقام حاصل تھا کہ اگر کے جی بی کا کوئی رکن کسی کے ساتھ عزت کے پیش آتا تو وہ سمجھتا تھا یہ مجھے بچہ سمجھ رہا ہے۔ امریکہ میں روس کی نسبت بچوں کو سمجھانا آسان ہے۔ اگر وہ بڑے فضول کپڑے پہن کر گھر آئیں اور والدین صرف یہ کہہ دیں کہ یہ کپڑے تمہیں بہت اچھے لگتے ہیں تو صبح ہوتے ہی وہ یہ کپڑے واپس کر دیں گے۔ دادا خان نوری نے بتایا کہ یہاں کے بچے اتنے سمجھدار اور ذہین ہیں کہ

ابھی آٹھ نو ماہ کے ہی ہوتے ہیں تو چلنے لگتے ہیں۔ ہم نے کہا پھر وہ اتنے سمجھدار تو نہ ہوئے جتنے ہمارے بچے ہوتے ہیں کیونکہ وہ جب اس عمر کے ہوتے ہیں تو ایسا کرتے ہیں کہ گھر والے انہیں تب بھی اٹھائے اٹھائے پھریں۔ وہاں کے بچے اپنے بڑوں کو گالی بھی دیں تو یہ ہوگی جو ایک بچے نے اپنے باپ کو دی کہ خدا کرے جب تم بچے بنو تو تمہارا باپ بھی میرے باپ جیسا ہو۔

SIN

پتہ چلا روسی عورتیں اپنے بچوں کو SIN کہتی ہیں۔ ہم سے پوچھا، آپ کے ہاں SIN نہیں کہتے؟ ہم نے کہا اگر بیٹا اپنا ہی ہو تو SIN نہیں ہوتا SON ہوتا ہے۔ بچے تب بڑے ہوتے ہیں جب وہ والدین سے پوچھنا بند کر دیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور یہ بتانے سے انکار کر دیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ داچے کے راستے میں دادا خان نوری ہمیں ایک گاؤں لے گئے وہاں میز بان کے بچے سے ہم نے پوچھا بڑے ہو کر کیا بنو گے کہا "بیوروکریٹ" دوسرے بچے نے کہا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو ہم نے کہا اس کا مطلب ہے یہ ضرور بیوروکریٹ بنے گا۔ ایک سائیکاٹرسٹ دوست نے ایک دن کہا میں نے آخر جان ہی لیا کہ بچے انگوٹھا کیوں چوستے ہیں۔ پوچھا۔ وہ کیسے؟ بولے میں ایک دن بچوں کو کھانا کھلانے کی کوشش کی تو تب مجھے پتہ چلا کہ وہ انگوٹھا کیوں چوستے ہیں۔ ان دنوں ازبکستان میں بچوں ک حوالے سے دو لطیفے مشہور تھے۔ ایک بچے نے دوسرے

سے پوچھا۔ آپ کی والدہ اپنی شادی سے پہلے کیا تھیں؟ کہا شادی سے پہلے وہ میری والدہ نہیں تھیں اس لیے میں نہیں جانتا۔

دوسرا تھا، ایک بوڑھے سے کسی نے پوچھا تمہارا بچپن کا کوئی خواب جو سچ نکلا ہو؟

بولا "ہاں میری والدہ جب میرے سر کے بال کھینچا کرتیں تو میری خواہش ہوتی کہ کاش یہ نہ ہوتے۔"

چوکچا

چوکچا وہاں وہی مقام رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں میراثی۔ یہ قوم سائبیریا کے علاقے میں رہتی ہے۔ کہتے ہیں سردار چوکچا نے دشمن سے بچنے کے لیے یہ کیا کہ خود ہی اپنی فوج کے ہاتھوں اپنے علاقے کو تباہ کیا اور دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم جاری کیا کہ کسی چیز کو ٹھیک نہ کیا جائے تمام شہر، گاؤں اور سڑکیں تباہ شدہ حالت میں رکھی جائیں تاکہ آئندہ دشمن قبائل ہمارے علاقے میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ وہاں کے مزاح میں چوکچا بہت اہم کردار ہیں۔ اس کا نام آتے ہی چہروں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔

☆

دو چوکچا بیٹھے تھے ایک اوپر دیکھ رہا تھا۔ جہاز دیکھ کر کہنے لگا دیکھو ہماری

گورنمنٹ جارہی ہے۔ دوسرا بولا۔ یہ ہماری گورنمنٹ نہیں اگر یہ ہماری گورنمنٹ ہوتی تو اس کے آگے دو موٹر سائیکل سوار ضرور ہوتے۔

☆

ایک پروفیسر چوکچا کے ساتھ شکار کرنے گیا۔ روسی پروفیسر سے چوکچا نے پوچھا کیا تم بھاگ سکتے ہو؟ اس نے کہا ہاں بہت تیز، اتنے میں ریچھ آ گیا۔ پروفیسر کی طرف ریچھ آیا تو چوکچا نے گولی نہ چلائی اور کہتا رہا بھاگو بھاگو۔ پروفیسر نے خود ہی گھبرا کر گولی چلائی تو چوکچا نے کہا ''ارے پاگل اسے یہاں کیوں مارا اب اسے یہاں سے اٹھا کر گھر کون لے جائے گا۔ تم پر حملہ آور ہوا تھا، تم بھاگتے بھاگتے گھر کے پاس لے جاتے تم کیسے عقل مند ہو؟''

☆

ایک چوکچا نے ائیر پورٹ پر فون کیا اور پوچھا جہاز کتنی دیر میں پہنچے گا؟
ائیر پورٹ آپریٹر نے کہا ایک منٹ پلیز، تو چوکچا نے کہا ایک منٹ، تھینک یو۔

☆

چوکچا فوج سے واپس آیا تو بیوی بہت خوش ہوئی کہ دیکھو ہمارے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ چھ ماہ کا ہے۔ چوکچا نے کہا پر میں تو دو سال بعد فوج سے چھٹی پر آیا ہوں۔

بیوی بولی۔ تو نے مجھے جو تصویر بھیجی تھی میں اسے غور سے دیکھتی رہتی۔ چوکچا مطمئن ہو گیا۔ آدھی رات کو یکدم چوکچا کو کچھ خیال آیا اور بیوی کو اٹھا کر کہنے لگا۔ ''مگر وہ تصویر تو سینے تک کی تھی۔''

☆

چوکچا ہوائی جہاز پر جا رہا تھا۔ کسی نے کہا آپ اگلی سیٹوں پر بیٹھ جائیں۔ کہا نہیں پچھلی سیٹوں پر بیٹھوں گا۔ سب نے زور لگا لیا مگر وہ نہ مانا۔ پھر ایک ائیر ہوسٹس نے آ کر اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ اٹھ کر اگلی سیٹوں پر چلا گیا۔ ائیر ہوسٹس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اسے کیا کہا۔ بولی میں نے کہا تھا آگے والا حصہ پہلے منزل پر پہنچے گا۔

☆

چوکچا پرندوں کا شکار کرنے مچھلی پکڑنے والا لباس پہن کر گیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا۔ میں مچھلی پکڑنے کے لباس میں اس لیے ہوں کہ پرندے سمجھیں گے میں مچھلی پکڑنے آیا ہوں انہیں دھوکے سے پکڑ لوں گا۔

☆

چوکچا نے ٹیکسی ڈرائیور کو کہا بھئی آپ مجھے پانچسو میٹر پیچھے لے جائیں میرے

پاس اتنے پیسے کم نکلے ہیں۔

☆

ایک چوکچا روٹی لینے کے لیے لائن میں لگا تھا۔ بہت لمبی لائن تھی اس کے دوست نے کہا چوکچا عقل لڑاؤ تا کہ ہمیں جلدی روٹی مل سکے۔ چوکچا نے اگلے کے کان میں سرگوشی کی کہ فلاں بازار میں چینی مل رہی ہے جلد ہی وہاں سے بہت سے لوگ جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد چوکچا بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ دوست نے پوچھا۔ تم روٹی لیے بغیر کہا جا رہے ہو؟ کہا بہت سے لوگ چینی لینے جا رہے ہیں مجھے لگتا ہے میں نے جو افواہ اڑائی ہے وہ درست ہے۔ اس لیے میں بھی جا رہا ہوں۔ تا کہ وہاں لمبی لائن لگنے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں۔

اقوال زریں

اقوال زریں تو آپ نے پڑھے ہی ہوں۔ یہ ذرا نچلے درجے کے اقوال ہیں۔ ازبکستان میں دیواروں کا کوئی استعمال نہیں۔ کتوں کے لیے الگ سے پول ہیں۔ یہ قول وہاں کے دیواروں پر لکھنے والے تھے۔ لیکن وہاں لکھنے والے ہمیشہ دیواروں کے پیچھے ہی ہوتے ہیں۔

۱۔ کتا جتنا گیلا اور گندہ ہوتا ہے اتنا آپ سے زیادہ لاڈ کرتا ہے۔

۲۔ جو جتنے بلند خراٹے لیتا ہے وہ اتنا ہی جلد سوتا ہے۔

۳۔ پہنچ والا بندہ وہ ہوتا ہے جس کی وہاں تک پہنچ ہو جہاں اسے کھجلی ہو رہی ہو۔

۴۔ جو تن کپڑے ہوتے ہیں وہ دھونے سے اور تنگ ہو جاتے ہیں اور جو کھلے ہوتے ہیں وہ دھونے سے اور کھلے ہو جاتے ہیں۔

۵۔ جو گرزاسی کو ملتے ہیں جو چل نہ سکے۔

۶۔ ویٹرس ہمیشہ اس وقت آ کر پوچھتی ہے کھانا کیسا ہے؟ جب آپ کے منہ میں لقمہ ہوتا ہے۔

۷۔ آٹھ بچوں کے جوتے خریدنے بازار جانے سے کہیں بہتر ہے کہ محبوب بے وفا نکلے اور یہ نوبت ہی نہ آئے۔

روسوائے زمانہ

روس کی رسوائے زمانہ بلکہ روسوائے زمانہ کے جی بی کو کون نہیں جانتا شاید وہ نہ جانتے ہو جو ڈرنا نہیں جانتے۔ کے جی بی تین حرف جس پر دنیا نے ہمیشہ تین حرف بھیجے۔ اس کا چیف اتنا پڑھا لکھا ہوتا کہ کہتے ہیں کسی نے روسی ڈاکٹر سے پوچھا سگریٹ پینے سے کینسر ہوتا ہے تو اس نے کہا کے جی بی چیف سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ 1917ء سے 1985ء کے دوران پیدا ہونے والے بچے اتنی جلدی بولنا شروع نہ کرتے جتنی جلدی اب ان کے بچے بولنے لگتے ہیں۔ شیخ سعدی کی طرح ہم بھی خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور خدا کے بعد اس سے ڈرتے ہیں جو خدا سے

نہیں ڈرتا۔ کمیونسٹ دور میں لوگ اس ڈر سے خدا سے نہ ڈرتے کہ کے جی بی والے نہ پکڑ لیں۔ خواتین اسی ڈر سے مجازی خدا سے نہ ڈرتیں۔ کمیونسٹ انقلاب میں جو بے گھر ہوئے ان میں خدا بھی تھا۔ کے جی بی والے دوسرے ملکوں سے آنے والے باریش لوگوں کی داڑھیوں کی تلاشی لیتے کہ کہیں اس میں خدا اسمگل کر کے تو نہیں لے جا رہے۔ جب خدا کو گھر نہ ملے تو وہ دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ کے جی بی کے دور میں کسی بیماری سے مرتے نہ دیکھا۔ تندرستی سے مرتے دیکھا۔ اس دور میں جو عقل کی بات کرتا وہ کوئی بے وقوف ہی ہوتا۔ خاموشی عقل مندی کی دلیل ہے۔ یہ کے جی بی کا سلوگن لگتا ہے۔ اگر کے جی بی کا چیف کہہ دیتا کہ میں صبح سات بجے اٹھتا ہوں تو جو صبح ساڑھے چھ بجے اٹھتا وہ چھپ کر اٹھتا۔

سو۔ شل۔ ازم

وہ سوشلسٹ جس میں حس مزاح نہ ہو اسے کمیونسٹ کہتے ہیں۔ سوشلزم کے پانچ اصول تھے:

۱: سوچو مت۔

۲: اگر سوچتے ہو تو بولو مت۔

۳۔ اگر سوچتے ہو اور بولتے بھی ہو تو لکھو مت۔

۴۔ اگر سوچتے ہو، بولتے ہو، لکھتے بھی ہو تو اس پر دستخط مت کرو۔

۵۔ اگر سوچتے ہو، بولتے ہو، لکھتے ہو اور اس پر دستخط بھی کرتے ہو تو پھر حیران

مت ہونا۔

دورعیوبی

جوش ملیح آبادی صاحب دورایوبی کو دورعیوبی کہتے تھے۔ ازبکستان میں بھی آج کل دورعیوبی ہی ہے۔ پہلے علم دولت تھا اب انہیں صرف دولت کا علم ہے۔ ہمارے ہاں گورنمنٹ غریب اورعوام امیر ہیں۔ ازبکستان میں گورنمنٹ امیر اور عوام غریب ہیں۔ اب وہاں ہرطرف عورتیں ''سینہ سپر'' نظر آتی ہیں۔ کمیونسٹ دور میں تو بین کرنے پر بھی بین تھا۔ آج بھی وہاں کے لوگ الیکٹرک ٹرین پر یوں بیٹھے ہوتے ہیں جیسے الیکٹرک چیئر پر بیٹھے ہوں۔ پولیس میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں یہ خامی کیا کم ہے۔ کہ وہ پولیس ہوتی ہے۔ پاکستان میں دورعیوبی میں پولیس کو کمیونسٹوں کو گرفتار کرنے کا حکم ملا۔ ایک پولیس والے نے ایک شخص کو گرفتار کیا تو اس نے کہا۔ جناب میں تو انٹی کمیونسٹ ہوں۔ جس پر پولیس والے نے کہا۔ ہمیں ہر قسم کے کمیونسٹ کو گرفتار کرنے کا حکم ملا ہے۔ کمیونزم کے دور میں متحدہ روس میں کوئی تاریخ کے بارے میں پوچھتا تو دوسرا اس دن کی تاریخ بتا کر چل دیتا۔ نوجوانوں سے تاریخ کا پوچھتے تو وہ ڈیٹ کا بتانے لگتے۔ تاریخ ان کے ہاں گزر گئی جس نے تاریخ کا ذکر کیا وہ بھی گزر گیا۔ اب اس کا ذکر تاریخ ہے۔ وہ تو محبوب کو کے جی بی کے ڈر سے اپنی دنیا نہ کہتے کیونکہ کے جی بی دنیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ایسٹونیا کے عجائب گھر میں کے جی بی کی ساٹھ ہزار فائلیں موجود ہیں۔

بیشتر فائلوں پر یوں فیصلے لکھے ہیں:

تیز رفتار کار ڈرائیونگ پر سزائے موت۔

کار آہستہ چلانے پر سزائے موت۔

ایک روٹی زیادہ لینے پر سزائے موت۔

ایک روٹی کم لینے پر سزائے موت۔

وہاں تو کوئی کے جی بی کو بتائے بغیر مر جاتا تو اسے بھی سزائے موت ہو جاتی۔

آئین اور خوش آئین

ہمارے ہاں آئین اور آئینے کا ایک ہی کام ہے، دیکھنے کے کام آتے ہیں۔ کسی نے پوچھا امریکی آئین اور روسی آئین میں کیا فرق ہے۔ کہا دونوں آزادی اظہار کی ضمانت دیتے ہیں البتہ ایک اظہار کے بعد آزادی کی ضمانت نہیں دیتا۔ کمیونسٹ ممالک وہ ہوتے ہیں جن میں بندے کو اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے کا ہر حق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کوئی حق نہیں ہوتا۔ روسی کمیونسٹ پارٹی نے بچوں کے نام اپنی مرضی سے رکھنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ سب پوچھ کر نام رکھتے۔ کچھ تو یہ بھی پوچھتے کہ بیٹا پیدا کرنا ہے یا بیٹی، کچھ تو بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی کمیونسٹ پارٹی سے پوچھتے کہ ان کے ہاں بیٹا ہوا ہے یا بیٹی۔ کچھ ایسے ہی حالات آج کل کیوبا میں ہیں۔ ایک شخص نے دوسرے کو کہا۔ آج کتنے اچھے پھول کھلے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ وہ بولا۔ میں فیڈرل کاسترو کا شکر ادا کروں گا۔ دوسرے

نے کہا تمہارے ہاں چار سال بعد بچہ پیدا ہوا اس پر تو خدا کا شکر ادا کرو۔ وہ بولا میں پھر بھی فیڈرل کاسترو کا شکر ادا کروں گا۔ پہلا بولا اگر فیڈرل کاسترو مگر گیا تو پھر کس کا شکر ادا کرو گے؟ کہا پھر خدا کا شکر ادا کروں گا۔ آزادی اظہار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ایک ملک کے صحافی کو روس کے سرکار اخبار کے ایڈیٹر کے کمرے میں جانا پڑا تو اس نے میز پر پڑے ایک عجیب سے فون کو اشارہ کر کے پوچھا۔ یہ کیا؟ ٹیلی فون کا صرف ائیر پیس! ماؤتھ پیس کہاں ہے؟ تو روسی صحافی نے بولا "یہ ہماری کریملن سے ڈائریکٹ لائن ہے۔"

ریڈ لائیٹ ایریا

ایک زمانہ تھا وسط ایشیا سرخ اجالے کی وجہ سے ریڈ لائٹ ایریا تھا۔ اب کسی اور وجہ سے ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اپنے آپ پر اتنا ظلم کیا ہو جتنا انہوں نے اپنے آپ پر کیا۔ وہ جنگ عظیم دوم کو مادر وطن کی عظیم جنگ کہتے ہیں۔ اس میں ان کے بعض فوجیوں کے سینوں پر اتنے میڈل لگے کہ دل کے لیے بھی جگہ نہ بچی۔ اگر چہ ایک سیانے نے کہا تھا آپ تین سال کی عمر سے پہلے کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں بنتے یا کمیونسٹ نہیں بنتے۔ تو آپ کے پہلو میں کچھ نہیں ہے اور اگر آپ تیس سال کی عمر کے بعد بھی کمیونسٹ ہیں تو آپ کے سر میں کچھ میں نہیں ہے۔ کچھ کے بقول تو کیمونسٹوں کے نچوڑ کو کمیوزم کہتے ہیں۔ کمیوزم کا نچوڑ یہ ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ ہمسائے کے ساتھ برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔

کچھ کے نزدیک کمیونزم یہ ہے کہ ہمسائے کے پاس جو کچھ ہے اسے آپس میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ ایک اور سیانے کے بقول کمیونسٹ وہ بندہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا کو ساجھی بنانا چاہتا ہے۔ کمیونزم اور جمہوریت میں یہ فرق ہے کمیونزم میں کوئی بولتا نہیں اور جمہوریت میں کوئی سنتا نہیں۔ کہتے ہیں تین سرجن ایک امریکی، ایک انگریز اور ایک روسی ایئرپورٹ پر اتفاقاً مل گئے۔ انگریز نے کہا ہم نے ٹرانسپلانٹ کے فیلڈ میں بڑی ترقی کی۔ ہم نے صرف دل بلکہ اب تو گردہ اور جگر بھی ٹرانسپلانٹ کر سکتے ہیں۔ امریکی نے کہا ہم تو دماغ بدلنے میں لگے ہوئے ہیں۔ روسی سرجن بولا ہم نے بھی ٹانسلز کے آپریشن میں بڑی ترقی کی ہے۔ امریکی سرجن بولا یہ تو آسان آپریشن ہے۔ روسی بولا۔ آسان! آسان آپ کے لی ہوگا ہمارے میں ملک میں تو منہ بند رکھتے ہوئے ٹانسلز کا آپریشن کرنا پڑتا ہے۔ وہاں کا علامتی نشان بیر تھا جسے امریکی پی گئے۔ ہم نے ایک روسی لڑکی سے پوچھا ڈیموکریسی کے سپیلنگ بتاؤ تو اس نے جو بتائے وہ یہ تھے:

''اے ایم ای آر آئی سی اے''

ہمیں وہاں کے ایک کمیونسٹ نے بتایا کہ انگلستان اور امریکہ کے کنڈر گارٹن سکولوں کے بچے جن کھلونوں سے کھیلتے ہیں ہمیشہ ان کو ''میرے کھلونے'' بتاتے ہیں جبکہ یہاں کے کنڈرگارٹن سکول میں بچہ اس طرح محسوس کرتا ہے نہ کہتا وہ کہتا ہے۔ ''ہمارے کھلونے'' انگریزی میں I ہمیشہ بڑے حروف میں ہوتا ہے جبکہ روسی میں اسے چھوٹے حروف میں لکھتے ہیں۔ وہاں ''میں'' میں اتنی میں نہیں ہوتی۔ وہ

صاحب مثالوں سے ہمیں بتاتے رہے کہ پکا کمیونسٹ ہر چیز میں کہتا ہے یہ ہماری ہے۔ اتنے میں ایک عورت آئی تو اس نے تعارف کرایا ''یہ میری بیوی ہے'' ہم نے کہا اس کا مطلب ہے آپ پکے کمیونسٹ نہیں ہیں۔

خرافات خردشیف

خردشیف اور مالینوف نے اپنی یادداشتیں اور یادداشتائیں مرتب کیں تو روس میں انہیں شائع کرنے کی کسی میں جرأت نہ ہوئی۔ یہ مسودہ امریکہ سے چھپا۔ روس میں آپ کو بوڑھے سڑک پر نظر نہیں آتے پوچھا۔ بوڑھے کہا ہوتے ہیں؟ کہا حکومت میں آندروپوف کی وفات سے قبل 1984ء میں پولٹ بیورو کے گیارہ اراکین میں سے چھ ستر برس سے تجاوز کر گئے تھے۔ صرف گورباچوف ساٹھ برس کے تھے جنہیں سب بچہ سمجھ کر بولنے نہ دیتے۔ برژنیف کی وفات کے وقت عمر 75 سال تھی۔ ان کے لیے خود چلنا ملک چلانے سے زیادہ مشکل تھا۔ برژنیف تو صحیح بات کر سکتے تھے لیکن جب چرنینکو نے اقتدار سنبھالا تو وہ اس قابل بھی نہ تھا کہ فوجیوں سے سلامی لے سکے۔ حکومتی رہنماؤں کے جلسوں میں یہ بحث ہوئی کہ خردشیف غلطی نہیں مانتے۔ ایک بار انہوں نے یہ خردشیف کو کہا تو وہ بولے پارٹی کی بیسویں کانفرنس میں میں نے سٹالن کی چند غلطیاں مانی تو تھیں۔ اس کانفرنس میں خردشیف نے سٹالن کی برائیاں کی۔ جلسے میں کسی نے ایک پرچے پر ایک سوال لکھ کر بھیجا تھا ''جب سٹالن یہ سب کچھ کر رہا تھا تو آپ نے کیا کیا؟'' خردشیف چند

لمحے چپ رہا۔ پھر بولا۔ جس نے یہ سوال بھیجا ہے وہ کھڑا ہو جائے۔ خاموشی چھا گئی اور کوئی کھڑا نہ ہوا۔ اس پر خروشیف مسکرایا اور بولا۔ اس وقت میں بھی یہی کیا تھا جو آپ نے کیا ہے۔''

برژنیف کی ڈائری

نیوز ویک نے برژنیف کی ڈائری چھاپی۔ تو ہم نے ایک صحافی سے کہا۔ کسی کی ڈائری پڑھنا تو بری بات ہے۔ وہ بولا۔ نیوز ویک والوں نے پڑھی تو نہیں چھاپی ہی ہے۔ روسی دانشور گوگل نے کہا تھا پہلے روس کے لیے دو مشکلیں تھیں ایک کچے اور تنگ راستے اور دوسرے احمق۔ برژنیف کی ڈائری پڑھ کر لگتا ہے ایک مشکل حل ہو گئی یعنی راستے پکے ہوئے ہیں۔ ڈائری میں ان کی مصروفیات کچھ یوں ہیں۔

"آج کا دن داچا میں گزارا لنچ میں بروسٹ اور ساتھ گوبھی تھی۔ باہر کچھ دیر آرام کیا۔" تو دنیا حیران رہ گئی۔ لیکن 10 اپریل 1977ء کی برژنیف کی ڈائری میں لکھا ہے۔ "شام کی خبریں سنیں۔ کھانا کھایا اور سو گیا۔" برژنیف کھانے کا یوں ہر بار ڈائری میں لکھتا ہے کہ جس دن کا نہیں لکھا لگتا ہے اس دن اسے کھانا ملا ہی نہیں۔ کھانے کے بعد ہمیشہ لکھتے ہیں پھر آرام کیا۔ واقعی وہاں کے کھانے دیکھ کر ہمیں لگا بوڑھا آدمی تو کھاتے ہوئے تھک کر چور ہو جاتا ہوگا۔ برژنیف ہر کام دیر سے کرتے، وہ صدر بھی دیر سے بنے، ان کے خاندان کے اکثر لوگ دیر سے پیدا

ہوئے۔ایک تو اپنے والد کے انتقال کے دو سال بعد پیدا ہوئے۔موصوف نے اپنے ملک کی بھلائی کے لیے جو کچھ کیا ان میں سے ایک انتقال فرمانا بھی تھا۔

گلاسٹنا سٹیلجنا

گلاسٹناسٹ نے انہیں چلانے کی آزادی دی۔جب سے آزادی ملی ہے چلا رہے ہیں۔ہمارے ہاں چلانے کی اتنی آزادی ہےایک بندے نے بچھڑا خریدا جو بڑا باں باں کرتا تھا۔بیوی نے پوچھا یہ کہاں سے خریدا ہے۔بڑی باں باں کرتا ہے۔بولا ''اسمبلی کے چوکیدار سے''۔گلاسٹناسٹ کے بعد ایک صحافی نے روسی ادیب سے پوچھا گلاسٹناسٹ کے بعد آپ سارا دن کیا کیا کہتے ہیں۔بولا یہی کہتا ہوں۔جو کہنا چاہتے ہو کہو۔پرسیٹرائیکا کے بارے میں ایک مزاح نگار لکھتا ہےہم پہلے کرتے ہیں پھر سوچتے ہیں افکار دماغ میں آنے سے پہلے سارے جسم میں گھومتے رہتے ہیں پھر دماغ میں آتے ہیں۔پرسیٹرائیکا بھی اسی طرح پھر رہی ہے۔ہم نے وہاں کے ایک بوڑھے ڈرائیور سے پوچھا ''آپ روس کے مختلف ادوار کے سفر کا بتائیں؟بولا ''لینن کا دور میٹرو کی طرح تھا تیزی سے جا رہے تھے۔کچھ پتہ نہ چلتا کدھر جا رہے ہیں۔سٹالن کا دور ٹرام کی طرح تھا کچھ بیٹھے تھے کچھ لٹک رہے تھے۔یاد رہے ان کے ہاں بیٹھنے سے مراد جیل جانا بھی ہے۔'' اور گورباچوف کا دور؟ ہم نے پوچھا۔بولا ٹیکسی کی طرح تھا جتنا آگے بڑھتے جاتے ،اتنا کرایہ بڑھتا جاتا''۔

فوارے نیارے

پھولوں کے شہر تاشقند میں رہ کر ہم بھی پھول گئے۔ وہاں پھول اتنے زیادہ اور خوب صورت ہوتے ہیں کہ پتہ نہ چلتا اصلی پھول میز پر ہیں یا کرسی پر۔ وہاں خواتین موسم کے حساب سے لباس تبدیل نہیں کرتیں۔ لباس کے حساب سے موسم تبدیل کرتیں۔ لڑکیاں منی سکرٹ پہنتی ہیں۔ یہ وہی لباس ہے جو ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں کی طرح ہوتا ہے۔ جہاں سے مرضی شروع ہو کر کہیں اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی ازبک لباس میں نظر آئے تو سمجھتے ہیں کسی ڈرامے کے لیے گٹ اپ کیا ہوا ہے۔ وہاں ہر سڑک کے کنارے خوشی اور پانی کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا جوڑے درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوں گے۔ وہاں جوڑوں کی اوٹ میں درخت چھپے ہوئے تھے۔ قدرتی مناظر میں سے ہمیں جو منظر بھاتا اگلے ہی لمحے کوئی لڑکا ہمارا منظر بغل میں لیے ہوئے پس منظر ہو رہا ہوتا۔ وہاں کے گاؤں میں بھی وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جو شہروں میں میسر نہیں۔ ہم نے داچہ کے قریبی دیہات کے ایک بابے سے پوچھا دیہات کی زندگی شہر کی زندگی سے بہتر ہے فضا آلودہ نہیں ہوتی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ تو وہ بولا میں صحیح طور پر کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں تو شروع سے اسی شہر میں رہا ہوں۔'' البتہ یہ پتہ چلا کہ شہروں میں جرائم گاؤں کی نسبت زیادہ ہیں۔ آدھی رات کو تاشقند کی سڑک پر ایک شخص نے ایک سیاح کو کہا۔ ''اگر آپ مجھے سو روبل دیں گے تو آپ ایک باعزت شخص کی زندگی بچا سکتے ہیں۔'' سیاح نے اسے دیکھ کر کہا ''معافی چاہتا ہوں آپ

اتنی عزت والے لگتے تو نہیں۔'' اس نے کہا ''میں جانتا ہوں مگر آپ کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔''

بھول۔چوک

دنیا میں جتنی دیوانگیاں عقل مندوں نے کی ہیں دیوانوں نے نہیں کیں۔ہم ڈاکٹر تاش مرزا کے گھر سے رات کا کھانا کر نکلے اور بھٹک گئے۔ہمیں اتنا یقین تھا کہ ہم غلط راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ اس راستے پر چلنے میں مزا آ رہا تھا۔راستہ یاد ہو تو بندہ شہر کو دیکھتا ہے اور راستہ بھول جائے تو شہر بندے کو دیکھتا ہے۔راستہ بھولنے کے لیے بڑا حافظہ چاہیے۔اردو شاعر ہمیشہ راستہ بھول کر محبوب کے کوچے کوچ کر جاتے۔گورا صاحب نے پوچھا ''میرے تیز چلنے کی وجہ سے آپ کو پریشانی تو نہیں ہو رہی۔'' ہم نے کہا پریشانی تو ہو رہی ہے مگر اپنے تیز چلنے کی وجہ سے۔'' ویسے تنگ جوتے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں کہ جوتے لگتے ہوں تو بندے کو دوسری تمام تکلیفیں بھول جاتی ہیں۔ہم نے تو سنا تھا پرانی بیوی اور نیا جوتا کاٹتا ہے یہاں جوتا پرانا تھا۔ہوٹل تاشقند کی تلاش میں سنسان سڑکوں پر ہمارے پاؤں چل رہے تھے یا ہماری سانسیں۔آدمی جتنا مرضی تیز چل لے اپنے آپ سے آگے نہیں جا سکتا۔پھر بندہ وہی چیز پاتا ہے جس کی وہ تلاش نہیں کر رہا ہوتا۔ہاں جو شخص جس کی تلاش کر رہا ہو وہ وہی پائے تو اسے پروف ریڈر کہتے ہیں۔ہم نے ایک ازبک سے پوچھا ہم سے ہوٹل تاشقند گم ہو گیا ہے۔اس نے ہمیں ایسے دیکھا

جیسے ہماری غلطی سے ان کا اتنا بڑا ہوٹل گم ہو گیا ہو۔ ہم نے بذریعہ گورا صاحب وضاحت کی کہ ہم گم ہوئے ہیں۔ اس نے کہا آپ یہاں سے پیدل چلیں تو آدھ گھنٹے میں ہوٹل تاشقند پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کی رفتار اسی میل فی گھنٹہ ہو۔

میڈم ڈم

اداکار انجمن اتنی بڑی ہیں کہ لکھتے وقت دو دفعہ انجمن لکھنا پڑتا ہے وہ کیسی ہو گی جسے بلانے کے لیے تین بار میڈم کہنا پڑے۔ افواہ کی طرح پھیلی ہوئی، وہ ہوٹل میں ہمارے فلور کی انچارج تھی۔ اور اس کا لباس اور سٹاف تنگ ہی رہتا۔ وہ جا کر کسی بیکری پر کہتی کہ مجھے پندرہ دہی کی بوتلیں چاہئیں تو بیکری والا پوچھتا ''یہاں کھائیں گی یا پیک کر دوں''۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ کہنے لگی ''بیس سال پہلے جیسی میری فگر تھی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' اس کے بچے چھوٹے تھے اور خاوند بڑے۔ خاوند سے ان بن تھی جس میں ان زیادہ اور بن کم تھی۔ ایک دفعہ خاوند کو ایک ماڈل کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر ماڈل کو کہا۔ تمہیں شرم آنا چاہیے اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو کسی کے خاوند سے ایسی واہیات حرکت نہ کرتی۔ اس کا خاوند بولا۔ اگر تم اس کی جگہ ہوتی تو میں بھی ایسی واہیات حرکت نہ کرتا۔ اس نے بتایا کہ شادی سے پہلے خاوند مجھے کہتا مجھے چاروں طرف تم ہی تم نظر آتی ہو۔ اب کہتا ہے میں تو اس لیے کہتا تھا کہ تم موٹی بہت ہو۔ اس کے لباس اور کمرے کے دروازے کو دیکھ کر بندہ یہی سوچتا کہ یہ ان میں داخل کیسے ہوئی؟ کہنے لگی میں

بچے اکیلے گھر چھوڑ کر آتی ہوں۔ رات کو ہمارے ہاں بچوں کو اکیلے سلانا بہت مشکل ہے خاص کر کے جب بچے بیس سال کے ہو جائیں۔

خان وخون

وہاں عورت کو خان کہتے ہیں مرد کو جان۔ اس لیے وہاں ہمیں مردوں کو جان کہہ کر بلانا پڑتا جو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہمارے ساتھ کوئی خان نہیں تھا ورنہ خان وخون ہو جانا تھا۔ البتہ ہمیں یہ سمجھ نہیں آئی کہ دادا خان نوری خود کو خان کیوں کہلواتا ہے۔ اس کی مخفی صلاحیتیں ہم سے مخفی رہیں۔ رات کو میڈم سے بڑی باتیں ہوتیں جو وہ خاموشی سے کرتی رہی۔ ایک رات اس نے میرا کارٹون بنایا حالانکہ میں کہہ رہا تھا اس نے میری تصویر بنائی ہے۔ بہر حال اس نے کہا میرا بھی کارٹون بناؤ۔ انے ایک بڑا صفحہ مجھے دیا سوچا تو اس نے پوچھا بنا کیوں نہیں رہے؟ ہم نے کہا "آپ کا کارٹون بنانے کے لیے کاغذ چھوٹا ہے۔" اس نے کہا چلو چھوٹا سا بچہ بنا دو۔ ہم نے تھوڑا سا بنایا اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس نے روسی میں کچھ دیر باتیں کیں اور ہنستی ہوئی بتانے لگی میری سہیلی پوچھ رہی تھی کیا کر رہی ہو؟ میں نے کہا ہم بچہ بنا رہے ہیں۔ تو میری سہیلی بولی: اچھا ہوا تم نے اپنے خاوند سے صلح کر لی۔

WORLD ORDER

دنیا کے بارے میں ایک تھیوری آج کل نیم سائنسی حلقوں میں بہت مشہور

ہے جس کے مطابق دنیا کے اتنے حصے کیے جا سکتے تھے جتنے انسانی جسم کے ہیں۔ اس میں الاسکا اس کے بال ہیں۔ امریکہ اس کے مسلز ہیں ۔ یورپ دماغ، آسٹریلیا اس کی کمر بلکہ اس کے سائز اور جائے وقوی کی بنا پر اسے دنیا کے کولہے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حساب سے نیوزی لینڈ کیا ہوا جو آسٹریلیا سے نیچے واقع ہے۔ سنا ہے اس پر نیوزی لینڈ کے لوگ شرمندہ ہیں۔ ایشیا اس کا سینہ ہے اور وسط ایشیا کیا ہوا آپ جان ہی گئے ہوں گے۔ کیونکہ دنیا مونث ہے ہم کئی دن دنیا کے سینے سے لگے رہے۔ دنیا مونث ہے شاید اسی لیے لوگ اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ ہماری اداکارہ انجمن نے ایک بار کہا کہ میرا خاوند مجھے اپنی دنیا کہتا ہے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہی کہتا ہے واقعی دنیا بہت بڑی ہے۔

میٹرو ملن

ہم گورا صاحب کے ساتھ میٹرو میں جا رہے تھے۔ پاکستانی نوجوان اتنے مہذب ہیں کہ کوئی خاتون نظر آئے تو اسے اٹھ کر اپنی سیٹ دیتے ہیں۔ خاص کر کے اس وقت جب بوگی میں کوئی اور نہ ہو۔ ہم نے دو نوجوان دیکھے جو اس بوگی میں ایسے ہی لگ رہے تھے جیسے نیک دل میں برا خیال۔ وہ ہمیں پہچان کے ہمارے پاس آئے اور کہا ''ہم نے آپ کی کتابیں کسی سے لے کر پڑھی ہیں'' اتنی عزت سے پیش آئے کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ انہوں نے کتابیں پڑھی نہیں۔ دونوں انڈین تھے ایک کا نام کمار تھا اور دوسرے کا ہمیں یاد نہیں۔ مردانہ ناموں میں یہی

خرابی ہے کہ ہمیں جلد بھول جاتے ہیں۔اس نے بتایا کہ غیر ممالک میں کام کرنے والوں کو اپنی خیریت سے لواحقین کو آگاہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب تک وہ منی آرڈر بھیجتے رہیں وہ بخیریت ہیں اگر نہ بھیجیں تو پھر سمجھ لیں لواحقین بخیریت نہیں ہیں۔کمار نے ہمیں نصیحت کی کہ اپنے ڈاکومنٹس کسی ایسی جگہ پر رکھیں جہاں آپ کی بار بار نظر پڑتی رہے۔ہم نے کہا اس حساب سے تو ہمیں ڈاکومنٹ اپنی پاکٹ کی بجائے سامنے والی لڑکی کی فرنٹ پاکٹ میں رکھنے چاہئیں۔ہم نے پوچھا ''سنا ہے اب یہاں فری سیکس ہے'' بولا ''نہیں کمیونزم کے دور میں تھا اب تو پیسے لگتے ہیں''اس نے بتایا وہ یہاں وظیفے پر پڑھنے آیا تھا۔اب حکومت نے وظیفہ بند کر دیا ہے۔اب تو میں ہی روز وظیفہ ادا کرتا ہوں۔لمحہ بھر چپ رہنے کے بعد بولے۔ ''میں نے یہاں کی لڑکی سے شادی جو کر لی ہے۔''

UNIVER- CITY

متحدہ روس کے وقت سکول میں 66 زبانوں کی تعلیم دی جاتی۔والدین مرضی سے بچے کے لیے زبان کا انتخاب کرتے۔یہ 66 زبانیں زیادہ تر چپ رہنے کے لیے استعمال ہوتیں۔بچوں کو یونین میں شامل تمام ریاستوں کا جغرافیہ پڑھایا جاتا۔سکول کے بچے ازبکستان آزاد ہونے پر اتنے خوش کیوں ہیں؟ اس کا اندازہ آپ کو ہو ہی گیا ہوگا جن بچوں کی صحت ٹھیک نہ ہوتی انہیں شہر سے باہر ''جنگلاتی سکول'' میں بھیج دیا جاتا۔بچے اسی ڈر سے دبلے ہوتے رہتے کہ وہ دبلے ہو رہے

ہیں۔ تعلیم و تربیت میں وہ تربیت پر زیادہ توجہ دیتے، اس لیے ان کے تعلیمی اداروں سے اتنے تعلیم یافتہ لوگ نہ نکلتے جتنے تربیت یافتہ۔ وہاں سو فیصد خواندگی ہے وہاں کے جاہل بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارے ایک صاحب وہاں گئے اور کہا آپ کو نہیں پتہ میں کس سکول کا پڑھا ہوا ہوں؟ پوچھا کس سکول کے پڑھے ہوئے ہیں؟ کہا پرائمری سکول کا، انہوں نے کہا آپ کو ہمارے ہاں کوئی نوکری نہیں مل سکتی۔ کہا مجھے نوکری کی ضرورت نہیں میں صوبائی وزیر محنت وافرادی قوت ہوں۔

ماسکو یونیورسٹی روس شہر سے دور ایک بڑے شہر کی حیثیت رکھتی ہے اس کی وسعت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اگر ایک شخص یونیورسٹی کی عمارت میں پیدا ہوا اور ہر کمرے میں رات بسر کرے اور 109 برس کی عمر پائے تب بھی وہ یونیورسٹی سے باہر نہ نکل سکے گا۔ اسے یونیورسٹی سے نکلنے کے لیے 110 سال کی عمر چاہیے۔ اتنی عمر میں تو بندے کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ یونیورسٹی سے نکل رہا ہے یا داخل ہو رہا ہے۔ ویسے ہمارے ہاں تو یونیورسٹی سے نکلنا مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ مینٹل ہسپتال اور یونیورسٹی میں یہ فرق ہے کہ مینٹل ہسپتال سے نکلنے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ آپ کی ذہنی حالت ٹھیک ہو گئی ہے۔

وہاں کے ادارے محبت گاہیں ہیں۔ وہاں کوئی کسی کو گولی یا چھری نہیں مارتا ایسے موقعوں پر بھی آنکھ ہی مارتے ہیں۔ سیاح بھی اسی مقصد کے لیے وہاں کے تعلیمی اداروں میں جاتے ہیں۔ جس مقصد کے لیے ''بازاروں'' میں جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سو فیصد خواندگی اور دس فیصد خاوندگی ہے۔ عمار وہاں میڈیکل کا طالب علم ہے۔ کہا ''ہمیشہ اول آتا ہوں۔ بس ہندوستان اور یہاں میں یہ فرق ہے کہ ہندوستان میں پاس ہونے والوں میں اول آتا۔ یہاں ایک بار فیل بھی ہوا۔'' پوچھا کتنے نمبروں سے فیل ہوئے۔ بولا بیس ڈالر سے، میں تیس ڈالر دے رہا تھا۔ ممتحن پچاس ڈالر مانگتا تھا۔ استادوں کی تنخواہ اتنی کم ہے کہ ہمارے ہاں جتنے میں ایک کتاب ملتی ہے یہاں اتنے میں ایک صاحب کتاب مل جاتا ہے۔ امتحان کی ڈیٹ شیٹ یوں طلبا اپنی مرضی سے طے کرتے ہیں جیسے ڈیٹ طے کر رہے ہوں۔ پانچ نمبروں کا امتحان ہوتا ہے۔ تین سے کم ہوں تو فیل۔ پوچھا، عمار آپ چار سال سے یہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں آ کر کیا نئی چیز سیکھی؟ کہا یہاں کی زبان سیکھی۔ پوچھا، یہاں کا معیار تعلیم کتنا بلند ہے؟ کھڑے ہو کر بولے۔ میرے قد سے کوئی دو انچ زیادہ بلند ہے۔ طالب علم چیزیں بیچ کر گزارا کرتے ہیں۔ تاشقند میں روسی سکولوں کا معیار ازبک سکولوں سے بہتر ہے۔ جس کی وجہ نگار مرزائف نے یہ بتائی کہ روسی سکول میں ازبک استاد نہیں ہیں اور ازبک سکولوں میں روسی استاد نہیں ہیں۔ وہاں مولا بخش Educational Aid کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔ بھوٹان میں یو این او کے رضا کار سکول ٹیچر نے ایک بار آئر لینڈ سے ماؤس ٹریپ منگوایا چونکہ وہاں چوہے بہت ہو گئے تھے لیکن

کسٹم ڈیکلیریشن فارم میں یہ لکھا گیا ''ماؤس ٹرپ ایجوکیشنل ایڈ یعنی چوہوں کو سبق سکھانے کے لیے''۔ کمار نے بتایا کہ کلاس میٹ سے مراد ہے With whom you mate in class انڈین طلباء کلاس میں نہیں ہوتے جس کی وجہ کمار نے یہ بتائی کہ ساتھ لڑکی بیٹھی ہوتی ہے اور لڑکی کے ساتھ سونا بری بات ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں لسی نہیں ملتی۔ بہر حال گائی کی کلاس میں جاگتے رہنے کے لیے میں یہ کرتا ہوں کہ کلاس میں جانے سے پہلے اپنے کنٹیکٹ لینس برف والے پانی میں دھولیتا ہوں۔ گرلز ہوسٹل میں جاجا کر لباس کا خیال رکھنے لگا ہوں۔ لباس پہنتا امریکیوں ی طرح ہوں مگر اتارتا روسیوں کی طرح ہوں۔

غیر مطلقہ باتیں

ہم نے کمار سے کہا ''روسی اور ازبک مزاح پڑھ کر پتہ چلا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ کمار بولا ''مجھے یہ پڑھنے سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔'' پوچھا کیسے؟ بولا میں نے ایک روسی لڑکی سے شادی کی ہے۔ کہنے لگا۔ یہاں شادیاں جلد ہو جاتی ہیں جس کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ پوچھا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ بولا طلاق ہونے تک لڑکیاں سمجھدار ہو جاتی ہیں اور ان میں خود اعتمادی آ جاتی ہے تاکہ ہر قسم کے حالات کے لیے ''سینہ سپر'' ہو سکیں۔ عرض کیا ''صندل کی لکڑی سر سے رگڑنے سے سر درد ختم تو ہو جاتا ہے لیکن اسے رگڑنا بھی تو ایک سر درد ہے۔ کمار نے بتایا یونیورسٹی میں پتہ نہیں چلتا کون سی لڑکی زیادہ خوب صورت

ہے۔ البتہ ہوٹلوں میں فوراً پتہ چل جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا آپ کو کون سی تین چیزیں پسند ہیں۔''

بولا ''پہلی سونا''۔

دوسری؟

''مونا''۔

تیسری؟

''مونا کے ساتھ سونا''۔

H to H

کمار کے ساتھ اس کا ایک دوست شام کو ملنے آیا۔ ہم نے نام پوچھا بولا ''شام'' عرض کیا ہم وقت نہیں پوچھ رہے ہیں؟ پتہ چلا شام کا بمبئی میں اتنا بڑا گھر ہے کہ کئی کئی دن تک ان ی والدہ ان کے والد کو ڈھونڈ نہیں پاتیں۔ وہ کیمسٹری میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے یہاں آیا تھا۔ کیمسٹری سے ہمارا اتنا سا تعارف ہے کہ ٹیچر نے ہم سے ایک بار پانی کا فارمولا پوچھا تو ہم نے بتایا ''H-I-J-K-L-M-N-O'' ٹیچر نے کہا۔ یہ غلط ہے۔ عرض کیا۔ آپ نے خود ہی تو بتایا ہے پانی کا فارمولا H to O ہے۔ ان دنوں ہم نے بہت زیادہ قریب ہونے کا کیمسٹری کے حساب سے یہ فارمولا بنایا تھا۔ UR 2 CLOSE□ شام نے بتایا اس نے ایک جگہ نوکری کی مگر پھر چھوڑ دی۔ اس نوکری میں ترقی کے

مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ کمار نے یہ ٹھیک کہتا ہے اس کے باس کی بیٹی پہلے سے ہی شادی شدہ تھی۔ یہ دونوں ہمیں زرافشاں بازار لے جانے کے لیے آئے تھے۔

زن افشاں

زرافشاں بازار ہمیں زن افشاں بازار لگا۔ اتنی زیادہ لڑکیاں اتنے کم کپڑوں میں گزارہ کیسے کر لیتی ہیں۔ یہاں آئے بغیر یقین نہیں آتا، اسے زرافشاں شاید اس لیے کہتے ہیں کہ جس کے پاس زر ہے اس کے لیے یہ بازار افشا ہو جاتا ہے۔ اس بازار کے بارے میں باب ہوپ نے ایک بار کہا تھا کہ میرے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو روسیوں نے زار کے ساتھ کیا تھا اور آپ کو پتہ ہی ہے انہوں نے زار کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اس بازار کو دیکھنے کے لیے چار آنکھیں چاہئیں۔ دو آگے اور دو پیچھے۔ کبھی کبھی وہاں آنکھیں چار ہوتی بھی ہیں۔ شام نے کہا۔ دو آنکھیں لڑکی کو آتے دیکھنے کے لیے اور دو جاتا دیکھنے کے لیے چاہئیں۔ وہ لڑکی اتنی دور تک آتی نہ دیکھتے جتنی دور تک جاتی دیکھتے۔ ایک پاس سے گزرتی لڑکی کے بارے میں کمار نے کہا۔ یہ یہاں کی ابھرتی ہوئی اداکارہ ہے وہ ہمیں ہر طرف سے ابھرتی ہوئی لگ رہی تھی۔ فرانسیسی عورتوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ فرانسیسی مزاح نگار لکھتا ہے۔ میری بیوی نے ایک پولیس والے سے کہا۔ آپ دیکھ نہیں رہے وہ مرد میرا پیچھا کر رہا ہے۔ تو پولیس والا بولا میں ڈیوٹی پر ہوں وہ کچھ نہیں کر

سکتا جو وہ کر رہا ہے۔ وہاں کی عورتیں بڑی بات کو چھوٹی کر کے بتاتی ہیں۔ ہماری عورتیں چھوٹی بات کو بڑا کر کے بتاتی ہیں۔ ازبک ایک نظر میں لڑکی کو آخر تک دیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ فرانسیسی ایک نظر میں اسے شروع تک دیکھ لیتے ہیں۔ اور جبکہ پاکستانی پہلے ایک اچٹتی نظر پھر چمٹتی نظر ڈالتے ہیں پھر تھوڑی دیر بعد محسوس ہوتا ہے وہ اسی طرف جا رہے ہیں، جس طرف لڑکی جا رہی ہے۔

Poortrait

زرافشاں بازار میں کرسیوں پر پینٹر یوں بیٹھے ہوتے ہیں جیسے کرسیوں پر پینٹ کیے ہوئے ہیں۔ جیسے ٹیکسی ڈرائیور ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ہر جگہ پینٹر دیکھنے میں ایک سے ہوتے ہیں۔ پینٹر بننے کے لیے کیا چاہیے؟ چند ماہ دھوبی، نائی اور نہائی سے پرہیز۔ ایک پینٹر کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی تھا جسے دیکھ کر لگا کہ وہ محنت سے صرف پینٹنگز ہی بناتے ہیں باقی کام نیم دلی سے کرتے ہیں۔ ان کی پینٹنگز دیکھ کر وہی محسوس ہوا جو ایک فرانسیسی صدر نے تجریدی مصوری کی پیرس میں ہونے والی نمائش پر کہا۔ کسی نے پوچھا "آپ کو ان تصویروں کی سمجھ آئی۔" تو اس نے کہا "یہ سمجھنے میں میری ساری عمر لگ گئی کہ ہر چیز سمجھنا ضروری نہیں ہوتا" یہ گزرنے والوں کے پورٹریٹ بنا کر انہیں خوش کرتے۔ وہاں کپڑے اتنے مہنگے ہیں کہ جس لڑکی کی تصویر کو کپڑے پہنا دو وہ یوں خوش ہوتی ہے جیسے ہمارے ہاں زیور پہنانے پر۔ کارنیلس وان ڈونگین فرانس کے کامیاب ترین مصور

نے کہا تھا میں نے اپنا فارمولا بنایا ہے کہ میں عورتوں کی پینٹنگز ایسی بناتا ہوں جس میں عورتیں اس سے پتلی ہوتی ہیں جتنی وہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے جواہرات اس سے موٹے جتنے کہ وہ ہوتے ہیں۔ ایک مصور سے ہم نے بھی اپنا portrait بنوایا تو وہ ہمیں poor trait لگا۔ ہم نے کہا آپ نے جو تصویر بنائی وہ عورتوں سے ملتی ہیں۔ میں تو عورتوں سے ملتا ہوں مگر میری تصویر یا شکل ان سے ہرگز نہیں ملتی۔ مار کے بقول اس نے کہا ''میں انسان کے اندر کی تصویر بناتا ہوں'' یہ سن کر ہمیں ایک بزرگ سنگ تراش یاد آ گئے جو جب بھی مجسمہ بناتے عورت کا ہوتا۔ کسی نے آخر کہہ ہی دیا کہ آپ عورتوں کے مجسمے ہی کیوں بناتے ہیں؟ بولے ''ہر پتھر میں ایک عورت قید ہے۔ میں تو صرف اسے پتھروں سے باہر نکالتا ہوں۔ دل چاہتا ہے ہر پتھر سے اس خفیفہ کو ظاہر کر دوں''۔ آخری عمر میں وہ پہاڑوں کی طرف چلے گئے جیسے ہزاروں عورتیں پتھروں سے نکلنے کے لیے انہیں مدد کے لیے پکار رہی ہوں۔ سو ہم نے بقایا عورتوں کو اپنے اندر ہی رہنے دیا۔ ورنہ وہ چند ڈالر میں ہماری اندر کی ساری عورتیں کینوس پر نکالنے کو تیار تھا۔ ہمیں پہلی بار پتہ چلا ہمارے اندر اتنی بدصورت عورت چھپی ہوئی ہے۔ بہرحال اس کی شکل دیکھ کر اس کے چھپنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

زرافشاں بازار میں جو بھی زن راہ میں ملی راہزن ملی۔قریبی ریستوران میں لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔کمار نے کہا۔رقص کرنے والی لڑکیوں نے کچھ نہیں پہنا ہوتا۔لیکن ان دونوں لڑکیوں نے پہنا ہوا تھا۔ایک نے عینک اور دوسری نے فل بوٹ۔جان گینتھر امریکی صحافی لکھتا ہے۔"ماسکو وہ شہر ہے اگر مارلن منرو بھی وہاں کی گلی سے یوں گزرے کہ اس نے کچھ نہ پہنا ہو سوائے جوتوں کے،تو لوگ سب سے پہلے اس کے پاؤں کی طرف دیکھیں گے۔"رقص کے بعد کمار نے بڑی تعریف کی اور کہا ایسے جوتے اور عینکیں اب کہاں ملتی ہیں! اس حصے میں جو آرٹسٹ زنانہ پینٹنگز بنا رہے تھے ان کی پینٹنگز نے صرف رنگ ہی پہنے ہوئے تھے۔اصل آرٹسٹ وہ ہوتا ہے جسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس کی پینٹنگ بنا رہا تھا اور کس کی بن گئی۔کئی پینٹنگز تو لڑکوں کی باہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہی تھیں۔ ان میں سے ایک معروف پینٹر بھی تھا جس کی کئی بار نمائش ہو چکی تھیں۔کہتے ہیں اس آرٹسٹ نے ایک بار آرٹ گیلری کے انچارج سے پوچھا۔کسی نے پینٹنگز خریدنے میں دلچسپی لی؟ انچارج نے کہا میرے پاس آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بڑی،اچھی خبر یہ ہے کہ جب میں نے اپنے کلائنٹس سے یہ کہا کہ اس آرٹسٹ کے کام کی مرنے کے بعد بڑی قدر ہوگی جو پینٹنگ ہزار سوموں میں مل رہی ہے لاکھوں میں ملے گی تو ایک شخص نے سب پینٹنگز خرید لیں اور بری خبر یہ ہے کہ میرا یہ کلائنٹ آپ کا معالج ہے۔"

جملہ تیموریہ

زرافشاں بازار کے سامنے ایک پارک ہے جس کے سامنے ازبکستان ہوٹل ہے۔ پہلے یہاں لینن کا مجسمہ نصب تھا۔ اب وہاں ازبکیوں نے اپنا نسب نصب کیا ہے یعنی تیمور کا مجسمہ۔ تیمور کو اس طرح گھوڑے پر سوار کیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ گھوڑا ہی نظر آئے تیمور چار ٹانگوں پر چلتا۔ اس کے آبا ؤاجداد بھی گھوڑے پر پیدا ہوئے اسی پر فوت ہوئے۔ صرف شادی کرنے کے لیے گھوڑے سے اترتے۔ ہمارے ہاں تو صرف شادی کرنے کے لیے گھوڑے پر چڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک بار ایک اندھی عورت جس کا نام محبت خانم تھا تیمور کے پاس لائی گئی۔ تیمور نے کہا۔ ”سنا ہے محبت اندھی ہے“۔ تو وہ بولی۔ ”اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس کیوں آتی؟“ ہمارے جوش صاحب کا بھی ہر جملہ جملہ تیموریہ ہوتا ہے یعنی لنگڑا اور حملہ آور۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے وہ ساتھ ہوتے تو ہم انہیں بہت مس کرتے۔ امیر تیمور نے وہاں 35 سال حکومت کی۔ وہ دنیا میں جیسا دیکھتا ویسا ہی سمرقند میں آکر بنواتا۔ ایک ملک میں اس نے خوب صورت بادل دیکھا تو کہا ”سمرقند میں ایسا بادل ہونا چاہیے۔“ اسے پھولوں سے عشق تھا۔ جس سے اسے عشق ہوتا وہ بھی پھول جاتے۔ سندھی کہاوت ہے ایک ٹانگ والوں کے دیس میں جاؤ تو اپنی ایک ٹانگ کاندھے پر رکھ لو۔ کانوں والوں کے دیس میں جاؤ تو ایک آنکھ بند کر لو اور اگر آنکھوں والوں کے دیس میں جاؤ تو دونوں آنکھیں بند کر لو۔ البتہ اندھوں کے دیس میں جاؤ تو دونوں آنکھیں کھلی رکھو۔ ہمیں ازبکستان کی

معیشت تیمور کی طرح چلتی نظر آئی ۔کمار نے کہا ”یہ امیر تیمور کا مجسمہ ہے ۔“ آج کل جو اس آزاد ملک میں دیکھ رہے ہو، اس کی بدولت ہے ۔تو پاس کھڑے شام نے کہا ”سارا الزام ایک شخص کے سر ڈال دینا زیادتی کی بات ہے ۔“

اطلس و کمخواب

ہم نے کمار سے وہاں کی عورتوں کے لباس کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا ”پہنتی ہیں“ اطلس کے کپڑے ، ازبکوں کو بہت پسند ہیں ۔کمخواب شاید اس لیے پسند نہیں کہ اسے پہن کر کم ۔خواب آتے ہیں ۔سفر میں اچھا ساتھی آپ کے لیے آرام دہ سواری کی طرح ہوتا ہے اور برا ساتھی سوار کی طرح ۔ہم اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ بازار گئے ۔ہماری دکانوں پر لکھا ہوتا ہے آپ کی جو ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے مگر ان کی دکانوں پر یہ پڑھا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس جو ہے وہ آپ کی ضرورت ہے ۔ایک زمانہ تھا وہاں پر کوئی لاکھ پتی ہونے کی خواہش کرتا تھا۔اب تو وہاں ہر کوئی لاکھ پتی ہے ۔مہنگائی کا یہ حال ہے کہ لاکھ پتی بیوی کے لیے ایک اچھا سوٹ خریدنے جائے تو واپسی پر وہ صرف پتی ہی ہوتا ہے ۔اطلس کے کپڑے کے بارے میں وہاں ایک روایت ہے کہ ایک جولاہے کی بیٹی کو امیر اطلس نے اغوا کر لیا اور اس شرط پر لوٹانے کے لیے تیار ہوا کہ وہ اس کی بجائے اسے پہننے کو کچھ اور دے دے مگر کپڑا ایسا نایاب ہو کہ کسی نے دیکھا ہو نہ سنا ۔جولاہا جو بھی کپڑا بُن کر لاتا امیر اسے ناپسند کر دیتا۔ایک دن جولاہا تھک ہار کر

تالاب کے کنارے بیٹھا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس نے سورج کی شعاعوں کو پانی میں منعکس ہوتے دیکھا۔ ان منعکس شدہ شعاعوں میں سورج کی روشنی کے ساتوں رنگ علیحدہ علیحدہ دکھ رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ اس جیسا کپڑا بننے میں جت گیا اور ریشم سے ایسا کپڑا تیار کر کے امیر کے پاس لے گیا جو امیر اطلس کو اتنا پسند آیا کہ اس نے جولاہے کی بیٹی واپس کر دی اور حکم دیا کہ آئندہ یہ کپڑا صرف امیر اطلس ہی پہن سکیں گے۔ یوں آج وہاں کی ہر خاتون امیر اطلس ہی لگتی ہے۔ اب اس سے جولاہے اپنے بیٹے واپس لینے آتے ہیں۔ یہ روایت ضعیف نہیں کیونکہ اسے سنانے والا جوان تھا۔

سیکرٹ سروس

ہم وہاں کی سیکرٹ سروس اور سیکرٹ سروس کے ہمیشہ مداح رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو چادر سے باہر پاؤں پھیلانا غریبی کی بجائے عریانی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن ہم نے وہاں کے امیر گھرانے کی تین لڑکیوں کو دو سوٹوں میں ملبوس دیکھا۔ ان کی سیکرٹ سروس کے کیا کہنے۔ روس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ہال کے سامنے تمام شہری لائن میں کھڑے تھے۔ ہر ایک کو ایک بند لفافہ دیا گیا اور کہا گیا کہ اسے بیلٹ بکس میں ڈال دو۔ ایک بندے نے لفافہ لیا اور اسے کھولنے لگا۔ تو اسے فوراً افسران نے گھیر لیا اور کہا کامریڈ یہ کیا کر رہے ہو تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ یہ خفیہ رائے شماری ہے۔ لیکن روسیوں کا لباس ایسا ہے کہ کچھ خفیہ نہ

رہے! شب خوابی کا لباس تو ہمارے لیے کم خوابی کا لباس بن جاتا ہے۔ پولیس کی ٹوپیاں اور وردیاں ایسی لگتی ہیں جیسی ہمارے ہاں باجے بجانے والوں کی ہوتی ہیں۔ آج کل ان کا کام بھی یہی رہ گیا ہے۔ لیڈیز پولیس ایسی ہے کہ انہیں دیکھ کر بندے کا جرم کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ ہمیں پتہ چلا کہ ازبکستان کے پاس کوئی ایٹم بم نہیں۔ اسی شام ہمیں یونیورسٹی گرلز ہوسٹل جانے کا موقع ملا جس کے بعد ہم نے کہا ''کون کہتا ہے ان کے پاس ایٹم بم نہیں ہیں''۔

شر۔آب

وہاں جو شراب کی تعریف نہ کرے اسے سمجھتے ہیں یہ نشے میں ہے۔ پوچھا ''اچھی شراب کون سی ہوتی ہے؟'' کہا جو ابھی بوتل میں ہو۔ شراب کا جتنا ذائقہ ا چھا نہ ہو اتنی ہی وہ اچھی ہوتی ہے سنا ہے شر۔آبی اور آبی جانور گلپھڑوں سے سانس لیتے ہیں۔ ہمارے ایک اعلیٰ وزیر جن کا نام جام تھا اور جام ہمیشہ فل ہی رہتا وہ کہتے ہیں شراب ختم کرنا چاہتا ہوں واقعی وہ جہاں اسے دیکھتے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے۔ جاپانی کہاوت ہے پہلی مرتبہ بندہ شراب پیتا ہے، پھر شراب، شراب کو پیتی ہے پھر شراب بندے کو پیتی ہے۔ سب سے بڑی برائی وہ ہوتی ہے جس میں بندہ خود شامل نہ ہو۔ ویسے بھی ہم دوسروں کے حرم اور حرام پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ لیکن ازبکستان میں لوگ پانی کی شراب کی طرح پیتے ہیں۔ موسم سرما وہاں اس لیے آتا ہے کہ شراب کو ٹھنڈی کرنے کے لیے فرج میں نہ رکھنا پڑے۔ وہاں سردیوں میں پانی صحن میں پھینکو تو پانی جم جاتا ہے۔ کمیونسٹ دور میں تو اتنی سردی ہوتی کہ بولنے والے کے منہ سے جملے نکلتے ہی فضا میں جم جاتے۔ برژنیف تو اتنا بوڑھا تھا کہ تھکاوٹ کی وجہ سے منہ بند نہ کرسکتا تھا سنٹرل کمیٹی کی مدد سے کیا جاتا۔ وہ جس دن الٹی سیدھی باتیں کرتا رفقاء کو پتہ چل جاتا آج اس نے پی نہیں۔ روسیوں کے پینے کی عادت کی وجہ سے بین الاقوامی طور پر ان کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے مگر وہ یہ بے عزتی پی جاتے ہیں۔ بورس یلسن شراب کے نشے میں روس کی حکومت چلا رہا ہے۔ یہ واحد حکومت میں جسے ہوش میں رہ کر چلایا بھی نہیں

جا سکتا۔ بورس پی کر بڑی اچھی باتیں کرتا ہے ۔وہ پی کر کہہ رہا تھا پینے کا کوئی فائدہ نہیں ۔اسے تو بوتل اتنی پسند ہے کہ نظر اور کمزور ہوئی تو بوتل کے پیندے سے عینک بنوالے گا۔ پوچھا۔ جب گورباچوف نے واڈکا بند کر دی تو کیا ہوا؟ کہا اس سال سردیوں میں اون بہت مہنگی بکی۔ ہمارے ایک ادیب کو ایک بار وہاں الکحل فری پارٹی میں جانا پڑا تو اس نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ میں ایسی پارٹی میں نہیں جاتا جہاں فری الکحل ملے۔شراب وہاں اس قدر عام ہے کہ ایک شرابی نشے کی حالت میں جا رہا تھا سامنے پولیس والا آ گیا۔شرابی نے منت کرتے ہوئے کہا ''کامریڈ مجھے کار گزارنے کی اجازت دیں''پولیس والے نے کہا جائیں مگر آپ تین بندے ایک کار کیسے ڈرائیو کر رہے ہیں۔''

Bar، بار

تاشقند ہوٹل کی سب سے اوپر والی منزل پر بار تھا۔لوگ اوپر جانے کے لیے پیتے اور پینے کے لیے اوپر جاتے۔ سردار جی بار اس جگہ کو کہتے جہاں بار بار جانے کو دل چاہے۔ ہم تو گھر بار لکھتے ہیں کچھ تو بار کو بھی گھر لکھتے ہیں۔وہاں واڈکا رپینی کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہفتے میں دو کی بجائے ایک چھٹی کر دی جائے کیونکہ چھٹی کے دن کا دوسرا کام شراب پینا ہی ہوتا ہے۔ پہلا کام اسے ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ہمیں پتہ چلا ہے بیوری ہلز میں ایک جاپانی فرم نے واٹر بار کھولا ہے۔ اس جاپانی فرم بلکہ لاپانی فرم کے پاس پانی کی 80 مختلف اقسام ہیں۔جن میں

فرانس، روس اور جاپان کا پانی بھی شامل ہے۔ پاکستانی پانی اس لیے نہیں رکھا گیا کہ اسے جو پی لے وہ بعد میں بل ادا نہیں کرتا۔

ہیروئن مدر اور ہیروئن فادر

ہمارے ہاں ہیروئن تب تک رہتی ہے جب تک بچے پیدا نہیں کرتی۔ ازبکستان میں زیادہ بچے پیدا کرنے والی مدر کو ہیروئن قرار دیتے ہیں۔ ان کی قومی ہیروئن مسز فیوڈورویسلٹ نے 1972ء میں انتقال فرمایا۔ اس نے 68 بچوں کو جنم دیا اور زندہ رہتیں تو قوم کی ایسے ہی خدمت کرتی رہتیں۔ ہمارے ہاں زیادہ بچے پیدا کرنے والی مدر کو کچھ نہیں کہتے۔ ہمارے تو بچے اس قدر تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں کہ بقول ایک کامیڈین عجلت کی وجہ سے ننگے پاؤں ہی دنیا میں آجاتے ہیں۔ ممتاز موسیقار نوشاد، علی سفیان آفاقی صاحب کو کہا کرتے کہ آپ کی ایک بیوی اور دو بچے ہیں آپ تو کنوارے ہوئے۔ شادی شدہ تو ہم ہیں کہ اتنے بچے ہیں گھر جاؤ تو یہی لگتا ہے سکول آگئے ہیں۔ ان کے ہاں محلے کے بچے بھی آجاتے۔ ایک دن غصے میں آکر انہوں نے محلے کے بچوں کو نکالا تو ایک بچے نے جانے سے انکار کر دیا۔ نا شاد صاحب نے غصے میں آکر کہا، اگر تم پھر یہاں آئے تو تمہارے باپ سے شکایت کردوں گا۔ تو بچہ بولا۔ ''پر ابا میں جاؤں کہاں؟''

مرینا

میڈم کی جگہ اگلے دن نئی فلور انچارج مرینا تھی جس نے چارج لیتے ہی مہمانوں کو چارج کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بالوں میں چاندی، دانتوں میں سونا اور جسم لوہا تھا۔ اس عمر میں تھی جب آپ کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے مگر کوئی سوال پوچھتا نہیں۔ وہ مڈل ایج سے زیادہ میٹل ایج کی لگتی۔ انگریزی ایسی بولتی کہ کسی انگریز کو پتہ نہ چلنے دیتی کہ وہ انگریزی بول رہی ہے۔ تعلیم اور طلاق یافتہ تھی۔ اس نے بتایا کہ شادی کے لیے دل نہ مانتا، شادی کے بعد بھی دل نہ مانتا پوچھا شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی تھی؟ بولی "بس یہ کہ شادی سے پہلے ہم کار میں اتنے فاصلے پر نہ بیٹھتے تھے۔ وہ روسی تھی بچوں کو پالنے کے لیے ہوٹل میں مہمان پالتی۔ امریکہ وہ ملک ہے جہاں گرہستی عورتیں گھر میں صفائی کے لیے عورت ملازم رکھتی ہیں تاکہ وہ ڈے نرسری میں جا کر کام کر سکیں جہاں صفائی کرنے والی عورتوں کے بچے ہوتے ہیں۔ ہم نے مرینا سے پوچھا۔ آپ کو پتہ ہے برتھ کنٹرول کے لیے کیا کرتے ہیں؟"

بولی۔ "نو"

کہا "بالکل ٹھیک"۔

وہاں کی عورتیں ذرا سے بات پر جامے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ہماری عورتیں ایسا نہیں کرتیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری عورتیں بڑی صبر والی ہوتی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ جامہ پہنتی ہی نہیں۔ روسی کہاوت ہے خاوند کا گناہ ابھی باہر ہی کھڑا ہوتا ہے پر بیوی کا گناہ فوراً گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا طلاق کی یہی وجہ تھی۔ بولی نہیں میرا خاوند ہر خاوند کی طرح وہ عورت چاہتا تھا جو

شادی چاہے کسی فلمی ہیرو سے کرے مگر چاہے صرف اسے۔ وہ بیمار بھی نہ ہو اسے زیورات، قیمتی لباس اور فرکوٹ سے الرجی ہو۔ بال ایسے ہوں کہ اسے کبھی بیوٹی پارلر نہ جانا پڑے۔ وہ کھانا پکانے، صفائی کرنے اور چپ کرنے میں ماہر ہو۔ بس میری ساس اور میری سوچ ملتی تھی۔ ہم دونوں کی خواہش تھی کہ میرے خاوند کی شادی کسی اور اسے ہوئی ہوتی۔

مجازی خدائیاں

اردو میں خاوند کو عورت کا مجازی خدا کہتے ہیں اور پنجابی عورت کا بندہ۔ ممکن ہے عورت کا بندھا کہتے ہوں۔ پوچھا "ازبکستان میں خاوند کو کیا کہتے ہیں؟" کہا خاوند اچھا ہو تو اسے کچھ نہیں کہتے۔ ذات برادری ہمارے ہاں اس قدر اہم ہے کہ اس کا الگ سے خانہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک میاں صاحب تو کہتے ہیں دنیا میں بیشتر نبی ہی کیا اللہ بھی میاں ہے اسی لیے اسے اللہ میاں کہتے ہیں اللہ خاں، یا اللہ بٹ نہیں کہتے۔ ایک روسی نے بتایا کہ آپ کے ہاں ٹی وی، گاڑیاں، وی سی آر اور ریموٹ کنٹرول دروازے تو اب آئے ہیں مگر جب کسی ملک میں بھی کوئی چیز ریموٹ کنٹرول نہ تھی تب بھی ہمارے ہاں تھی۔ پوچھا کیا؟ کہا خاوند۔ اس نے بتایا ہمارے ہاں گھروں میں کچھ مرد اور باقی خاوند ہوتے ہیں۔ مرد کا ان کے ذہن میں یہ تاثر ہے کہ ایک عورت نے پڑوسن کو کہا۔ کل آپ کو میں نے سلام کیا تھا آپ نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا۔ اس لیے کہ میں ایک بیگانے مرد کے ہاتھ میں آپ کا

ہاتھ دیکھا تھا۔تو وہ بولی۔ عجیب عورت ہو،مرد بھی کوئی بیگانہ ہوتا ہے۔ایسے ہی ہماری مشہور اداکارہ ریما کو کسی نے کہا۔آپ نے ایک اجنبی سے اتنا قیمتی تحفہ کیسے لے لیا؟ تو وہ بولی جس نے مجھے اتنا قیمتی تحفہ دیا وہ اجنبی کیسے ہوا؟''

گونگوں کا ریڈیو پروگرام

جیسے بیوی کے ہر کام کرنے کی دو وجوہ ہوتی ہیں ایک معقول وجہ اور دوسری اصل وجہ۔ایسے ہی ہمارے ہاں دو طرح کی موسیقی ہوتی ہے۔ایک وہ جس کی ہم تعریف کرتے ہیں اور دوسری وہ جسے ہم سنتے ہیں۔کلاسیکل موسیقی اور کلاسیکی ادب صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ گفتگو میں ان کی تعریف کی جائے اور یہ کام انہیں سنے اور پڑھے بغیر ہی ہوسکتا ہے۔موسیقی کی یہ خوبی ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ہم نے ایک سیانے سے پوچھا۔جو چیز سمجھ میں نہ آئے وہ پسند آسکتی ہے؟ جی ہمیں تو آرٹ،سنگیت اور خواتین پسند ہیں۔وہ بولا ان کے نزدیک میوزک دو قسم کے ہیں ایک پاس میوزک اور دوسرا ااپ میوزک۔شادی شدہ لوگوں کو پاپ میوزک زیادہ پسند ہے اس لیے کہ بیوی پاس بیٹھی بول بھی رہی ہو تب بھی احساس ہوتا ہے نہیں بول رہی۔ایک میوزک شو پر وہاں کے ایک مزاح نگار کا یوں تبصرہ ہے کہ شو کے ناقص ہونے کا اندازہ اس سے لگالیں کہ آپ ساتھ بیٹھے لڑکے سے نہ صرف بات کرسکتے تھے بلکہ اس کی بات سن بھی سکتے تھے۔ہم نے دادا خان نوری کو ایک کیسٹ دی کہ اس کی ریکارڈنگ لاہور میں بڑی مشکل سے کی گئی۔سن کر

کہنے لگے۔ مگر اس میں تو خاموشی ہی ہے کوئی آواز نہیں۔ ہم نے کہا۔ آپ نے لاہور دیکھا ہوتا تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ یہ سائیلنس ریکارڈ کرنے میں ہمیں کتنی دشواری ہوئی ہو گی۔ یہ سائیلنس جو آپ سن رہے ہیں لاہوری اس کو ترس گئے ہیں۔ بولے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آرمینین ریڈیو دو گھنٹے چپ رہا اور بعد میں اعلان کیا گیا کہ اب ہمارا گونگوں کا پروگرام ختم ہوا۔''

جمیلہ حقوق

وہاں شادی کے بعد بھی عورتوں کے جمیلہ حقوق غیر محفوظ ہوتے ہیں جس سے مرد بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لڑکیاں لباس کا اتنا خیال رکھتیں ہیں آپ ذرا پاس ہو جائیں تو لباس کی تہہ بچانے کی کوشش کریں گی۔ آپ ذرا اور قریب ہو جائیں تو لباس تہہ کر کے رکھ دیں گی۔ سلوٹیں ان کے لباس اور ماتھے پر ہم نے نہیں دیکھیں۔ خوب صورتی کا وہاں جو استعمال ہو رہا ہے لگتا ہے حکومت چند سالوں تک خوب صورتی پر انکم ٹیکس لگا دے گی۔ ہم ہوٹل سے نگار کے گھر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک لڑکی کو پیدل چلتے دیکھا۔ اسے لفٹ دینے کے لیے ٹیکسی روکی تو بولی شکریہ اب تو میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ ایک روز ہوٹل کے باہر ہم نے ایک خاوند کو بچہ اٹھائے اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے آتے دیکھا تو بہ زبان کمار پوچھا۔ آپ نے بیوی کو ہوتے ہوئے بچہ کیوں اٹھایا ہوا ہے؟ بولا بیوی نے وزن بڑھا لای ااس لیے اب اسے تو اٹھا نہیں سکتا۔ عورت کا وزن بڑھانا ہی وہاں ایسے ہی ہے جیسے دکان بڑھانا۔ وہاں دفتر میں باس اکثر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ کچھ دفتروں میں باس آدمی ہوتے ہیں۔ کچھ میں باس مرد بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی باس کے کمرے سے قذاق حسینہ ناراض نکلی تو سہیلی نے پوچھا کہیں باس نے تمہارے حسن کی تعریف تو نہیں کر دی۔ کہا ہاں پوچھا۔ پھر تمہارے کپڑوں کی تعریف کی ہوگی؟ کہا ہاں پھر اس نے پوچھا ہوگا کہ دفتر ٹائم کے بعد تم فارغ ہو۔ فرصت ہے؟ سہیلی نے پوچھا۔ وہ بولی۔ ہاں اور میں نے کہا فرصت ہی فرصت ہے۔ تو اس نے

چالیس صفحے مجھے ٹائپ کرنے کے لیے دے دیئے۔

سرکش سرکس

وہاں کے سرکس بہت مشہور ہیں۔ پتہ چلا کہ وہاں ایک نوجوان لڑکی ایک جام میں داخل ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا اس پر ہمیں کوئی حیرانی نہیں۔ ہم نے سڑکوں پر لڑکیوں کو جام سے چھوٹے جاموں میں پھرتے دیکھا ہے۔ ایک صاحب بولے۔ ہماری سرکس میں جادو ہوتا ہے۔ جادوگر آپ کی آنکھوں کے سامنے لڑکی غائب کر دیتا ہے۔ ہم نے کہا یہ فن تو ہمارے ہر وڈیرے کو آتا ہے۔ صاحب سرکس تو کیا ہمیں تو سڑکوں پر خواتین کے لباس دیکھ کر لگتا ہے یہ لباس محدب عدسے سے بنائے گئے ہیں۔ وہ جہاں جہاں فکس اور فوکس ہوتے اس حصے کو کئی گنا بڑا بلکہ کئی گناہ بڑا کر کے دکھاتے۔ ایک سابق فوجی حالیہ مسخرہ ملا پتہ چلا مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے اس کا کورٹ مارشل ہو گیا تھا۔ پوچھا اچھا تو اس وقت مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے کی بھی آزادی نہ تھی۔ بیوی نے بھی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے پر طلاق لے لی۔ ہم نے کہا۔ ہم ہاں تو صرف مونچھوں پر ہاتھی پھیرنے پر بیوی طلاق نہیں مانگتی۔ کہا ہمارے ہاں صرف مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے پر طلاق لے لیتی ہے۔

خنداں بدنداں

ازبکستان کے لوگ اتنے مہمان نواز ہیں کہ ان کے دسترخوان پر ہر چیز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کھانے کے لیے دانت بھی ہوتے ہیں۔ وہ دانتوں کو سونے میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ ہم سونے کے بعد لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ وہاں کے ڈینٹسٹ بڑے سنجیدہ ہوتے ہیں۔ بہت کم دانت نکالتے ہیں۔ دانتوں کی حفاظت کے تین طریقے ہیں۔

دانت روزانہ دومرتبہ صاف کریں۔

سال میں دومرتبہ ڈاکٹر کو دکھائیں۔

حکومت کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائیں۔

کمیونزم کے دور میں لطیفوں پر بھی کوئی دانت نہ نکالتا کہ اس کے لیے منہ کھولنا پڑتا ہے۔

دو دلہنیں

ازبک عوام کے نزدیک سمرقند و بخارا وہ حسین وجمیل بہنیں ہیں جو سجی دھجی بنی سنوری دلہنوں کی طرح کھڑی ہیں۔ امیر تیمور کے دور میں حافظ شیرازی اپنے محبوب کے تل کے بدلے سمرقند و بخارا دینے پر تیار ہو گئے۔ امیر تیمور کو پتہ چلا تو انہوں نے حافظ کو بلا کر غصے سے کہا میں نے بڑی جان جوکھوں سے یہ فتح کیے ہیں تم اپنی حالت دیکھو اور چلے ہو محبوب کے تل کے بدلے یہ شہر دینے۔ تو حافظ شیرازی نے کہا انہی فضول خرچی نے تو اس حالت کو پہنچایا ہے۔ دادا خان نوری

نے بتایا کہ سمرقند و بخارا میں کئی بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ ہم نے کہا ہم تو سمجھتے رہے وہاں بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تاشقند کا معیار زندگی سطح سمندر سے 525 میٹر بلند ہے۔ تاشقند کی طرح سمرقند و بخارا میں بھی خواندگی سو فی صد ہے۔ اس لیے بے روزگاری بھی اتنے ہی فی صد ہے۔ وہاں جتنے بھی جاہل ملیں گے وہ بھی پڑھے لکھے ہی ملیں گے۔ لوگ بے روزگاری کم کرنے کے لیے اب تعلیم حاصل کرنا کم کر رہے ہیں۔ وہاں دو قسم کے پھول ہیں۔ ایک جو کسی درخت کی ٹہنی پر اگتے ہیں اور دوسرے کسی دانشور کے قلم پر۔ ازبک زندہ قوم ہے مگر اسے یہ بتانے کے لیے وہ زندہ ہے ہڑتالیں نہیں کرنا پڑتیں۔

ذیل سنگھ اور مندرجہ ذیل سنگھ

تاشقند ہوٹل میں سکھ بڑی دیر سے مقیم تھے۔ پوچھا کب سے یہاں ہو؟ کہا بارہ بجے سے۔ ان کے نزدیک ہر پریشانی کا حل، الکحل ہے۔ سردار جی کہنے لگے امریکہ اور یہاں میں یہ فرق ہے کہ امریکہ میں رات کو جب تک آپ کی جیب میں پیسے نہ ہوں۔ آپ غنڈوں سے نہیں بچ سکتے، یہاں اگر آپ کی جیب میں پیسے ہوں تب بھی آپ غنڈوں سے بچ نہیں سکتے۔ سردار جی نے کہا ہمارے ہاں تو بیوی کو گھر کا فرنیچر سمجھا جاتا ہے وہ فرنیچر جس پر لیٹ کر بندہ خود کو بے آرام کرتا ہے پھر آنکھ مارتے ہوئے بولے یہاں کا فرنیچر ہے بڑا سوہنا تے لشکیلا۔ ہم نے پوچھا سردار جی کوئی ایسی مشین یا چیز ہے جو یہاں کی عورت کو محنت اور مشقت سے بچا

سکے؟ کہا ہاں اسے ڈالر کہتے ہیں۔سردار ذیل سنگھ رات کو اپنے کمرے میں سارے کپڑے اتار کر ننگے پھرتے مگر سر پر پگڑی ضرور رکھتے۔پوچھا سردار جی کمرے میں ننگے کیوں رہتے ہو؟بولا بھراجی یہاں یہاں کون سا کسی پردہ دار نے آنا ہوتا ہے۔پوچھا پھر یہ پگڑی کیوں نہیں اتارتے؟کہا''بھراجی کوئی آ بھی تو سکتا ہے''۔

مس گائیڈ بک

اس بک کا نام مس گائیڈ بک اس لیے رکھا ہے کہ آپ اسے مس نہ کریں اور ابھی سے بک کرالیں۔کیونکہ suffer تو آپ کو کرنا ہی ہے سو ہماری یہ ہدایت کسی کے پلو سے باندھ لیں۔

۱۔کسی چھوٹے قصبے میں اچھا ہوٹل ڈھونڈنا ہے تو وہاں کے قصائی سے پوچھو۔ اسے پتہ ہوتا ہے وہ کس کون سا گوشت دیتا ہے۔

۲۔اگر آپ کی گاڑی سے پٹرول ختم ہوگیا ہے اور آپ اسے پٹرول پمپ تک لے جانا چاہتے ہیں تو اس کی رفتار کم کر کے 35 میٹر فی گھنٹہ تک لے آئیں۔

۳۔اگر آپ چاہتے ہیں آپ کا کام ہو تو یہ کام اس کے ذمے لگائیں جو سب سے مصروف ہو۔

۴۔چوتھی ہدایت یہ ہے کہ اگر آپ کو یہ ہدایات ٹھیک لگتی ہیں تو آپ عقل مند بندے ہیں اور عقل مندوں کو کسی کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیوٹی بکس(Beauty Box)

کہتے ہیں ہنسنے سے عمر لمبی ہوتی ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک صاحب نے کہا برتھ ڈے منانے سے عمر لمبی ہوتی ہے اور ثبوت یہ دیا کہ جن لوگوں نے زیادہ برتھ ڈیز منائیں انہوں نے لمبی عمر پائی۔ اس کا تو ہمیں پتہ نہیں لیکن ہمیں یقین ہے چہرے کا سب سے خوب صورت میک اپ مسکراہٹ ہے۔ ہمارے ایک مزاح نگار نے محبوبہ کو ایک پیکٹ دیا اور کہا یہ بیوٹی بکس ہے۔ محبوبہ نے کھولا اس میں مصنف کی مزاحیہ کتاب تھی۔ محبوبہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور حسین لگنے لگی۔

ایک جدید مزاح نگار کی تحریریں آپ کو خوب صورت بنانے کے لیے۔

☆☆☆

سائبیریا کے پاس ایک علاقے میں وہاں کی بااثر شخصیت کی سو داشتائیں ہیں۔ ایک کو ایڈز ہوگئی ہے وہ کون سی ہے یہ پتہ نہیں چل رہا۔ امریکی صدر کے سکیورٹی کے مشیر سو افراد میں سے ایک کے جی بی کا ایجنٹ ہے وہ کون سا ہے اس کا ابھی پتہ نہیں چل رہا۔ روس کے سو مشیر اقتصادیات ہیں ان میں ایک اقتصادیات کو جانتا ہے یہ کون ہے اس کا پتہ کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

روسی اور کر پارٹی لیڈر کے پاس گیا اور کہا ''کامریڈ برف باری شروع ہو گئی ہے اور ہمارے پاس مشینوں کے لیے کوئی گیراج نہیں ہے پارٹی لیڈر نے کہا آپ پریشان نہ ہوں میں ابھی کچھ کرتا ہوں تاکہ برف باری رک جائے۔''تو ورکر نے کہا''کامریڈ آپ ہمیشہ آسان راستہ ہی چنتے ہیں۔''

شت

پیسے گننا وہاں سب سے مشکل کام ہے۔ بازار اور مارکیٹ میں حساب کتاب کے لیے جو آلہ استعمال ہوتا ہے اسے شت کہتے ہیں۔ روس کے دور دراز علاقوں کے دیہاتیوں نے تو روبل کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ کسی نے دور دراز کے دو کسانوں سے پوچھا''کیسے گزارا کرتے ہو؟'' کہا دو سال یہ میرے مویشی خانے پر کام کرتا ہے۔ میں اس کو مزدوری نہیں دیتا۔ مزدوری میں یہ مویشی خانہ اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر میں کام کرنا شروع کر دیتا ہوں تب تک جب تک میں وہ مویشی دوبارہ حاصل نہیں کر لیتا۔ پیسے کبھی دیکھے ہی نہیں۔'' یہ شت وہی آلہ ہے جس پر گاؤں کے سکولوں میں بچوں کو گنتی یاد کراتے ہیں۔ کچھ دکانوں پر حساب کتاب کے لیے کمپیوٹر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ایک الیکٹرونکس کی دکان پر گئے۔ ہم نے بہ زبان دادا خان نوری کہا۔ ہم ویڈیو کیسٹ خریدنا چاہتے ہیں۔ سیلز بوائے چند منٹ کمپیوٹر سے لگا رہا۔ پھر انگریزی میں بولا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں معذرت خواہ ہوں کیسٹ موجود نہیں ہے۔ ہم نے گن کر بتایا کہ وہ چار موجود ہیں۔ اس نے پھر

کمپیوٹر پر چیک کیا اور کہا میں معذرت خواہ ہوں چار کیسٹیں شیلف میں ہیں بھی تو میں انہیں بیچ نہیں سکتا کیونکہ کمپیوٹر بہر حال آپ سے زیادہ قابل بھروسہ ہے۔''

Clock - Wise

جوش صاحب کی گھڑی دیکھ کر ایک گھڑی کے لیے تو لگتا کہ انہوں نے وال کلاک ہاتھ پر باندھ رکھا ہے۔ میں اور گورا صاحب ایک کمرے میں دونوں تھے اور بقول مرینا ایک کمرے میں جوش صاحب دونوں رہتے تھے۔ ہمیں صبح اٹھنے کے لیے وال کلاک چاہیے تھا۔ دادا خان نے پوچھا۔ پاکستان میں آپ کے کمرے میں وال کلاک تھا۔؟ کہا وال تو تھی۔ ہم ہوسٹل میں رہتے ہیں وہاں طلبہ اتنا شور مچاتے ہیں کہ جونہی وہ چپ ہو جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ سو گئے ہیں یعنی صبح اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہاں تو اتنی خاموشی رہتی ہے۔ کہ ساری رات اٹھنے کا ٹائم لگتا ہے۔ ایک پل رات کو چین نہیں ایک ہفتے سے میں خود کو شادی شدہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ کمیونزم کے دور میں وقت کو اس قدر اہمیت دی جاتی کہ ایک جیل میں تین قیدی تھے۔ ایک نے کہا۔ مجھے اس لیے سزا دی گئی کہ میں کارخانے میں دیر سے آتا تھا۔ دوسرے نے کہا میں بہت جلدی آتا تھا تو انہوں نے کہا اس سے ثابت ہوتا ہے تم سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہو۔ تیسرا قیدی بولا۔ میں اس لیے یہاں ہوں۔ کہ میں ٹھیک وقت پر پہنچا تھا تو انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ ضرور میرے پاس امریکن گھڑی ہے۔

ذکس

نگار نے بتایا ہمارے ہاں لوگ ذکس میں جا کر شادی کرتے ہیں۔ ہم نے کہا ہمارے ہاں لوگ شادی کرتے نہیں ان کی شادی ہوتی ہے۔ ذکس میں عورت کو نیا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات ملتے ہیں جس میں اس کا نام تبدیل ہوتا ہے۔ وہاں عورتیں ہر کام کرتیں یہاں تک کہ نکاح پڑھانے والا مولوی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ ذکس میں نکاح پڑھانے والا مرد تو وہ اکثر خاموش طبع ہوتا ہے یعنی شادی شدہ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد دولہے دولہن کو تحفے دیتے ہیں۔ ایک دولہے نے دلہن کو کہا۔ آپ کے ساتھ سونے کے لیے آپ کو کیا دوں؟ بولی کلوروفام۔ وہاں بھی شادیوں پر بڑے خرچے ہوتے ہیں، محاورہ ہے ''مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار'' یہ محاورہ سن کر پتہ چلا ہمارے ہاں شادی شدہ بار بار کیوں روتے ہیں۔ ان دنوں وہاں ایک ریسرچ رپورٹ چھپی کہ لوگ جن کے معاملات چار چار پانچ پانچ سال چلتے ہیں ان کے ہاں آپس میں شادی کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں یا جن کے ابھی تعلقات کو چند ماہ ہوئے ہوں۔ رپورٹ کے مطابق جن کے تعلقات چار پانچ سال سے چل رہے ہوں ان کے درمیان شادی کا کم چانس ہوتا ہے کیونکہ انہیں سوچنے کے لیے چار پانچ سال مل جاتے ہیں۔ البتہ چند مہینوں والوں کی شادی کا خدشہ ہوتا ہے۔ خواتین فطرتاً جمہوریت پسند نہیں ہوتیں کیونکہ وہ تو خواب میں بھی جس کو پسند کرتی ہیں وہ شہزادہ ہی ہوتا ہے کوئی ڈیموکریٹ نہیں۔ البتہ امریکی عورتیں جمہوریت پسند ہیں۔ وہ اس طرف

جاتی ہیں جس طرف زیادہ مرد ہوں ۔وسط ایشیائی ریاستوں میں عورتوں نے محبت پر قدرت پا لی ہے ۔اور رضیہ سلطانہ کا قول ہے محبت پر قدرت پا لینے سے عورت گمراہ ہو جاتی ہے اور مرد فرشتہ بن جاتا ہے ۔

آبادیات

دنیا میں آبادی بڑھ رہی ہے مگر خانہ آبادی کم ہو رہی ہے ۔ شادیاں ہمارے ہاں لوگ زیادہ کرتے ہیں ۔ ہمارے ایک اداکار نے کہا میں آج کل ڈبل رول ادا کر رہا ہوں ۔تو اس پر دوسرا بولا ۔ ہیں !تم نے دوسری شادی کب کی؟ جیسے کتاب پڑھنے کے لیے اسے کھولنا پڑتا ہے ایسے ہی کتابی چہرہ آپ تب پڑھتے ہیں جب اس کا منہ کھلے ۔ کتابیں انسان کی اسی لیے دوست ہیں کہ یہ بولتی نہیں ہیں ۔ جب تک آپ نہ بولیں آپ بھی میرے دوست ہیں لیکن شادی کے بعد بیوی بولنے لگتی ہے ۔ حالانکہ ایک سیانے نے کہا ہے میری تو طلاق ہی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ میری بیوی بولتی نہیں تھی ۔ روسی باشندے تو گھریوں چلاتے ہیں جیسے وہ نہیں ان کی حکومت چلا رہی ہے ۔اندروپوف کے دنوں میں لوگ اس قدر خوف زدہ تھے وہ جو بات کرتے وہ قانون ہوتی ۔ان دنوں اندروپوف اگر کہتا کہ آج میری بیوی سے ناراضگی ہوئی ہے تو اگلے دن جس روسی کی بیوی سے ناراضگی نہ ہوئی ہوتی وہ سمجھتا وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے ۔

سکھ محبت

صاحب یہاں ہم محبت کو سکھ نہیں کہہ رہے بلکہ تاشقند ہوٹل میں مقیم سیکھ ذیل سنگھ کی محبت درج ذیل کر رہے ہیں۔ کہتے مجھے لمبی لڑکیاں پسند نہیں۔ وجہ پوچھی تو بولے۔ مجھے Height phobia ہے۔'' ایسے ہی جب مشہور پاکستانی اداکارہ انجمن کی شادی مبین ملک سے ہوئی تو کسی نے ان کے خاوند سے پوچھا۔ '' آپ میں شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی؟'' بولا کوئی خاص ہیں بس ہائیکنگ کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ ذیل سنگھ ایک دن ہمارے فلور پر آئے اور کاونٹر پر جا کر انگریزی میں فلور انچارج کو کہنے لگے۔ انجیلا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے آگے سے کہا تم غلط کہہ رہے ہو۔ سردار جی نے کافی یقین دلایا تو وہ بولی۔ پر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ میں انجیلا ہوں کیونکہ میں تو میرینا ہوں۔ پھر پوچھا۔ کیا تم واقعی محبت کرتے ہو یا ایسا سوچتے ہو؟ سردار جی نے کہا۔ بالکل نہیں سوچتا، سچی مچی محبت کرتا ہوں۔ میرینا گئی تو ایک اور تاجک قتالہ آ گئی جسے انگریزی ''لیس'' تک ہی آتی تھی۔ ہوٹل میں کچھ حاصل کرنا ہے تو انگریزی اس سے زیادہ نہیں آنی چاہیے۔ سردار جی نے کہا کیا تم سمجھتی ہو میں بڑا اچھا لڑکا ہوں؟

بولی، لیس

پوچھا تم سمجھتی ہو میں اپنے وعدے کا پکا ہوں دھوکا نہیں دیتا؟

کہنے لگی۔ لیس!

سردار نے پھر دریافت کیا تم سمجھتی ہو میں خوبرو جوان ہوں؟

پھر بولی، لیس!

سردار جی خوش ہو کر بولے۔ تم کتنی خوب صورت باتیں کرتی ہو۔

ٹوریسٹ

ٹورسٹ تو جاتا ہی ٹو۔ ریسٹ کے لیے ہے ہم اس کے قائل تھے لیکن گورا صاحب زیادہ آرام نہ کرنے دیتے کہ یہاں کی ہوا صاف ہے۔ ہر چیز ملاوٹ کے بغیر ہے آرام کرنے سے کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ ہم نے پوچھا۔ یہاں موجد بننے کے لیے کیا چاہیے؟ کمار نے کہا اس کے لیے سب سے پہلے ایسا کام ڈھونڈ نا چاہیے جو ناممکن ہو۔ ہم نے کہا۔ کام ڈھونڈ نے سے زیادہ ناممکن کام یہاں کیا ہے؟ پھر پاکستانی قوم ایجاد سے زیادہ دریافت پر یقین رکھتی ہے۔ ہر روز کیئوں کی خیریتیں دریافت کرتے ہیں۔ لیکن وہاں یہ بھی مشکل تھا کیونکہ ٹورسٹ کے منہ میں اپنی زبان نہیں ہوتی ہر چیز اشارے سے مانگنا پڑتی ہے۔ جیسے جب سٹور پر کوئی سیلز مین ہوتا تو ہمیں دودھ مانگنے میں بڑی دشواری ہوتی۔

مِس اُردو

وہاں تاشقند یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین لینگویج میں ہماری ملاقات اردو کے طلبہ و طالبات سے ہوئی۔ ایک طالبہ سے ہم نے پوچھا ''آپ کون سی زبان کی طالبہ ہیں؟'' بولی ''میری بھاشا اردو ہے''۔ ہمارے کسی ساتھی نے کسی بات پر کہا۔ ''زبان یار من ......'' اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مس اردو بولی آپ کا یار من کا ہی کیوں ہوتا ہے؟ اس وزنی سوال کے بعد ہم خود کو ہلکا ارباب ذوق سمجھنے لگے۔ جوش صاحب کا نام سن کر بولی اچھا آپ وہی شاعر ہیں جن کا انتقال کئی سال پہلے ہوا تھا۔ جوش صاحب یقین دلاتے رہے کہ میرا انتقال ابھی تک نہیں ہوا۔ لڑکی کو جتنی سمجھ آ رہی تھی اس سے ہمیں یہی سمجھ آئی کہ اسے جوش صاحب کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ جوش صاحب کو ایش ٹرے چاہیے تھی۔ جسے ازبک عیش ٹرے سمجھتے ہیں۔ وہاں بندہ جسے سگریٹ کی ٹپ دے دے وہ سمجھتا ہے آپ کسی ملک کے مالک ہیں اور ہمارے ہاں کسی کو سگریٹ کی ٹپ دے دو تو وہ بھی آپ کو مالک ہی سمجھتا ہے مگر پان سگریٹ کے کھوکے کا۔ ایش ٹرے نہ ملی تو ایک طالبہ نے دوات آگے رکھ دی۔ ویسے تو جوش صاحب سگریٹ یوں پکڑتے ہیں جیسے قلم پکڑا ہو۔ اس پر ہمیں اعتراض نہیں قلم بھی یوں پکڑتے ہیں جیسے سگریٹ ہو راکھ بکھیرتے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں اردو ازبک لفظ اوردو یعنی فوجی اڈا سے بنا ہے۔ گورا پبلشرز نے اردو ازبک مشترک الفاظ کی لغت چھاپی جس میں مشترک بھی مشترک الفاظ میں شامل ہے۔ غریبی وہاں اس قدر ناپسند ہے کہ ان کے ہاں افلاس سے مراد ناپاک ہے۔ اولاد کا لفظ ازبک میں باپ دادا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب ہم اپنی اولاد کی ناخلفی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں اپنے باپ دادا کا ذکر کر رہے ہیں۔ شکر ہے جب ہم اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کا ذکر کر رہے ہیں۔ ویسے اس زمانے میں باپ دادا بچوں کی اولاد ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ بچوں کے گھر میں جو پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ہمشیرہ کو نرس کہتے ہیں۔ ہمارے ہسپتال میں ایک ڈاکٹر نے نرس کو ہمشیرہ کہہ دیا تو پیچھے سے آواز آئی یہ نرس کو ہمشیرہ کس نے کہا۔ تو آگے سے ایک بولا۔ یہ ہمشیرہ کو نرس کس نے کہا۔ ازبک میں ضعیفہ سے مراد بیوی ہے۔ ہم پنجابی بھی بیوی کو بڈھی کہتے ہیں صرف اپنی بیوی کو۔ ہسپتالوں میں فراش، صفائی کرنے والے کو جبکہ ہمارے ہاں صاحب فراش وہ ہوتا ہے جس کی صفائی کی جاتی ہے۔ اس ملک میں جاؤ جہاں کی زبان آپ کو نہیں آتی۔ تو پتہ چلتا ہے وہ ملک بے زبانوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ بہر حال وہاں ایک زبان ہر کوئی سمجھتا ہے وہ ہے ''ڈالر'' کی زبان۔

یہاں نیلی پڑھائی جاتی ہے!

شعبہ اردو کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آزاد این شاتو کے کمرے میں ہم نے

دیکھا اداکارہ نیلی کی تصویر اس قدر محبت سے لٹکائی ہوئی تھی کہ ہوسکتا تھا اگر نیلی خود یہاں ہوتی تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کی جاتا۔ہم نے سوچا ممکن ہے یہ تصویر کسی اور کی ہو جو یہاں پڑی پڑی نیلی ہوگئی۔ جیسے ایک ڈرامے میں اداکارہ البیلا کی جیب سے نیلی کی تصویر نکلی۔ بیٹے نے پوچھا۔ ''ابا آپ بھی ......'' تو البیلا صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔ بیٹا میں جب جیب میں ڈالی تھی تب تو یہ تمہاری ماں کی تصویر تھی۔ جیب میں پڑی پڑی نیلی ہوگئی ہے۔ہم نے شاتو صاحب سے پوچھا۔کیا نیلی یہاں پڑھائی جاتی ہے؟ کہا نہیں ہمارے طالب علم اتنا تو گھر سے ہی پڑھ کے آئے ہوتے ہیں۔ یہ کیلنڈر ہے، ڈیٹ دیکھنے کے لیے کیا آپ کے ہاں یہ ڈیٹ کے لیے نہیں؟ ہم نے کیلنڈر کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ ہے تو سہی مگر صرف ''شیخوں'' کے لیے۔

مات

روسی جس چیز میں دنیا میں سب سے آگے ہیں اس میں جاپان بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔امریکی تو بہت ہی پیچھے ہیں۔وہ ہے گالیاں۔روسیوں کا سب سے بڑا ہتھیار۔وہ اسے مات کہتے ہیں۔اور اس سے دوسرے کو مات دیتے ہیں۔وہاں کا ایک مزاح نگار لکھتا ہے۔مات آرٹ ہے یا سپورٹ۔فیصلہ نہیں ہو سکا۔آرٹ ہوتا تو اس پر صدارتی ایوارڈ ملتا۔اگر سپورٹ ہے تو اسے اولمپک میں کیوں نہیں بھجواتے کہ سارے سونے کے تمغے روس کے حصے آئیں۔کہتے ہیں

جرمنوں کی فوج سے روسی قیدی بھاگ کر آئے تو وہ جرمنوں کے لباس میں تھے۔ روسی علاقے میں دیہاتیوں نے انہیں پکڑلیا کہ تم جرمن جاسوس ہو، کیا ثبوت ہے کہ تم روسی ہو؟ تو انہوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ روسی دیہاتیوں نے کہا تم واقعی روسی ہو کیونکہ اتنی اور ایسی رواں گالیاں کوئی غیر روسی نہیں دے سکتا۔ ایک امریکی ادارے نے روس کی سبزمنڈی میں تین گھنٹے کے انٹرویوز کیے۔ گالیاں نکالیں تو تین منٹ بچے۔

گائے سوپ

کمار ہمیں ایک ہوٹل میں سوپ پلانے لے گیا۔ پتہ چلا اس ہوٹل کی خوبی یہ ہے کہ گائے سوپ لانے کے لیے عجیب انتظام ہے۔ گائے خود یہ سوپ لاتی ہے۔ گائے کا وہاں جب بھی ذکر آتا ہمارا اپنی فلمیں دیکھنے کو دل چاہنے لگتا۔ سو آرڈر دینے کے بعد ہم گائے کا انتظار کرنے لگے۔ ذہن میں ایک بار خیال آیا کہ ابھی تاشقند ہوٹل میں ہمیں میرینا نے ہیلو گائز کہا تھا کہیں یہاں گائے سے مراد وہ تو نہیں ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ دور سے ہمیں واقعی ایک گائے، سوپ لاتی نظر آئی اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ عینک عورت کی محافظ ہوتی ہے ایک تو وہ ان مردوں کو جنہیں سوئمنگ نہیں آتی ڈوبنے سے بچاتی ہے۔ پھر جس عورت نے نظر کی عینک لگائی وہ کم نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ہمارے پاس آ کر کرسی کی وجہ سے رکی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں سوپ تھا۔ سوپ کے پیالے میں اس کا انگوٹھا ڈوبا

ہوا تھا۔ ہم نے پریشانی سے اس طرف اشارہ کیا تو بزبان کمار اس سے جو جواب دیا وہ یہ تھا پریشانی کی کوئی بات نہیں سوپ زیادہ گرم نہیں۔ وہ مسلسل ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ سوچا ہم مزاح نگار ہیں شاید اس لیے مسکرا رہی ہے۔ سوچا پھر تو اسے ہمیں دیکھ کر ہنسنا چاہیے۔ کمار کے ذمے لگایا وہ وجہ مسکان دریافت کرے اس نے پوچھا تو محترمہ نے انگلیوں سے عینک کو سہارا دیا اور مسکرانا روک کر جواب دیا جو ہمیں کمار نے یوں سنایا کہ مسکرانا واحد طریقہ ہے جس سے وہ اپنی عینک گرنے سے روک سکتی ہے۔ وہ پھر ہاتھ چھوڑ کر عینک لگائے مسکرا رہی تھی۔

ٹوپیوں کی جد امجد

ازبک کلچر بڑا قدیم ہے۔ ایک امریکی دانشور نے کہا تھا یہ ازبک سر پر چھوٹی سی جو کیپ پہنتے ہیں وہ میرے خیال میں ان کے سر سے زیادہ کسی ٹوتھ پیسٹ ٹیوب کے سر پر سجتی ہے۔ دادا خان نے ایک بوڑھے کی ٹوپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ٹوپی مشرق سے لے کر بحیرہ کیپشن کے سارے علاقے کی ٹوپیوں کی جد امجد ہے۔ وہ ٹوپی واقعی اتنی پرانی اور قدیم لگ رہی تھی کہ ہم نے دادا خان کی بات پر فوراً یقین کر لیا۔

شوز و یوز

وہاں جوتے لباس کا حصہ ہیں اس لیے اگر عورت نے صرف جوتے پہنے ہوں

آپ اسے بے لباس نہیں کہہ سکتے۔ ایک کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر نے جوتے بنانے والی فیکٹری کے مزدوروں کو کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں جب بھی کارخانے میں آؤں ہر کسی کو محبت سے کام کرتا دیکھوں۔ ایک مزدور نے کہا یہ تو بڑا آسان ہے۔ آپ بس یہ کریں کہ ربڑ کے بے آواز جوتے نہ پہنا کریں۔ ازبکستان میں ہمیں کسی دکان پر اچھے جوتے نہ ملے۔ سنا ہے ہیل والے جوتے اس لڑکی نے ایجاد کیے تھے جس کے محبوب کا قد ایسا تھا کہ محبوب نے اسے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ عورتیں اس لیے قد اونچا کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیتی ہیں۔ برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم کو تقریر کے بعد ایک عورت نے کہا جب تک میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا میں سمجھتی تھی آپ بہت لمبے قد کے آدمی ہوں گے۔ تو اس نے کہا میڈم ویلز میں جہاں سے میرا تعلق ہے وہاں مرد کا قد اس سے ناپا جاتا ہے کہ گردن سے اوپر کتنا ہے؟ ہم نے میرینا کا خوبصورت جوتا دیکھ کر پوچھا یہ جوتا کتنے میں پڑا؟ بولی تین پاکستانیوں میں۔ ہماری اداکارائیں تو جوتوں کے معاملے میں بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ اداکارہ جوتے خریدنے میں بڑے ڈیپارٹمینٹل سٹور میں گئی اور سیلز گرل کو کہا جوتے کے انتخاب میں میری مدد کرو خاص کر کے اس کی ہیل کے لیے۔ سیلز گرل نے پوچھا۔ آپ کس کے ساتھ پہنیں گی۔ کہا ایک ٹھگنے لاکھ پتی کے ساتھ۔

جمالی جائزہ

لال بیگ وہاں اتنا مشہور ہے جتنا ہمارے ہاں اسلم بیگ۔ بیگ وہاں شریف مالدار اور اہل دانش کو کہتے ہیں۔ ترکی میں ام کا مطلب ہے میرا گویا بیگم، میرا بیگ ہوئی مطلب ہے وہ بیوی کو اپنی شرافت، دولت اور دانش سمجھتے ہیں۔ اس سے ان کی دانش، شرافت اور دولت کا اندازہ کر لیں۔ ازبکستان کو میں نے آدھا دل سے دیکھا اور آدھا آنکھ سے۔ ایک تخلیقی آدمی میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ جو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اس میں پچاس فی صد آنکھ سے نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ خواب دیکھنے کی میری نزدیک واحد وجہ یہی ہے کہ خواب میں کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کمیونسٹ انقلاب نے ان کے ہاں ہر چیز تو میادی تھی۔ عورت بھی تو میادی۔ تنخواہ بھی مرد عورت کا فرق نہ کیا جاتا۔ دونوں کو کام نہ کرنے کا یکساں معاوضہ ملتا۔ آزادی کے بعد یہ پری شان اچھے لباس پہن کر پریشان پھرتے ہیں کوئی گھورتا تک نہیں۔ ہم نہ ہوتے تو اور پریشان ہوتے۔ وہاں کی عورت قسط وار ڈرامے کی طرح ہے جونہی کوئی دلچسپ موڑ آتا ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ گورا صاحب یہاں بھی اپنی بیوی کو مس کرتے۔ ہم تو دوسروں کی بیویوں کو ہی مس کر رہے تھے۔ ان کے رنگ ایسے سرخ و سفید تھے کہ ہاتھ لگانے سے ہاتھ اجلا ہو جائے۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر خواتین ہی بڑی پوسٹوں پر کیوں ہیں۔ ایک ہوٹل کی انچارج خاتون سے رابطہ کیا۔ ہم نے پوچھا۔ آپ کی تعلیم بھی دوسروں جتنی ہے اور تجربہ بھی، پھر آپ اس پوسٹ پر کیسے پہنچیں؟ کہنے لگی، لمبی کہانی ہے۔ بتاتی ہوں آج کچھ گرمی زیادہ

نہیں اور وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھولنے لگیں۔ ہم نے کہا آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہمارا خیال ہے کہ ہم سمجھ گئے ہیں۔

ادب اور عالیہ

ہم سمجھتے رہے ادب عالیہ وہ ہے کہ جس ادب میں عالیہ کا ذکر ہو۔ سو اسی لیے ہمارے نقاد ہمارے ادب کو ادب عالیہ میں شامل نہیں کرتے۔ ازبکستان میں 1924ء ازبک نثر کا سن ولادت ہے۔ جب عبداللہ قادری کا ناول "ایام گزشتہ" چھپا۔ عبداللہ قادری کو حکومت نے قتل کر کے لمبی زندگی دی۔ متحدہ روس کے دور میں وہاں اتنی علاقائی زبانیں تھیں کہ سنٹرل کمیٹی جو مختلف قوموں کی زبانوں کے بارے میں بحث کرنا چاہتی تھی مگر یہ نہ ہو سکی۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ بحث کس زبان میں کی جائے۔ ادیب جیل یوں جاتے کہ ایک مزاح نگار ایک شاعرہ سے ملا اور پوچھا۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟ وہ بولی جیل کے سامنے۔ کئی سالوں بعد دونوں پھر ملے تو شاعرہ نے مزاح نگار سے پوچھا اتنے سال کہاں رہے۔ وہ بولا آپ کے گھر کے سامنے۔ ادیبوں کی شگفتہ بیانیاں وہاں بھی سب بیان کرتے ہیں۔ درمیانے درجے کے ایک شاعر کی باتصویر نظم بڑے رسالے میں ایک دفعہ رسول حمزہ توف کے ساتھ چھپ گئی۔ شاعر نے تمیں مارخانی کرتے ہوئے کہا۔ رسول حمزہ توف اب تو آپ کے اشعار ہمارے ساتھ چھپتے ہیں ویسے آپ کے شعر بہت اچھے تھے۔ رسول حمزہ توف نے کہا میں نے بھی آپ کے اشعار دیکھے بڑی اچھی تصویر

کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔شاعر وہاں کے خوش حال ہیں یعنی اپنے حال پر خوش ہیں۔ایک ادیب اپنی آپ بیتی لکھ رہے تھے۔عوامی ادیب اور مزاح نگار سعید احمد نے پوچھا۔آج کل کیا کر رہے ہو؟بولا۔آپ بیتی لکھ رہا ہوں۔بولے جب وہاں تک آجاؤ جہاں آپ نے مجھ سے چالیس ہزار روبل لیے تھے تو مجھے دے دینا۔

ایک دن وہ خود ہی کہہ رہے تھے۔کتنی بری بات ہے فلاں شاعر کی جیب میں کبھی پھوٹی کوڑی تک نہیں ہوتی۔پوچھا۔کیا اس نے آپ سے قرض مانگا تھا؟کہا نہیں میں نے قرض مانگا تھا۔ایک بار نوجوان مزاح نگار محمد آچل نے محبوبہ سے کہا۔''چلو تمہیں بہت بڑی گاڑی میں سمندر تک لے چلوں۔لڑکی حیرانی اور خوشی سے بولی۔اچھا چلو پھر تو آچل بولا آجاؤ پھر قریبی بس سٹاپ پر۔''

مذاق رات

تاشقند شہریوں کے لیے خوابوں کی سرزمین ہے بشرطیکہ وہ پاکستانی شہری ہوں۔سنگاپور شیر کا شہر ہے وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا سوائے انسانوں کے۔تاشقند پتھر کا شہر ہے مگر یہاں آپ کو پھول ہی پڑتے ہیں۔ہم جس گھر جاتے گھر والے ہمیں میز کے ارد گرد بٹھا دیتے۔شاید اس لیے کہ اس شہر میں ہم نے 1965ء میں میز پر ایک جنگ ہاری تھی۔بھارتی وزیراعظم مسٹر لال بہادر شاستری کی اس رات شدت جذبات سے کروٹیں لیتے موت واقع ہوگئی۔شادی مرگ اور کیا ہوتی ہو گی؟ان دنوں ابھی ایڈورٹائزمنٹ کا دور نہیں آیا تھا۔البتہ امریکہ میں وہ اس لیول

پر تھا کہ وہاں تو مسلمان ایڈورٹائزنگ کی مدد سے عیسائی کو مصلی بیچ سکتا تھا۔ ان دنوں تاشقند میں مقیم کچھ پاکستانیوں نے سوچا کہ پاک روس دوستی کا اشتہار ٹی وی پر دیا۔ انہوں نے اشتہاری کمپنی کو جو لکھ کر دیا وہ یوں تھا:

''پاک روس دوستی، پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہ ہو۔''

بلٹ اور بیلٹ

دنیا میں دو طرح سے تبدیلیاں آتی ہیں بلٹ سے یا بیلٹ سے۔ دونوں میں یہ فرق ہے کہ بیلٹ سے تبدیلی میں زیادہ گولیاں چلتی ہیں۔ ہمارے ہاں ملک میں بلٹ پروف حکمران اور بیلٹ پروف الیکشن ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آمر کو چنتے رہے وہاں آمر عوام کو چنتا بلکہ چنواتا رہا۔ ہر علاقے میں ووٹ ڈالنے کے لیے صندوقچی اور بندوقچی رکھے ہوتے۔ وقت بدلتا ہے۔ برطانیہ جس کی بادشاہت میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اب اس کی بادشاہت میں سورج طلوع نہیں ہوتا۔ یوں وسط ایشیائی ریاستوں کے باشندے ایک دن صبح اٹھے تو آزاد تھے۔ یہاں تو کارخانوں میں کام کرنے والوں کو بھی پتہ نہ ہوتا وہ کس مشین کا پرزہ لے کر کس مشین میں ڈال کر کون سی مشین بنا رہے ہیں۔ بس وہ کام کر رہے ہوتے۔ جن دنوں ہم ازبکستان میں تھے ان دنوں کا واقعہ ہے۔ دو ڈپٹی سیکرٹری پارلیمینٹ کی لابی میں ملے۔ ایک ابھی فل سیشن اٹینڈ کر کے اندر سے آ رہا تھا۔ جبکہ دوسرا جا رہا تھا۔ اس نے آنے والے سے پوچھا اندر کیا ہو رہا ہے؟ پہلے نے کہا۔ وزیر خزانہ

تقریر کر رہا ہے۔ دوسرے نے پوچھا۔ وہ کس موضوع پر تقریر کر رہا ہے؟ تو پہلا بولا ۔ پتہ نہیں کیونکہ یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں۔

آندرے گرومیکو نے جب گورباچوف کو 1985ء میں جنرل سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی نامزد کیا تو کہا "کامریڈ اس کی مسکراہٹ بڑی پیاری ہے مگر دانت لوہے کے ہیں۔" گورباچوف کسانوں اور مزدوروں کی حالت بہتر بنانا چاہتا تھا مگر بیوروکریسی رکاوٹ تھی۔ یہ انہیں معاوضہ دینے کا دعویٰ کرتے اور وہ بھی کام کرنے کا دعویٰ ہی کرتے۔

بیوروکریٹ اور کیکڑے

بیوروکریٹ اور کیکڑے میں یہی قدر مشترک ہے کہ یہ پتہ چلتا ہے وہ چل رہے ہیں۔ مگر چلتے وقت ان کا منہ کس طرف ہے یہ پتہ نہیں چلتا۔ روس میں تیز رفتاری کنٹرول کرنے کے لیے بریکوں کا استعمال اتنا ہی ہوا جتنا بیوروکریسی کا ہوا۔ وہ کام جو بندہ بیوروکریسی کی مدد سے ایک ماہ میں کرتا ہے اس کی مدد کے بغیر گھنٹوں میں کر سکتا ہے۔ ازبکستان میں جس میں سینس آف ہیومر نہ ہو اسے بیوروکریٹ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسے مزاح نگار کہتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا انہیں آزادی ملی ہے مگر ہم نے وہاں کسی کو آزادی کے متعلق بات کرتے نہ سنا۔ وہ چیزوں کو خریدنے اور بیچنے کے بارے میں باتیں کرتے، ڈالر کی باتیں کرتے۔ ایک بیوروکریٹ کو ہم نے کتاب دی اس نے بتایا وہ جلد ریٹائرڈ ہو رہا ہے۔ پوچھا

ریٹائرمنٹ کے بعد کیا پروگرام ہے؟ کہا اپنی کتاب ختم کروں گا کئی سال سے شروع کر رکھی ہے۔ہم نے پوچھا کیا آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں؟ کہا میں لکھ نہیں رہا، پڑھ رہا ہوں۔ہم یہی کہہ سکتے تھے گویا آپ کا ریڈر چھٹی پر ہے۔دنیا میں ہر چیز کو موت آ سکتی ہے۔سوائے خدا اور بیوروکریسی کے۔لینن نے کہا تھا مچھر، مکھی اور بیوروکریسی سب سے جلدی پھولتی پھلتی ہیں۔وہ چار ماہ بیمار رہا تو اس نے دیکھا کہ 16 گورنمنٹ کمیٹیاں جو وہ چھوڑ کر گیا تھا وہ 120 بن چکی ہیں۔

انتظاریہ

روسی کہاوت ہے قانون تو ایک بیل گاڑی ہے، آپ اسے جس راستے پر لے جانا چاہیں ادھر مڑ جاتا ہے۔قانون صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ بھاری تنخواہ دے کر قانون کے محافظ رکھے جاتے ہیں۔قانون کسی کی حفاظت نہیں کرتا۔ہمیں ہی قانون کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔کمیونزم کے دور میں ایسے لطیفے بنائے گئے" کہتے ہیں ایک بار وہاں کا طیارہ اندرون **ملک** پرواز پر اغوا ہو گیا تو پائلٹ نے اعلان کیا، مسافروں کے لیے میرے پاس ایک بری خبر ہے اور ایک اچھی خبر ہے۔بری خبر یہ ہے کہ ہمارا طیارہ دہشت گردوں نے اغوا کر لیا ہے۔اور اچھی خبر یہ ہے کہ وہ یہ طیارہ امریکہ لے جانا چاہتے ہیں۔" اب بھی وہاں کی عورتوں سے پوچھ لو امریکہ کے حاکم کا کیا نام ہے؟ کہیں گی ڈالر۔کمیونزم کے دور میں وہاں درخت بڑے لمبے لمبے ہوتے جس کی وجہ یہ بتائی جاتی کہ انہیں

سانس لینے کے لیے بہت اونچا جانا پڑتا۔ وہ لوگ انتظار بہت کرتے ہیں کہ کوئی آئے اور ان کے مسئلے حل کرے۔ انہوں نے کمیونسٹوں کا انتظار کیا، سٹالن کا انتظار کیا۔ ڈیموکریٹس کا انتظار کیا۔ اب ان کی عورتیں ٹورسٹوں کا انتظار کرتی ہیں۔ وہاں کے ایک سٹیج اداکار کو کہا گیا کہ آپ پارلیمینٹ میں رکنیت کے لیے کاغذات جمع کرائیں۔ تو اس نے جواب دیا۔ ''نہیں میں پارلیمینٹ میں احمق کا رول ادا کرنے کی بجائے سٹیج پر کسی عقل مند کا رول ادا کرنا پسند کروں گا۔'' بے روزگاری کا یہ عالم کہ ایک ٹورسٹ نے چودہ پندرہ سال کے ازبک لڑکے کو جیب کاٹتے ہوئے پکڑ لیا اور کہا اس عمر میں یہ کام کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہا آپ بتائیں کس عمر میں یہ کام کرنا چاہیے۔

اکتیسواں پلاؤ

ازبکستان میں پہلے لوگ تیس قسم کے پلاؤ پکاتے۔ آج کل تو خیالی پلاؤ بھی خوب پک رہا ہے۔ پاکستان سے جانے والوں کو ان کا پلاؤ اتنا پسند آتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کہتے ہیں اب پلاؤ بھی۔ سقراط سے کسی نے پوچھا۔ کب کھانا چاہیے۔ کہا جس کے پاس کھانا ہو اسے تب کھانا چاہیے جب اسے بھوک لگے اور جس کے پاس کھانا نہ وہ اسے تب کھانا چاہیے جب کھانا ملے۔ ان مرغن غذاؤں اور فضاؤں میں ہمیں مُلا نظر نہ آئے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر لطیفے سنانا ان کی روایت ہے۔ جو زیادہ تر ملانصر الدین آفندی کے بارے میں ہوتے ہیں۔ وہ

شراب کی طرح پانی پیتے ہیں۔یعنی چھپ چھپا کر۔عورت اور شراب میں یہ فرق ہے کہ عورت کو کچھ نہ کہو تو وہ آپ کو بہت کچھ کہتی ہے اور اگر برانڈی کو کچھ نہ کہو تو وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہتی۔پلاؤ ان کا قومی کھانا ہے۔شادیوں پر مرد پلاؤ پکاتے ہیں۔بہتر پلاؤ وہ ہے جسے تب کھایا جائے جب بہتر بھوک لگی ہو۔دادا خان نوری نے کہا ہمارے ہاں تیس قسم کا پلاؤ ہوتا ہے۔ہم نے کہا ہم نے یہاں اکتیس قسم کا پلاؤ بھی کھایا ہے پوچھا۔یہ کون سا پلاؤ ہے؟''ہم نے کہا یہ وہ پلاؤ ہے جسے پکانے والا صحیح نہ پکا سکے۔''

Driving Lie - Cence

پٹرول کے لیے وہاں اتنی لمبی لائن لگی ہوتی کہ گاڑی لائن میں لگا کر ٹیکسی لے کر پٹرول پمپ تک یہ پوچھنے جانا پڑتا کہ پٹرول ہے بھی یا نہیں۔وہاں کے ٹیکسی ڈرائیور سمجھتے ہیں ٹیکسی کی رفتار جہاز سے کم تر ہوتی ہے جبکہ ہمارے ڈرائیوروں نے اسے غلط ثابت کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔وہاں خواتین اتنی محتاط ڈرائیور ہیں کہ ایک ڈرائیور خاتون سے کسی نے پوچھا تم کتنے سال کی ہو؟ کہا جب ڈرائیونگ کر رہی ہوں تو ایسے سوال نہ کیا کرو جن کا جواب سوچ سمجھ کر دینا پڑے۔ہمیں ہر وہ سواری پسند ہے جس میں ڈرائیونگ نہ کرنا پڑے۔ہمارا ساتھ بولا۔سیدھی طرح کہو ٹرین پسند ہے۔کیونکہ بغیر ڈرائیور کے تو تم پیدل بھی سفر نہیں کر سکتے۔ہم لوگ شادی کے لیے بڑے چلے کاٹتے ہیں۔ہمارے ایک جاننے والے نے بیس

ہزار دے کر پیر سے چلہ کٹوایا۔پیر بلند مقام پر فائز تھے یعنی انہوں نے درخت کے اوپر بیٹھ کر چلہ کیا۔لیکن چلہ بال برابر کے فرق سے ناکام ہوگیا۔پوچھا کیا اس لڑکی سے شادی نہیں ہوئی۔کہا اس لڑکی سے شادی ہوئی مگر میرے چھوٹے بھائی کی۔ موصوف نے دلبر داشتہ ہوکر گھر والوں سے کہا یا تو میری کسی سے شادی کر دو یا موٹر سائیکل لے دو۔تازہ تازہ پٹرول مہنگا ہوا تھا۔اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔ ازبکستان میں پرائیویٹ گاڑیوں میں بھی سواریاں بٹھائی جاتی ہیں۔اس سے کبھی کبھی تلخ تجربہ بھی ہو جاتا ہے۔ایک صاحب نے بتایا کہ میں بیوی کے ساتھ جارہا تھا۔زرافشاں بازار سے کچھ پاکستانی لڑکے بٹھائے، اپنے گھر آ کر پتہ چلا سواریوں کے ساتھ میری بیوی بھی اتر گئی۔

ہس۔پتال

ہسپتال ہمارے ہاں اللہ تک پہنچنے کے شارٹ کٹ ہیں۔ جب سے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے ہیں مسجدیں بھی خدا تک پہنچنے کا شارٹ کٹ بن گئی ہیں۔ازبکستان میں بہت کم لوگ بیمار ہوتے ہیں۔کوئی پاکستانی بیمار ہو تو لوگ وہاں کی ڈاکٹر اور نرس پر شک کرنے لگتے ہیں۔وہاں کے لوگوں کے بیمار نہ ہونے کی دو وجوہ ہیں۔ایک یہ کہ یہاں ڈاکٹر بہت کم ہیں اور لوگوں کے بیمار نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں دوائیاں نہیں ہوتیں۔ہم نے وہاں کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے پوچھا۔دنیا کی سب سے قدیم ترین بیماری کون سی ہے؟ کہنے لگی آپ

بتائیں۔ ہم نے کہا۔ سر درد چونکہ حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بعد خدا نے اسے پیدا کیا۔ وہ برا مان گئی پھر ہمیں اچھا بھی مان گئی البتہ بھول جانے کے مرض کا علاج انہیں بھی یاد نہیں تھا۔ ہمارے ہاں بھلکڑ کو پروفیسر کہتے ہیں۔ ایک پروفیسر جب بھی بیرون **ملک** سیر کر جاتے اتنے بھلکڑ تھے کہ ساتھ بیوی نہ لے جانا بھول جاتے۔ ان سے ایک بار ہم نے پوچھا۔ ’’آپ کی اعصابی بیماری کا اب کیا حال ہے؟‘‘ بولے ٹھیک ہے آج کل میکے گئی ہوئی ہے۔ کمار میڈیکل کا سٹوڈنٹ تھا۔ گفتگو سے ہمیں وہ عورتوں کا ماہر لگا کہنے لگا: بڑا ہو کر ماہر عورتوں کا ڈاکٹر بنوں گا۔ کمار نے بتایا ایک دفعہ ایک مریض نے ایمرجنسی وارڈ میں یہ کہا کہ میں وتجیٹیرین ہوں اس لیے خون نہیں لگواؤں گا۔ کمار کہتا میرا ڈاکٹری کا اتنا تجربہ ہے کہ نرس دیکھ کر بتا سکتا ہوں مریض ٹھیک ہونے میں کتنی دیر لگائے گا۔ ہمیں ایک سیانے نے مشورہ دیا آپ بھی سن لیں کام آئے گا یا پھر آپ اس مشورے میں کام آئیں گے۔ ہمیشہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہو تو اس کے لیے کسی بوڑھے ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ بشرطیکہ وہ زندہ ہو اور اس سے پوچھیں وہ کس سے علاج کراتا ہے اور اس کے پاس جائیں بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔

ا۔ دبی باتیں

جوش صاحب اتنی ادبی باتیں نہ کرتے جتنی دبی باتیں کرتے۔ ان سے جو بھی ملتا وہ کہتا ہمیں یقین نہیں آتا کہ جوش صاحب آپ زندہ ہیں۔ جوش صاحب لاٹھی

کے ساتھ یوں چلتے جیسے ہماری حکومت چلتی ہے۔ ہر قدم پر پتہ نہ چلتا چل رہے ہیں یا اگر رہے ہیں۔ عرب میں سنا ہے بڑھاپے کی لاٹھی ساتھ نہیں رکھتے۔ اسے گھر میں پردے میں رکھتے ہیں تاوقتیکہ وہ کئی بچوں کی ماں نہ بن جائے۔ جوش صاحب ایک دن سلک کا سوٹ اور کالی عینک اوڑھے ہمارے ساتھ بازار جانے کے لیے نکلے لیکن راستے میں سیڑھیوں میں ہی بیٹھ گئے۔ انہیں یوں بیٹھے دیکھ کر پاس گزرتی ہوئی ایک حسینہ نے جیب سے چند سوم نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ جوش صاحب نے جوش میں آ کر بٹوہ دکھایا جس میں ڈالر ہی ڈالر تھے۔ تو وہ حسینہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی کہ اچھا اس کام میں اتنی کمائی ہے۔ میکسم گورکی کا مجسمہ دیکھ کر جوش صاحب نے اپنی چھڑی کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا ہر ملک کے بڑے رائٹرز کی یہی نشانی ہے کہ اس کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے۔ عرض کیا کہ آپ کے ہاتھ میں چھڑی نہ ہوتی تو ہم آپ کے شعروں کی جتنی داد دیتے ہیں وہ اتنی نہ ہوتی۔ بلاشبہ ہو ہمارے بہت بڑے شاعر ہیں جسے یقین نہ ہو وہ ان کا ناپ لے لے۔ لاہور سے ہو دوست نکالتے ہیں۔ لاہور سے کتنے دوست نکال چکے ہیں۔ پتہ نہیں۔ طاہر اسلم گورا صاحب بھی رجحانات کے نام سے پرچہ نکالتے ہیں۔ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں جن کی وجہ سے وہ پرچے پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے جس وجہ سے یہ پرچہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔

انڈر گراونڈ، بیک گراونڈ

جو پہلے انڈر گراؤنڈ تھے اب بیک گراؤنڈ ہیں۔ آج کل انڈر گراؤنڈ صرف ریلوے ہے۔ ہمارے ہاں ٹرین کا یہ فائدہ ہے کہ بندہ گھر سے دیر سے بھی نکلے تو تب بھی اس میں سوار ہو سکتا ہے۔ بھارت میں تو ایک ٹرین کی ایک دن میں 350 مرتبہ زنجیر کھینچی گئی۔ یہ تو شکر ہے مسافر ہی □350 تھے۔ خود ہمارے ہاں ایک صاحب نے نارووال سے لاہور آنے کے لیے ریل پاس بنایا لیکن وہ راستے میں Expired ہو گیا۔ اس سے اندازہ لگالیں ٹرین کی رفتار کتنی ہے۔ ہماری ٹرینوں کے نام 18 اپ یا 50 ڈاؤن کی بجائے بال جبریل یا بانگ درا وغیرہ ہوتے تو زیادہ چلتیں۔ ہمارے ہاں ریلوے کے عملے کا اخلاق ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک خاتون ٹکٹ باؤ سے ہم نے کہا ایک برتھ دے دیں۔ تو اس نے ہمیں یوں گھورا جیسے اس کا تعلق برتھ کنٹرول سے ہو۔ جے کے چٹرین نے کہا ہے ٹرین کو پکڑنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک ٹرین کو مس کریں۔ ایسے ہی ایک خاوند نے بیوی سے کہا اگر تم جلدی کرتیں تو ہم ٹرین میں سوار ہو چکے ہوتے۔ اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ بیوی بولی تمہارا قصور ہے اگر تم جلدی ہ کرتے تو ہمیں اگلی ٹرین کا اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ازبکستان میں ریل کی ٹکٹیں ملنا اتنا مشکل ہے کہ ایک لاکھ سوم کی ٹکٹ کے لیے دو لاکھ سوم رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس لیے وہاں محاورہ ہے ٹکٹ کسی ٹکٹ گھر میں نہیں آپ کی اپنی جیب میں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہاں کچھ بھی کہیں نہیں سب کچھ آپ کی جیب میں ہے۔

گرما گرمی

ہمارے ہاں سردیوں کا موسم شادیوں کا موسم ہے۔ ہمارا ایک دوست ایک بار کہنے لگا سوچا تھا ایم کر لیا ہے اب ان سردیوں میں شادی کر لوں گا پر لگتا ہے یہ سردیاں بھی لحاف میں ہی کٹیں گی۔ وہ تو بی اے سے مراد بیچلر آف آرٹس اور ایم اے سے مراد Married of Art لیتا۔ ازبکستان میں موسم گرما شادیوں کی گرما گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ ہمیں وہ فلمیں پسند ہیں جن کا اختتام المیہ نہ ہو۔ اسی لیے ہم شادی کی فلمیں آخر سے شروع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اپنی پرانی کار سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً نئی کاروں کی قیمت پوچھتے رہیں۔ پرانی بیوی سے محبت کرنے کا ابھی تک کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوا۔ وہاں کی تاجک، قذاق اور روسی لڑکیاں ایسا لباس پہنتی ہیں لگتا ہے کسی کتاب کی چند پیراگراف میں تلخیص کی گئی ہو۔ ویسے کہتے ہیں دنیا کی طویل ترین اور دردبھری کہانی کی ایک لفظ میں تلخیص ہوگئی ''شادی''۔

مہ شکل، مشکل

لینا کو ہم نے پہلی مرتبہ ہوٹل کی سیڑھیوں میں دیکھا وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ ہماری سانس پھولنے لگی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں یہ بتانا نہیں پڑتا کہ میں آ گئی ہوں۔ سیڑھیاں چڑھتی وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ لگا سیڑھیاں بنائی ہی اس کے چڑھنے کے لیے ہیں۔ ہم آہستہ ہوئے تو وہ بھی آہستہ ہوگئی۔ ایسے ہی ایک ادیب ایک تقریب میں دیر سے آیا تو کسی نے لیٹ ہونے کی وجہ پوچھی۔ تو بولا کے جی بی کا جو ایجنٹ میرا پیچھا کر رہا تھا وہ بڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ ہمارے فلور کی نئی انچارج تھی۔ انگریزی اتنی اچھی بولتی جتنی اچھی ہم سنتے۔ اس نے پوچھا آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟ ہم نے کہا مسکراہٹیں اکٹھی کرنے۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ کر لو اکٹھی۔ ہم نے پوچھا۔ یہاں پریاں تو ہوتی ہیں کیا یہاں جن بھوت بھی ہوتے ہیں؟ بولی آ جاتے ہیں کبھی کبھی باہر سے۔ پوچھا آپ بھوتوں پر یقین رکھتی ہیں؟ بولی بھوتوں پر یقین رکھتی ہوں مگر مردوں پر نہیں۔ پوچھا پہلی بار بھوت کب دیکھا۔ تاریخ بتانے کے لیے اپنے بیگ سے کچھ ڈھونڈنے لگی پوچھا کیا ڈھونڈ رہی ہوں۔ بولی نکاح نامہ۔ لینا میں وہ ساری بچوں والی عادتیں تھیں جو بچوں میں نہیں ہونا چاہئیں۔ ایک دن آ کر بڑے فخر سے گھڑی دکھانے لگی۔ بولی اسے چلانے کے لیے بیٹری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تو پھر یہ کیسے چلتی ہے؟ ہم نے پوچھا معصومیت سے بولی۔ بس روز چابی دینا پڑتی ہے۔ کہنے لگی سمجھ نہیں آتی آپ کے ہاں اتنی سردی بھی نہیں پڑتی پھر بھی لوگ فل کپڑے

پہنے ہوتے ہیں ۔ہم نے تعلیم کا پوچھا تو بولی میں نے انگریزی میں ڈپلومہ کیا ہے۔ میں انگلش کی کتاب کھولتی تو مجھے نیند آنے لگتی سو جب کوئی پوچھتا کس میں پڑھتی ہو تو میں کہتی انگلش سلیپنگ میں ۔لینا نے کہا میں آپ کو نظم سناتی ہوں۔ نظم کا نام ہے خاموشی۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی ۔اس خوب صورت نظم میں جو نظم تھا وہ تو جماعت اسلامی میں بھی نہ ہوگا۔ ہوٹل تاشقند کے کاریڈور میں ہم نے دو ازبکیوں کو بحث کرتے سنا تو لینا سے پوچھا۔ یہ کس بات پر بحث کر رہے ہیں؟ کہا ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں ٹائم کیا ہوا ہے؟ کسی ازبکی کو اتنا کہنا ہو کہ بھئی ذرا رستہ دے دو گزرنا ہے تو اس کے لیے اس سے اتنی دیر بحث کرنا پڑتی ہے کہ اس سے کم وقت میں آپ دوسری طرف سے گزر بھی چکے ہوتے۔ لینا نے کہا ''میں اردو سیکھنا چاہتی ہوں تا کہ پاکستان آؤں تو مجھے مشکل نہ ہو۔ ہم نے کہا آپ صرف نہ کہنا سیکھ لیں آپ کو پاکستان میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

شاہراہ جوانی

وہاں جوان تو سب ہوتے ہیں بوڑھا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ہر شاہراہ پر آپ کو جوانیاں ہی نظر آتی ہیں۔ بچے بھی نظر نہیں آتے۔ پہلے تو سنا ہے یہاں کے بچے بھی کمیونسٹ ہوتے تھے۔ ان کے پرائیویٹ والدین نہ ہوتے۔ ان دنوں سکول میں ایک بچے نے کہا۔ سر! میری بلی نے دو بچے دیئے ہیں دونوں کمیونسٹ ہیں۔ اگلے دن ٹیچر نے پوچھا۔ ننھے کامریڈ کیا حال ہے تمہاری بلی کے کمیونسٹ بچوں کا۔ وہ

بولا اب وہ کمیونسٹ نہیں رہے۔ اب تو انہوں نے آنکھیں کھول لی ہیں۔ بچپن کے بعد لڑکپن آتا ہے یہ وہ عمر ہے جس میں بچہ سوال کرنے بند کر دیتا ہے۔ آگے سے جواب دینے لگتا ہے۔ مارک ٹوئن نے کہا ہے چہرے کی خوب صورتی کے لیے میک اپ کے ساتھ ساتھ حس مزاح بھی چاہیے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ بیوٹی پارلروں پر ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی کتابیں رکھی ہونی چاہئیں۔ البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ جس خاتون میں حس مزاح ہو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی اور کون عورت ہے جو بوڑھی ہونا چاہے۔ ایک دفعہ برژنیف نے مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ واڈ کا پینا چھوڑ دیں تو آپ 85 سال تک زندہ رہ کر کیا کرنا ہے؟ ازبکستان کے عوامی مصنف سعید احمد سے کسی نے پوچھا آپ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ کہا آج کل بوڑھا ہونے کا مزا لے رہا ہوں۔ سارا دن اسی میں مصروف رہتا ہوں۔ بقول سعید احمد بڑھاپے میں بندہ یہ خیال نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کہاں جا رہی ہے تاوقتیکہ وہ اسے ساتھ جانے کے لیے نہ کہے۔

لوہے کی عورت

عوامی ادیب سعید احمد کا ڈرامہ ''لوہے کی عورت'' وہاں کا کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔اس پر ایک غیر ملکی مبصر نے یہ تبصرہ لکھا تھا کہ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لیے ماسکو میں روٹی لینے والوں کی لائن سے لمبی لائن ہوتی ہے۔ازبکستان میں اصل عورت راج ہے وہ دلوں پر ہی نہیں دفتروں پر بھی راج کرتی ہے۔ازبکستان میں عورت کے کتنے روپ ہیں ہمیں معلوم نہیں کیونکہ ہمیں نہیں معلوم وہاں کتنی عورتیں ہیں۔وہاں گھروں میں نوکر رکھنے کا رواج نہیں۔ہم نے پوچھا نوکرانیوں کے بغیر آپ کا گھر کیسے چلتا ہے؟ کہا ہم جلد شادی کر لیتے ہیں۔ایک پاکستانی کہہ رہا تھا ہم تو اتنے غریب ہیں کہ الگ سے نوکرانی نہیں رکھ سکتے وہی نوکرانی کپڑے دھوتی ہے وہی گھر کی صفائی بھی کرتی ہے۔اور ساتھ کھانا بھی وہی پکاتی ہے۔وہاں ہر طرف جوان عورتیں ہی نظر آتیں ہیں۔پوچھا کیا یہاں عورتیں بوڑھی نہیں ہوتیں۔جواب ملا پچھلے سال کچھ ہوئی تو تھیں۔لوہے کی یہ عورتیں مردوں کے ہاتھوں میں یوں پگھلنے لگتی ہیں جیسے بچے کے ہاتھ میں آئس کریم۔وہاں ایک طالب علم نے حکومت کو درخواست دی کہ مجھے وظیفہ دیا جائے۔پوچھا گیا کہ اب اسے اس کی کیوں ضرورت پڑی؟ تو اس نے کہا میری بیوی اور مجھ میں علیحدگی ہوگئی ہے اب مجھے اکیلے خود کو سپورٹ کرنا ہے۔

شادیات

امریکہ میں تو بچے اپنے ماں باپ کی مرضی سے ان کی شادی کرتے ہیں۔ امریکہ میں آزادی اور پاکستان میں ناول اور ڈرامے پر شادی ختم ہوتے ہیں۔ لیکن ازبکستان میں ڈرامہ شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔کہتے ہیں شادی میں کوئی محبت نہیں ہوتی۔محبت لوگوں میں ہوتی ہے جو وہ شادی میں ڈالتے ہیں۔البتہ وہاں شادیاں پسند کی کی جاتی ہیں۔ہمارے ہاں بھی شادیاں پسند کی کی جاتی ہیں۔ جی گھر والوں کی پسند کی۔بقول عطاء الحق قاسمی۔ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی سے پوچھتے ہیں۔اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کریں تو شادی کر دیتے ہیں۔سننے والے نے پوچھا۔اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں تو......؟ کہا تو بھی شادی کر دیتے ہیں۔امریکنز کے ہاں سلیپنگ پارٹنر سے مراد کاروباری تعلق ہوتا ہے۔ہمارے ہاں اس سے مراد رشتہ ہوتا ہے۔لینا نے بتایا جب میں چھوٹی تھی تو میری ماں چاہتی کہ میں جلد بڑی ہو جاؤں۔بڑی ہوئی تو میں نے پہلا سفید بال نکال کر اپنی ماں کو دیا وہ بال پکڑ کر بولی۔یہ پہلا سفید بال تو نہیں جو تم نے ہمیں دیا۔لینا نے کہا میں بڑی شرمیلی لڑکی تھی۔ہم نے پوچھا کیا یہاں بھی لڑکیاں شرمیلی ہوتی ہیں؟ بولی اگر میں شرمیلی نہ ہوتی تو میرا جو لڑکا دو سال کا ہے وہ اس وقت پانچ سال کو ہوتا۔پاکستان میں عورتوں کا حبیب بینک خاوند ہی ہے۔وہاں کی عورتوں کے لیے خاوند بینک ہوتا ہے بشرطیکہ وہ دوسری کا ہو۔عورتوں کو شادی کے بعد جتنا شوہر کو تلاش کرنا پڑتا ہے اتنا تو شادی سے پہلے تلاش نہیں کرنا پڑتا۔وہاں بھی عورتوں کو شادی کرنے میں مردوں پر صرف اس لحاظ سے برتری حاصل ہے کہ انہیں کسی عورت سے شادی تو نہیں کرنا پڑتی۔شادی سے پہلے آنکھیں آدھی کھلی

رکھنی چاہئیں اور شادی کے بعد آدھی بند۔ امریکہ میں ایک خواتین کے رسالے نے بہت سی خواتین سے یہ سوال پوچھا۔ آپ نے شادی کی؟ جواب ملا نہیں کی؟ پوچھا، وجہ؟ کہا اس لیے کہ ہمیں اپنا خاوند اچھا نہیں لگتا۔

Bride's eye view

Bride's eye view میں تو پھر بھی بہت کچھ نظر آتا ہے۔ Bride's eye view کا اس سے اندازہ لگالیں کہ ایک دلہن سے صبح پوچھا گیا، جس کمرے میں شب عروسی گزاری وہ کیسا تھا؟ تو دلہن نے کمرے کی چھت پر جہاں جہاں سے پلستر اترا تھا بتا دیا۔ وہاں نئی بیوی اور پرانی کار زیادہ چلتی ہے ہمارے ہاں پرانی بیوی اور نئی کار زیادہ قابل بھروسہ ہوتی ہے۔ جدید سائنس کی بدولت آپ یہاں بیٹھے امریکہ برطانیہ کی عورت کو صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی باتیں سن سکتے ہیں۔ مگر سائنس اتنی ترقی نہ کرسکی کہ بندہ اپنے گھر کی عورت کو بھی سن سکے۔ آسٹریلوی کامیڈین باری ہمفریز نے ایک بار کہا تھا۔ آسٹریلیا میں مستقل رہنا ایسے ہی ہے جیسے پارٹی میں جانا اور ساری رات محبوبہ کی ماں کے ساتھ ڈانس کرتے رہنا، مگر تاشقند میں رہنا محبوبہ کے ساتھ ڈانس کرتے رہنا ہے۔ ہمیں ایک سیانے نے بتایا کہ اگر آپ ازبکستان میں خوب صورت، ذہین اور مالدار عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دو شادیاں کرنا پڑیں گی۔ اگر پاکستان میں خوب صورت، ذہین اور مالدار خاتون سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تین

شادیاں کرنا پڑیں گی۔ وہاں کنوارے ان کو کہتے ہیں جو صرف ایک عورت کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بوڑھے کنوارے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ جوان کنوارہ اپنا فلیٹ اس دن صاف کرتا ہے جس دن لڑکی کو وہاں لانا ہو جبکہ بوڑھا کنوارہ اس دن لڑکی کو وہاں لاتا ہے جس دن فلیٹ صاف کرانا ہو۔

Perfect Husbands and other fairy tales

روسی خاوندوں کے بارے میں کہتے ہیں اگر گاڑی اور بیوی دونوں موجود ہوں تو دونوں میں جونئی ہوگی اسے لے جائیں گے۔ ایک روسی ادیب سے ایک بار امریکی جرنلسٹ نے پوچھا آپ کو روسی حکومت کیسی لگی ہے؟ تو اس نے کہا اپنی بیوی کی طرح۔ اس سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں اور اتنا ہی ڈرتا ہوں۔ ایک مزاح نگار نے دلہن کا مطلب اپنے بیٹے کو یوں سمجھایا کہ دلہن وہ عورت ہوتی ہے جس کو بیوی بنانے کے لیے وہ وعدہ کرتے ہیں جو پورا نہیں کیا جائے گا جب وہ بیوی ہو گی۔ آزادی سے پہلے گھر بنانے کے لیے حکومت سے اجازت لینا پڑتی کہ گھر کا کتنا سائز رکھنا ہے۔ کسی کی بیوی بہت موٹی ہو جاتی تو پریشان ہو جاتا کہ کہیں سٹینڈر سائز سے زیادہ جگہ گھیرنے پر کے جی بی والے نہ گھیر لیں۔ وہاں خاوند کو بیویاں کم ڈانٹتی ہیں وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر نشے میں ہوتے ہیں۔ نشے میں ان کو ڈانٹنے کا یہ نقصان ہے کہ جب وہ ہوش میں آتے ہیں تب انہیں نئے سرے سے ڈانٹنا پڑتا ہے۔ پاکستانی میاں بیوی تو ایک دوسرے کے ساتھ بوجوہ نہیں چل

سکتے ۔ایک پاکستانی جوڑے نے بتایا ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے وجہ پوچھی تو بولے ۔ ہمارے پاس تین تو گاڑیاں ہیں چلیں کیسے؟ شادی باکسنگ کے کھیل کی طرح ہے کبھی تو پہلے ہی راؤنڈ میں فیصلہ ہو جاتا ہے ۔اور آخری راؤنڈ تک لڑائی جاری رہتی ہے ۔وہاں کے ایک خاوند نے گھر فون کر کے کہا ۔بیگم میں رات کو تین دوستوں کو گھر بلا لوں ۔ خاتون بولی آپ کے مہمان میرے مہمان ہیں ۔خاوند نے کہا سوری رانگ نمبر ۔میں سمجھا میری بیوی بول رہی ہے ۔ ٹیلی فون ہمارے ہاں تو عورتوں کی ان ڈور گیمز میں سے ہے ۔وہاں بھی عورتیں یہی کچھ کرتی ہیں جس دن بیوی ٹیلی فون پر صرف آدھ گھنٹہ بات کرے خاوند پریشان ہو جاتا ہے کہ ضرور بیوی کی طبیعت خراب ہے ۔ایک سیانے کے مطابق کنواروں کی نسبت شادی شدہ زیادہ گنجے ہوتے ہیں ۔ایک خاوند سے پوچھا گیا کہ تمہارے سر کے بال کہاں اڑ گئے؟ کہا ایک اڑن طشتری آ کے ٹکرا گئی ۔ پوچھا کہاں؟ کہا ''اپنے باورچی خانے میں ۔''

بین الستو ر

ہمیں تاشقند اتنا پسند آیا کہ ہم نے کہا دل چاہتا ہے بندہ یہاں ہنی مون کے لیے آئے ۔ کمار نے کہا ہر سال ہنی مون کے لیے اس سے بہتر جگہ شاید ہی کہیں ہو بشرطیکہ آپ ساتھ بیوی کو لے کر نہ آئیں ۔ جتنا ہوٹل کے کمرے کا ایک دن کا کرایہ ہے اتنی تو وہاں کام کرنے والی لڑکیوں کی سال کی تنخواہ تھی ۔وہاں لوگ کتنے

سستے ہیں اور چیزیں کتنی مہنگی۔ جتنے پیسوں میں کسی حسینہ کا حسین لباس آتا ہے اس سے کم پیسوں میں وہ حسینہ آ جاتی ہے۔ کمار نے کہا اگر آپ اچانک کسی کمرے میں داخل ہوں جہاں پاکستانی عورت ننگی بیٹھی ہو تو وہ سب سے پہلے کیا چھپائے گی؟ جی! اپنا منہ اگر عربی ہوئی تو سب سے پہلے آپ کو چھپائے گی اور اگر روسی یا ازبک ہوئی تو سب سے پہلے اپنے کپڑے چھپائے گی۔ حجاب کا وہ اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا ہم حجاب امتیاز علی کا۔ دنیا کا مشہور سفر نامہ نگار جان گینتھر 1969ء میں لکھتا ہے ''روس میں بہت سے میاں بیوی اس لیے کئی سالوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں کہ ان کے پاس علیحدہ رہنے کے لیے جگہ نہیں۔'' لکھتا ہے بعض اوقات طلاق کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ دو بستروں کے درمیان کمبل لٹکا دیتے ہیں۔ یہ صورتحال ماسکو کے حوالے سے شاید ٹھیک ہو۔ ازبکستان میں تو لوگ اس صورت میں درمیان میں کمبل نہیں لٹکاتے صرف اس صورت میں لٹکاتے ہیں جب کمبل ہو۔ خواتین اتنا کام کرتی ہیں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ ان کے پاس آزادیٔ نسواں کے لیے وقت نہیں۔ امریکہ میں تو ایک بار ویمن لبریشن والی بیبیاں سڑک پر نعرے لگا رہی تھیں ''فری ویمن''۔ تو ایک پاکستانی نے کہا ''اچھا ہم یونہی پیسے خرچتے رہے۔''

م ح ب ت

یہ چار حرف ہیں۔ جب ملتے ہیں تو بندے کو سب کچھ مل جاتا ہے۔ کسی نے لانگ فیلو سے پوچھا۔ محبت کے بارے میں بتا؟ کہا طالب علم سے پوچھو گے تو وہ مضمون لکھ دے گا، معمر کنوارے سے پوچھو گے تو وہ کتاب تصنیف کر دے گا۔ ہاں اگر کسی شادی شدہ سے پوچھو گے تو ممکن ہے وہ زبان کی بجائے ہاتھ سے آپ کو جواب دے۔ محبت کرنا دل سے تعریف کرنا ہوتا ہے اور دل سے تعریف کرنا محبت کرنا ہی تو ہے۔ فرانس میں اسے ایک کامیڈی، انگلینڈ میں ٹریجڈی، اٹلی میں ایک اوپیرا، جرمنی میں میلوڈرامہ، امریکہ میں ایک ڈاکومنٹری، بنکاک میں انڈسٹری، پاکستان میں بد اخلاقی اور ازبکستان میں ایک جاب سمجھتے ہیں۔ اناتولی فرانس نے کہا ہے لڑکیوں سے عشق کے لیے مذہب کی خدمات بڑی اہم ہیں کہ اس نے اسے گناہ قرار دیا سو ہر سو ہر کسی کا دل اسے کرنے کا چاہتا ہے۔ سورج اس لیے جلتا ہے کہ وہ اکیلا ہوتا ہے۔ چاند کے ساتھ تو ستارے ہوتے ہیں۔ اس دور میں پیار بھی پی آر ہے۔ پیار میں اکثر عورتیں اول آتی ہیں۔ اسی لیے ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں اور لیلیٰ مجنوں میں پہلے عورت آتی ہے، پھر مرد۔ لینا نے کہا لڑکی کے لیے دنیا میں، میں تم سے محبت کرتا ہوں سے بھی پاورفل ایک جملہ ہے وہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم نے کہا واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ امریکی انگریزوں کی طرح محبت کے معاملے میں بد معاملہ ہیں۔ میرا بس چلے تو میں کسی کو محبت سے پہلے مرنے نہ دوں۔ محبت کے بعد مجھے اسے روکنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لینا

نے اپنی طلاق کی وجہ یہ بتائی کہ میرا خاوند مجھے روز لو لیٹر لکھتا تھا اور ایک دن میں نے اسے اپنی سیکرٹری کو یہ لو لیٹر ڈکٹیٹ کراتے دیکھ لیا۔

الم غلم

چار ہزار قبل مسیح میں اس علاقے میں رہنے والے قبیلوں نے دنیا میں پہلی بار گھوڑوں کو خوراک کی بجائے سواری سمجھا۔ اس پر بیٹھ کر منزل پر پہنچنے لگے۔ ہمارے ہاں تو اب ان پر بیٹھ کر حکومت میں پہنچنے لگے ہیں۔ گھوڑوں کو ہمارے ہاں تو وہ مقام حاصل ہے ڈر ہی لگا رہتا ہے کہیں ان کا استحقاق مجروح نہ ہو جائے۔ گھوڑے کی ایک دم ہوتی ہے اور اگر دم نہ ہوتی تو اسے بھی ستر ڈھانپنے کے لیے شلوار پتلون پہننا پڑتی۔ صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں میں تو لوگوں نے جانوروں کو کپڑے پہنانے شروع کر دیئے ہیں۔ بکریوں کو بریزئیر پہنے ہم نے خود دیکھا ہے۔ مغل بادشاہ بابر سے کسی نے پوچھا۔ آپ کہاں پیدا ہوئے تو بولے گھوڑے پر۔ مگر ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اسی مغل خاندان کا ایک شہزادہ گھڑ دوڑ کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلا تو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اس کی ماں نے نصیحت کی۔ بیٹا دھیان سے زیادہ تیز گھوڑا نہ دوڑانا۔

آشنائیاں

اپنے اخبارات میں ہم روز یہ خبر پڑھتے کہ فلاں لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار

ہو گئی۔ تو تسلی ہوتی چلو آشنا کے ساتھ ہی گئی ہے کسی اجنبی کے ساتھ تو نہیں گئی۔ وہاں ہمیں ایک سفری کتاب ملی دوست نے بتایا یہ میرے دادا سے سفر کرتی مجھ تک پہنچی ہے۔ اسی لیے وہ اس کی دادی کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کتاب میں لکھا تھا اگر آپ کسی کو بیوٹی فل بنانا چاہتے ہیں تو اس سے آشنائی کریں۔ لو سب سے اچھا بیوٹیشن ہے۔ تب سے ہمارا دل ہر کسی کو خوب صورت بنانے کو چاہنے لگا۔ سولن ولسن کہتا ہے خوبصورت عورت وہ ہے جو مجھ سے محبت کرتی ہے۔ روسیوں کے نزدیک عورت اور واڈکا کا یہ فرق ہے کہ ان میں ایک بوتل میں ہوتی ہے۔ لیکن وہ محبوبہ کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے وہ اسے بوتل سے نکال رہے ہیں۔ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ شکر ہے ورنہ تو وہ بہت کچھ دیکھ لیتی۔ آزادی کے بعد وہاں یہ تبدیلی آئی ہے کہ ایک بچہ کہہ رہا تھا ہمارے گھر میں اب ہر کسی کے لیے الگ کمرہ ہے۔ ایک میرے بھائی کے لیے، ایک بہن کے لیے لیکن امی بے چاری کو اب بھی ابا ہی کے کمرے میں سونا پڑتا ہے۔ میڈم نے ہمیں بتایا کہ میری خاوند سے نہیں بنتی پھر بھی میں اسے چار لڑکیوں جتنی محبت کرتی ہوں۔ جس نے میڈم کو دیکھا ہے وہ اس بات پر یقین بھی کرتا ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اپنے سائے میں رکھنا چاہتی ہوں تو ہم نے کہا تھا۔ میڈم آپ کا سایہ ماشاءاللہ اتنا ہے کہ اس میں آپ پورے محلے کو دیکھ سکتی ہیں۔ وہ کہتی پتہ نہیں میں نے کون سے غلطی نہیں کی کہ میرا خاوند مجھے ماننا ہی نہیں چاہتا۔ ویسے عقل مند عورت وہ ہوتی ہے جو ان باتوں کا نوٹس نہ لے جو بستر پر کہی جاتی ہیں۔ محبت جذبات کا وہ سمندر ہے جسے چاروں طرف اخراجات نے گھیر رکھا ہے۔ کمیونزم

میں روٹی، کپڑا اور مکان ملتا حالانکہ بندے کو روٹی کے بعد محبت چاہیے۔ محبت کے بعد وہ کپڑے ڈھونڈتا ہے۔ یوں نعرہ روٹی، کپڑے اور گھر ہوتا تو ابھی تک کمیونزم نے گھر کیا ہوتا۔ دنیا میں تمام لوگ لورز سے محبت کرتے ہیں۔ سوائے ان کے جو فون کرنے کے لیے آپ کی کال ختم ہونے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس سفری بک میں ایک نصیحت تھی جو یہ ہے کہ کبھی کسی لڑکی کو یہ نہ کہو کہ تم خوب صورت ہو کہو کوئی دوسری عورت تم جیسی نہیں وہ خوش ہو جائے گی اور تم جھوٹ بولنے سے بچ جاؤ گے۔

خلائی محبت

لینا کام سے فارغ ہو کر اپنے کسی مہمان کو چاند دکھانے بالکونی میں لے جاتی۔ ہم سمجھتے وہ بالکونی میں چاند چڑھانے جاتی ہے۔ تاشقند میں ہماری آخری رات وہ ایک خلاباز کی خلائی محبت کا ذکر کرنے لگی۔ ہم نے پوچھا خلائی محبت وہ ہوتی ہے جو خلا میں ہو یا جس میں خلا ہو۔ بولی آپ کے ہاں خلاتب پیدا ہوتا ہے جب ہوا نہ ہو۔ ہمارے ہاں خلاتب پیدا ہوتا ہے جب کوئی ہوا ہو جائے۔ ہم نے کہا ہمارے عاشق بھی خلائی ہیں۔ ان سے محبوب پوچھتے ہیں دب اکبر کہاں ہے تو وہ کہے گا آپ کہاں چاہتی ہیں حکم کریں۔ ہمارا عاشق تو محبوبہ کے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لاتا ہے۔ لینا نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک تارہ ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ آپ کے ساتھ پاکستان سے کوئی عاشق تو یہاں نہیں

آیا۔

دا۔دا

ہم نے پورا ازبکستان چار حرفوں میں دیکھ لیا۔ ایک دا یعنی ہاں۔ اگر دو بار دا، دا کہتے تو دادا خان نوری آ جاتے۔ دوسرا لفظ نیت یعنی نہیں۔ پتہ چلا کہ یہاں آنے والوں کو ''دا'' اور ''نیت'' ضرور سیکھنا چاہیے وہاں دس دن گزارنے کے بعد ہم نے دادا خان نوری سے کہا ''آپ کی عورتوں کو بھی اب ''نیت'' سیکھنا چاہیے۔'' تیسرا لفظ سپاسی با یعنی شکریہ اور چوتھا خراشو یعنی اچھے ہو پیارے ہو۔ ہم نے یہ لفظ اتنی بار کہے کہ ساتھی ہمیں باتونی کہنے لگے۔ البتہ نیت کا لفظ استعمال کرنے کی نیت کبھی نہ رہی۔ دادا خان نوری جو یہاں کی ادبی ٹرین میں جوادیبوں کی نقل و حمل کے کام آتی ہے شکر ہے ان کے حلقے میں کوئی خاتون نہیں ورنہ یہ نقل و ''حمل'' قابل اعتراض ہو جاتی۔ دادا خان نے کچھ اور لفظوں کے مطلب بھی سمجھائے مثلاً انہوں نے بتایا کہ ہمارے دفتروں میں بڑی خوب صورت ردی کی ٹوکریاں ہوتی ہیں جنہیں افسر کی میز کا دراز کہتے ہیں وہ پولیس سٹیشن سے مراد بھی ٹائیلٹ لیتے۔ کہتے پولیس سٹیشن ایسی جگہ ہے جہاں بندہ کچھ دے کر ہی آتا ہے۔

پرستان پلٹ

آج ہمارا ازبکستان سے واپسی کا دن ہے۔ ہم پرستان پلٹ ادیب بننے والے

ہیں ۔ہم نے وہاں دنیا کے عجوبے دیکھے ۔ساتھی نے پوچھا۔دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ کون سا دیکھا ؟ کہا ''انسان''۔آج لینا کی ڈیوٹی نہیں تھی وہ بتاتی کہ وہ ایک شرٹ خریدنے کے لیے کئی دنوں سے پاکستانی اکٹھے کررہی ہے۔عجیب لڑکی تھی جو وہاں کپڑے پہننے کی بات کرتی تھی ۔ ہمارے پاس ازبکستان کی بہت سی کرنسی بچ گئی تھی ۔ہم نے اسے لفافے میں بند کیا اوراس کی جگہ ڈیوٹی پر آئی لڑکی کو دے دیا کہ یہ لینا کو دے دینا۔وہاں لڑکیوں کا آپس میں اس قدر اتفاق ہے کہ ہم نے وہاں دو دو، تین تین لڑکیوں کو اکٹھے چپ بیٹھے دیکھا۔ ہمارے ہاں تو نواز شریف کے دور میں ''اتفاق'' میں برکت پڑی تھی ۔ہمیں یاد ہے ہوسٹل میں ایک بار لڑکا رات کے وقت پوسٹر لگا رہا تھا کہ اس سے دیوار پر لگ نہیں رہا تھا۔ہم نے گزرتے ہوئے کہا ہم آپ کی مدد کریں تو اس نے غصے سے کہا جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔آخر اس نے وہ پوسٹر لگا ہی لیا۔اس پر ایک پارٹی کی طرف سے لکھا تھا ''اتفاق میں برکت ہے''۔جب ہم سامان اٹھا کر ہوٹل سے نکل رہے تھے تو نئی فلور انچارج فلور نے ہمیں ایک گلابی لفافہ یوں پیش کیا جیسے بی۔اے کی سند دے رہی ہو۔

شاہ زندہ

جو مر گئے ہیں ہم انہیں بآسانی زندہ مان لیتے ہیں۔البتہ جو موجود ہیں انہیں یہ منوانا پڑتا ہے۔وہاں ایک مزار ''شاہ زندہ'' ہے۔اس قبرستان کی سیڑھیاں کوئی چڑھتے وقت گنے اورواپسی پر گنتی برابر نہ رہے تو یہ شخص گناہ گار مانا جاتا ہے اور

اسے اس وقت تک سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہنا پڑتا ہے۔ جب تک گنتی برابر نہ ہو جائے۔ ویسے ہمیں تو یہ کردار سے زیادہ حساب کی خرابی لگی۔ وہاں کے لوگوں کا اپنے بزرگوں کے بارے میں یہ علم ہے کہ علم شیر نوائی کی 550 سالگرہ کی تقریب ہوئی تو ایک وزیر خاتون جو اس تقریب میں خصوصی مہمان تھی اس نے پوچھا۔ جس کی سالگرہ ہے وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں۔ جب ہم پاکستان کے لیے جہاز پر سوار ہونے لگے تو دیکھا لوگ شراب کی بوتلیں بھی لائے ہیں وہ بوتل جس میں سب سے زیادہ شراب آسکتی ہے وہ انسان ہے۔ ہمارا ایک گوجرانوالہ کا جاننے والا مل گیا اس کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر ہم نے پوچھا۔ اس میں کیا؟ بولا دم کیا ہوا پانی ہے۔ پوچھا کہاں سے لائے ہو؟ بابا شاہ زندہ کے مزار سے اس پانی سے کئی معجزے رونما ہوئے ہیں۔ گونگے بول پڑتے ہیں، ہر غم کا علاج، بڑے معجزے ہیں شاہ زندہ کے۔ ہم نے ڈھکن کھول کر اسے سونگھا اور کہا یہ تو شراب ہے؟ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ واہ بابا شاہ زندہ ...... دیکھا آپ نے بابا کا ایک اور معجزہ۔

On Air

جہاز اور جوش صاحب On Air تھے۔ ہم نے ازبکستان کا ایک سفر کیا جبکہ جوش صاحب بولے۔ میں نے دو سفر کیے ہیں۔ پوچھا وہ کیسے؟ بولے ایک میرا ازبکستان کا پہلا سفر اور دوسرا میرا ازبکستان کا آخری سفر۔ طیارے میں ہماری سیٹ

سے آگے نوسموکنگ زون تھا اور پیچھے سموکنگ زون ہے اس لیے پیچھے منہ کر کے سانس مت لیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یکدم رنگین فلم چلتے چلتے بلیک اینڈ وائیٹ ہو گئی ہو۔ جوش صاحب نے آنکھیں بند کیں اور پھر تاشقند پہنچ گئے۔ ہم نے جیب میں گلابی لفافہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

ADAM'S MOUNTAIN

ہم نے سوچا ہوٹل والوں نے ہمارے چال چلن سے متاثر ہو کر ٹیفکیٹ دیا ہو گا۔ مہاتما بدھ کہتا ہے جدائی کا لمحہ پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ پیدا ہونا جدا ہونا ہے۔ باقی ساری زندگی لوگ ملنے میں لگے رہتے ہیں یا ملنے سے روکنے میں۔ برا کام وہ ہوتا ہے جو آپ نہیں کر رہے ہوتے اور بڑا کام وہ جو آپ کر رہے ہوتے ہیں۔ گلے ملنا ضروری نہیں ہاتھ ملانے سے بھی یہی محسوس کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہاتھ کے ساتھ پورا بندہ ہو۔ یہ بات لینا نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ خط لینا کا ہی ہو۔ ہم نے خط کھولا تو وہ اسی کا تھا۔ اس میں ایک نظم تھی:

Darling you can love one still can have fun.

Darling you can love two and still be true.

Darling you can love three and still be free.

Darling you can love four and still can love more.

Darling you can love five and still be alive.

Darling you can love six and still not be sick.

Darling you can love seven and still go to heaven.

Darling you can love eight and still can walk sraight.

Darling you can love nine and still be mine.

ten but not eleven.

دس دن ازبکستان میں گزارنے کے بعد ہم زمین پر اتر رہے تھے۔ خط کے آخر میں لکھا تھا ''تم نے جھوٹ کہا تھا تم یہاں قہقہے اور مسکراہٹیں اکٹھی کرنے آئے ہو تم تو یہاں قہقہے اور مسکراہٹیں بکھیرنے آئے تھے۔''

The End--------------- ختم شد

لفظِ آغاز

چار پانچ ضرب المثال ہیں۔

۱۔ بلی کے بھاگوں چھینکا چھوٹا۔

۲۔ جو بوگے سو کاٹو گے۔

۳۔ جو ادھیڑے وہی نیڑے۔

۴۔ جو بولے وہی کھولے۔

۵۔ تھوتھا چنا باجے گھنا۔

۶۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔

اِن میں سے کسی ایک ضرب المثل کے مطابق جب میں نے اردو زبان کے لاکھوں مزاح نگاروں کے تخلیق کردہ کروڑوں مزاح پاروں میں سے محض بائیس تیئیس ظریفانہ مضامین منتخب کئے ہیں تو مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اب یہ بھی بتا دو کہ میری نگاہِ انتخاب ان ہی ظرافت نگاروں اوران کی ان ہی تخلیقات پر کیوں لپکی ہے۔ تو اس سلسلے میں میری وضاحت یہ ہے کہ ان نگارشات کو پڑھتے ہوئے میں چونکہ بے وقوفوں کی طرح مسلسل قہقہے مارتا رہا تھا اس لیے میرے دِل نے کہا ہو نہ ہو یہ ضرور مزاحیہ مضامین ہیں لہذا میں نے بلا تامل وتردد انہیں اٹھا کر کتاب میں ڈال لیا۔ بس اس کے علاوہ اگر میرا کوئی اور ارادہ، مقصد، نظریہ یا منصوبہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔

حاشا وکلا ڈیڑھ دو مزاح نگاروں کو نکال کر باقی کے مزاح نگاروں سے میری

ذرا بھر بھی شناسائی نہیں ہے۔ حاجی لق لق، امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری وغیرہ سے میری کبھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی، البتہ احمد ندیم قاسمی، فکرتونسوی، ابنِ انشا، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر اور شفیق الرحمٰن سے میں آشنا ہوں۔ کئی بار بیس پچیس گز کے فاصلے سے ان بلند پایہ قلمکاروں کا دیدار کر چکا ہوں۔ ان میں سے بھی شاید ایک آدھ جلیل المرتبت مزاح نگار اب اِس جہانِ فانی میں نہیں رہا۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے مرحومین کے نام ابنِ انشاء اور فکرِ تونسوی ہیں آہ خاک میں کیا صورتیں ہوں گیں جو پنہاں ہوں گئیں۔ بہرحال جانے والوں کی فرحت انگیز تحریروں سے یہ چمن ہمیشہ مہکتا رہے گا۔

سو میری اس وضاحت کے بعد وہ گراں ڈیل اور مستند مزاح نویس جن کے شہ پارے اس کتاب میں نہیں سا سکے شکوہ تھوک دیں گے اور صبر و شکر سے کام لیں گے۔ تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندگی نے میرے ساتھ وفا کی تو منتخب مزاح پارے حصہ دوم'' میں ان کی اعلیٰ و ارفع ذہنی کاوِش کو شکریئے کے ساتھ ضرور شامل کروں گا۔ بقول شاعر پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ انہیں ہمت و حوصلہ سے کام لینا چاہیئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جو کرتا ہے بہتر ہے کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے حصہ دوم حصہ اول موقر و معتبر قرار پائے۔ یہاں میں یہ بتادوں کہ ظریفانہ اخباری کالموں کا میں الگ انتخاب کروں گا۔ آخر کھوتے گھوڑے میں کچھ تو فرق برقرار رہنا چاہئے۔ اخباری کالم اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا ہے کہ انہیں مزاحیہ مضامین سے الگ ہی رکھا جائے۔

مزاح کہتے کسے ہیں، اس پر اَن گنت جید اور جغادری ناقدین نے لاتعداد

مضمون باندھے ہیں۔ جارج واشنگٹن، گیلی لیو، ہیون سانگ، والٹ ڈزنی، دادا بھائی پھالکے، مارلن براندو اور ہیموں بقال وغیرہ۔

ایسی نابغہ روزگار ہستیوں نے طنز و مزاح کی تفہیم و تشریح کے لیے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ ان محترم ناقدین کے مطابق مزاح اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں جس معاشرے سے مزاح غائب ہو جائے، اس میں اموات کی شرح بڑھ جاتی ہیں۔ میں نقاد تو نہیں پھر بھی محو بالا ناقدین کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور اس میں اضافہ کرتا ہوں کہ ایک مزاح پارہ مزاح پارہ ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر بیوی یا محبوبہ یا باس سے جھگڑا ہو جائے تو قہقہہ آفرین تحریر بھی بدمزہ محسوس ہو گی اس کے برخلاف اگر بیوی، محبوبہ یا باس نے بہتر سلوک کیا ہو، یا بھری بھری تنخواہ ملی ہو یا موٹی آسامی ہاتھ لگ گئی ہو تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ کے مصداق پھیکی سے پھیکی تحریر پڑھ کر بھی حلق سے ہنسی نمودار ہو جائے گی

۔

بس مزاح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ مہربانی کر کے اس پر گزارہ کیجئے۔ ہاں اگر نئی تو جیہ و توضیح میرے تھتے چڑھ گئی تو اس حصہ دوم میں سنہری حروف میں پیش کر دوں گا۔ اس انتخاب میں چند ایک مضمون مزاحیہ ہیں اور چند ایک طنزیہ۔ مزاحیہ کون سے ہیں اور طنزیہ کون سے ہیں، میں ان کی نشاندہی ضرور کر دیتا پر چونکہ میں ایک ضروری کام کرنے باہر جا رہا ہوں جس کی وجہ سے میرے پاس سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ بدیں وجہ آپ خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کو سامنے رکھ کر مزاحیہ اور طنزیہ مضامین چھانٹ لیجئے گا۔ اللہ آپ کا بھلا

کرے گا۔

آخر میں میں ان تمام مزاح نگاروں کا تہہ دِل سے شکر ادا کرتا ہوں جن کے مزاح پاروں کو میں نے اس کتاب کے لیے چنا ہے، مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی وہی ہنسنے ہنسانے والی تحریریں قلمبند کرتے رہیں گے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ تا کہ تبسم سے تہی پر تبسم دوبارہ طلوع ہو جائے۔ ساتھ ہی میں ممنون ہوں کہ وہ ان دنوں مزاحیہ کتابیں خصوصی طور پر شائع کر رہے ہیں جس کی وجہ سے مزاحیہ کتابوں کا جو قحط نظر آ رہا ہے وہ دور ہو جائے میری کتاب بھی انہوں نے اسی مقصد کے تحت چھاپی ہے۔

ضیاء ساجد

۱۰ مارچ ۱۹۸۹ء

احمد ندیم قاسمی

ایک رسمِ افتتاح

ہم نے لاہور کی ایک آبادی سمن آباد میں بجلی کے ایک ٹرانسفارمر کا افتتاح کیا تو یار لوگ ہینڈ پمپوں اور ٹونٹیوں تک کی رسمِ افتتاح ادا کرنے کے منصوبے بنانے لگے ہمیں انتظار تھا کہ اس ٹرانسفارمر کی برکت سے ہمارے محلے میں بجلی کی وولٹیج میں اضافہ ہو تو ہم اس رسمِ افتتاح کی مکمل کاروائی یار لوگوں کی خدمتِ اقدس میں پیش کریں اور انہیں عبرت پکڑوائیں ۔ ہمیں خدشہ تھا کہ اگر ہم نے وولٹیج میں اضافے سے پہلے ہی اس رسمِ افتتاح کا راز فاش کر دیا تو ممکن ہے اس اضافے کی نوبت ہی نہ آئے ۔ بہر حال اب یہ اضافہ ہو چکا ہے ۔ اس لیے آتشِ رشک میں جل بھن کر کباب ہو جانے والوں کی خدمت میں تفصیل عرض ہے ۔

ہم گزشتہ کئی برس سے شور مچا رہے تھے کہ سمن آباد کے اس محلے میں وولٹیج اتنی کم ہے کہ صرف دیکھنے کے لیے ایک سو کینڈل پاور بلب جل رہا ہے یا نہیں ، ماچس جلانی پڑتی ہے ۔ شام سے رات کے نو بجے تک ہمارے ٹی وی سیٹ پر صرف تاش کے پتے کے برابر روشنی آتی ہے اور دو سو روپے سالانہ کے ٹی وی لائسنس کو آنکھ پر آنکھ مارتی ہوئے غائب ہو جاتی ہے ، ہم نے واپڈا کی خوشامد کی ۔ ہم اس پر گرجے برسے ، پھر لعن طعن پر اتر آئے مگر جس طرح ٹیلی فون منظور ہونے کے بعد بھی محکمے والوں کو اس نمبر کا " کیبل پیئر " نہیں ملا کرتا ، بعینہ واپڈا والوں نے ہمیں بتایا

کہ ان کی نیت تو ٹھیک ہے مگر ٹرانسفارمروں کی قلت ہے چنانچہ اگر آپ کمرے میں ایک سو کینڈل پاور بلب کے ساتھ ہی موم کی کینڈل بھی جلالیا کریں تو کمرہ تسلی بخش حد تک روشن ہو جائے گا۔

ہم نے یہ تجربہ بھی کر دیکھا، مگر موم بتی جلانے سے ٹیلی ویژن سیٹ کا تو کچھ نہیں بگڑتا، سو ہم نے مزید شور مچایا۔ آخر واپڈا والوں کو ہم پر ترس آ گیا ایک روز ہم نے دیکھا کہ ہمارے محلے کی سڑک کے کنارے نئے کھمبے گاڑے جا رہے ہیں۔ ایک دن ایک محلے دار خبر لایا کہ فلاں موڑ پر نیا ٹرانسفارمر بھی لگ رہا ہے۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ہم لپک کر ٹرانسفارمر دیکھنے پہنچے تو واپڈا کے محنت کشوں میں سے ایک نے ہمیں پہچان لیا اور بولا۔ ''یہ ٹرانسفارمر فٹ ہوئے تو اس کی رسمِ افتتاح آپ کو ادا کرنی ہوگی''۔ تصور ہی تصور میں ریشم کا فیتہ کاٹتے ہوئے ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ایک روز افتتاح کرنا ہی پڑ گیا۔

اس روز لاہور کا آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ مری اور کوئٹہ دونوں طرف سے برفانی قینچیوں سے لدی ہوئی تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی اور ہم مشوش تھے کہ رسم افتتاح کے جلسے کا سارا شامیانہ بھیگ جائے گا اور واپڈا کے حکام اور معزز شہریوں کے لباس خراب ہوں گے۔ خود ہم بھی سردی سے کپکپا رہے تھے مگر ملک کے تعمیری منصوبوں کے لیے تو قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں سو ہم قربانی دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے اور قینچی چلانے کی مشق کر رہے تھے تا کہ اپنی اس حرکت کو دوہرا نہ بیٹھیں جب ہم نے پان سگریٹ کی ایک دکان کی رسمِ افتتاح کا فیتہ کاٹتے ہوئے فیتے کی جگہ اپنی انگلی کاٹ ڈالی تھی۔

نوجوان مزدور وقت مقررہ پر ہمیں لینے آ گیا اور جب ہم نک سک سے درست ہو کر ٹرانسفارمر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ محلے کے صرف دو معززین کا انتظام کیا گیا تھا جن میں سے ایک معروف شاعر قتیل شفائی اور دوسرے روزنامہ ''امروز'' کے رکن ادارت فخر ہمایوں تھے۔ باقی حاضرین میں واپڈا کے چار مزدور نصف جن کے دو مزدور ہوتے ہیں ہمیں بتایا گیا کہ واپڈا کے متعلقہ حکام بوجہ خرابی موسم گھر سے نہیں نکل سکے اور شامیانے کا تکلف اس لیے نہیں کیا گیا کہ یہ نہایت بے تکلفانہ رسمِ افتتاح ہے۔ یہ سنتے ہی ہمارا تو فیوز ہی اڑ گیا، مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ عرض کیا کہ چلیے فیتہ تانیے اور قینچی لایئے۔ اس پر محنت کشوں کی ہنسی نکل گئی۔ بولے: ''یہ رسمِ افتتاح کچھ مختلف طرح کی ہوگی''۔

ہم سے کہا گیا کہ ٹرانسفارمر کے قریب ہی ایک مکان کی یک خشتی چاردیواری پر چڑھ جائیں سو ہم چڑھ گئے، مگر اس عالم میں کوئی سولی پر بھی کیا چڑھا ہوگا۔ ایک اینٹ کی پانچ فٹ اونچی دیوار پر کھڑے ہو کر اپنا توازن برقرار رکھنا خود ایک رسمِ افتتاح تھی، مگر جب ہم نے محسوس کیا کہ زمین گھومنے لگی ہے تو ہم نے اپنے قریب کھڑے ہوئے مزدور کا سہارا لے لیا۔ وہ چونک کر بولا:

''مجھ پر سے ہاتھ ہٹا لیجیے، فوٹو اتر رہا ہے''! ہم نے سامنے دیکھا تو واقعی کوئی پریس فوٹوگرافر کیمرہ لیے کھڑا تھا۔ محض تصویر اتروانے کے شوق سے یکا یک ہمارا توازن بھی قائم ہو گیا اور اینگل بھی بن گیا، مگر جب فوٹو کھینچ چکا تو ایک بار پھر ہم دیوار پر سے سر کے بل گرنے کی تیاریاں کرنے لگے! ہم فوراً شاید اس لیے نہیں گرے کہ ہم یہی طے نہیں کر پا رہے تھے کہ سڑک پر گرے یا چاردیواری کے اندر،

سڑک پر گرنے کا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح آس پاس سے ایک ہجوم جمع ہو جاتا اور رسمِ افتتاح کے جلسے میں رونق پیدا ہو جاتی ،مگر پھر سوچا کہ انتہا درجے کی سردی اور پھوار مسلسل جاری ہے ،سو اس موسم میں تو دیوار پر سے گر کر مر بھی لیا جائے تو کوئی پوچھنے نہیں آئے گا۔

چار دیواری کے اندر گرنے کا یہ فائدہ ہوتا کہ مالک مکان یقیناً ہمیں اُٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے جاتے اور وہاں گرم گرم چائے اور کیک پیسٹری سے ہماری تواضع کی جاتی ۔مگر اس تواضع سے پہلے کی تواضع نے ہمیں خوفزدہ کر رکھا تھا ۔دراصل اس مکان کے برامدے میں ایک پلا ہوا کتا بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہم گرتے تو ظاہر ہے کہ ہماری تواضع کے سلسلے میں وہ سب سے نمبر لے جاتا، چنانچہ ان دو دہشتوں کے درمیان ہم دیوار پر کھڑے ڈولتے رہے ۔اس خوف سے اب کہیں ہمیں بجلی کے کھمبے پر چڑھنے کے لئے نہ کہا جائے ۔ہم نے فریاد کی کہ تصویر تو اتر گئی اور یوں رسمِ افتتاح بھی ہوگئی ، اب ہمیں اجازت مرحمت فرمایئے اور ہماری دعا لیجئے ،مگر انچارج محنت کش، جو دیوار پر ہمارے قریب ہی کھڑا تھا، بولا ۔''ابھی کہاں صاحب ۔رسمِ افتتاح تو اب ادا ہو گی ۔'' ہم نے پوچھا۔'' کھمبے کی چوٹی پر چڑھنا تو ضروری نہیں ہے نا؟ ''ہنس کر بولا جی نہیں، بس آپ کو یہ راڈ پکڑ کر اوپر ٹرانسفارمر کے اس حصے تک لے جانا ہے جہاں آپ کو تاروں کا گچھا سا نظر آ رہا ہے''۔ہم نے اوپر دیکھا تو ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھوار نے ہماری عینک کے شیشوں کو اندھا کر دیا تھا اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی عینک کے شیشوں کے لیے ''وائپر'' ایجاد نہیں ہوئے ۔

تن بہ تقدیر، ہم نے راڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہم سمجھے بانس کا ہوگا اور ہلکا پھلکا ہوگا، مگر وہ تو ٹھوس فولاد کا راڈ نکلا۔ انچارج نے کہا بسم اللہ پڑھیئے۔ راڈ تھامتے ہی اس کے غیر متوقع وزن نے ہمیں اپنی طرف کھینچا تو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد مارے خوف کے کلمہ شہادت پڑھ گئے وہ تو محنت کشوں کا انچارج دور اندیش نوجوان نکلا کہ اس نے ہمیں تھام لیا ورنہ ہم تو راڈ کے ساتھ نیچے سڑک پر لینڈ کرنے جا رہے تھے۔

انچارج نے راڈ تھامنے میں ہماری مدد کی مگر جب راڈ تاروں کے گچھے تک بلند ہو چکا تو یکا یک ہمیں محسوس ہوا کہ ہم بے سہارا رہ گئے ہیں اور انچارج نے ہمارے کندھے پر سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ ہم نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں التجا کی کہ ہمیں گرنے سے روکے رکھے۔ مگر اُدھر سے جواب آیا کہ خبردار ہو جائیے رسم افتتاح کی اصلی اور بڑی فوٹو اب اتر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ فوٹو کے وٹامنز نے فوری طور پر ہمارا توازن پھر سے قائم کر دیا اور افتتاح کی تصویر اتر گئی۔ ہم نے خوش ہو کر پوچھا۔

''اجازت ہے؟'' انچارج ایک بار پھر ہنسا اور بولا: ''مگر اس راڈ کے ہک کو تاروں کے گچھے کے پاس لے جا کر جھٹکا بھی تو دیجئے تا کہ نئے ٹرانسفارمر کی بجلی نئی وائروں میں داخل ہو سکے''۔ ہم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''کیا آپ ہی ہمارا یہ چھوٹا سا کام نہیں کر دیتے؟ دراصل ہم خوفزدہ ہیں کہ اگر لوہے کا یہ راڈ ٹرانسفارمر سے چھو گیا اور بجلی راڈ کے رستے ہمارے جسم میں داخل ہو گئی تو کہیں ہم خود ہی ٹرانسفارمر ہو کر نہ رہ جائیں۔

جب انچارج نے دیکھا کہ رسمِ افتتاح ادا کرنے والے بزرگ خاصے افتتاحی قسم کے آدمی ہیں تو راڈ ہمارے ہاتھوں سے لے کر ہک کے ذریعے اوپر ایک جھٹکا دیا اور راڈ نیچے ایک اور مزدور کے حوالے کر کے تالی بجائی۔ اس پر چھ سات تالیاں بجی اور ہمیں سیڑھی کے ذریعے دیوار سے اترنے کی اجازت ملی۔ نیچے آ کر ہم نے تقریر کے جملے اپنے ذہن میں جمع کرنے شروع کر دیئے اور محنت کی برکت اور محنت کش کے وقار کے بارے میں موزوں اشعار یاد کرنے لگے، جب انچارج بولا ''بہت بہت شکریہ۔ آپ کو تکلیف دی۔ خدا حافظ۔'' تقریر ہمارے ذہن میں پچھاڑ کھا کر گری۔ تب ہم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور یوں کڑک کر خدا حافظ کہا جیسے کہہ رہے ہیں کہ بس نہیں چل رہا ورنہ تمہیں گالی دیتے۔

بارش تیز ہو گئی تھی چنانچہ ہم گھر کی طرف بھاگے اور جب اپنے کمرے میں داخل ہو کر بلب جلانا چاہا تو ہمیں بتایا گیا کہ بجلی چلی گئی ہے! یہ تھی اس رسمِ افتتاح کی کاروائی جس نے یار لوگوں کی نیندیں حرام کر ڈالی ہیں مگر وہ جو ٹرکوں اور بسوں پر لکھا ہوتا ہے تو کیا عمدہ لکھا ہوتا ہے کہ

قسمت ہمارے ساتھ ہے جلنے والے جلا کریں

شوکت تھانوی

خطوطِ غالب

میر مہدی، خوش رہو،

آفریں، صد آفرین! خدا جانے کب کا بدلہ لیا۔ وہ بوڑھا آدمی، بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آ گیا۔ دھوکہ کھا گیا، پھر اسی دنیا میں آبسا جس سے بھاگنے کے لیے زندگی بھر موت کا طالب رہا۔ تم سے رخصت ہو کر مختلف سیاروں میں بھٹکتا ہو دنیا میں آ کر دم لیا اور سیدھا دلی پہنچا، مگر ہائے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی، اب یہاں نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں، مومن خاں کہاں ویرانی سی ویرانی ہے جہاں دلی تھی وہاں جنگل بیاباں نظر آیا۔ انسانی شکل کے وحوش نظر آئے۔ پوچھا جناب کی تعریف؟ جواب ملا، ست سر کاری اکال۔ معلوم ہوا کہ تختہ ہی الٹ چکا تھا۔ ہند اور سکھ ادھر ہیں جہاں ہم تم تھے۔ مسلمان وہاں ہیں جہاں جہانگیر کو بھی اگر کسی نے پوچھا تو موت نے، نہ یہاں سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی، دِلی واللہ اب شہر نہیں، کمپ ہے چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر نہ بازار نہ نہر، اب دلی ہیں یا ہند ہیں یا سکھ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی۔ ان میں سے کس کی زبان دلی ڈھونڈوں سنا ہے کہ لکھنو پھر غنیمت ہے آزادی تو جاتی رہی مگر زبان درازی باقی ہے، اپنے مکان کی طرف گیا، مگر وہاں کیا دھرا تھا

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا!

وہ جو کہتے تھے ہم اِک حسرت تعمیر سو ہے

مگر سچ پوچھو تو اب وہ بھی نہیں، اس دِلی سے تو ایک دن میں ہی دل اُچاٹ ہو گیا۔ جان لے کر لاہور کی طرف بھاگا، راستہ کیونکر کٹا کچھ نہ پوچھو، یہاں پہنچ کر اب کس سے کہوں کہ میں نجم الدولہ ہوں، مرزا نوشہ ہوں۔ اسد اللہ خاں ہوں، غالب ہوں وہی غالب جس کے کلام کے مرقعے چغتائی بناتے ہیں جس کو ولایت میں چھپواتے ہیں۔ جس کو ہندوستان کی الہامی کتاب بتاتے ہیں۔ کوئی منہ نہیں لگاتا۔ کوئی بات نہیں پوچھتا، مہاجرین کے ایک کیمپ میں پڑا ہوں، اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں، میں ننگا ایک کھری چارپائی پر پڑا حقہ پی رہا ہوں، بھلے کو کرتہ انگرکھا گلے میں نہیں ورنہ جو کچھ سوچ رہا ہوں اس کے بعد پھاڑ ڈالنا ضروری ہوتا۔

میاں لڑکے! تم نے تو کہا تھا کہ میرے لیے دنیا میں جانے کا وقت اب آیا ہے غالب کو اب دنیا والوں نے پایا ہے۔ وہ آنکھیں بچھائیں گے۔ جان چھڑکیں گے۔ پوجیں گے، مگر اب بتاؤ میں کیا کروں؟ تجدید حیات کے بعد کیونکر مروں؟ پر تیاریاں تو درکنار یہاں تو دو روٹیوں کا بھی سہارا نہیں۔ شراب کیسی پانی دینا کسی کو گوارہ نہیں کچھ معلوم بھی ہے میاں صاحبزادے! شاعری سے زیادہ ارزاں آج کل کوئی شغل نہیں جس کو دیکھئے ایک تخلص لیے پھرتا ہے، اور شاعری کا دم بھرتا ہے شاعری کے نام سے خرافات کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ اپنے آپ کو شاعر کہتے بھی شرم آتی ہے، جو وبائے عام میں مرنے سے بھاگتا تھا، اس کی قسمت میں وبائے عام کی یہ زندگی لکھی ہوئی تھی۔ یہ حال دیکھ کر شعر کہنے سے توبہ کی۔ اصلاح

دینے سے توبہ کی، شعر سننا تو ممکن ہی نہیں بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے جی متلاتا ہے ۔ پندرہ برس کی عمر سے پچتر برس کی عمر برس کی عمر تک پہلے شعر کہتا رہا۔ یعنی ساٹھ برس بکتا رہا پھر عالم بالا میں سب جمع ہو گئے تھے تو کچھ شغل رہا، مگر اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ لوگ مجھے زمرہ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں کبھی مجھ سے پرسش نہ ہو، مگر زندہ رہنا ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اب اللہ جانے کیا کرنا پڑے گا۔

ایک ہمدرد نے رائے دی ہے کہ ریڈیو جاؤں اور فلم کمپنیوں کو سونگھوں، سنا ہے کہ آج کل شاعروں کی اگر کھپت ہے تو ان ہی مقامات پر ہے، اب خدا جانے یہ ریڈیو کیا بلا ہے اور فلم کمپنی کیا تماشا ہے۔ خیر میرا کیا ہے اندازہ کرنے کے لیے کبھی چلا جاؤں گا بیکار ہی تو پڑا ہوں۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین اور ذاکر حسین، میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا۔ مرزا حاتم علی مہر کی کوئی حور یا غلمان ملے تو کہلا دینا کہ اگلا خط ان ہی کو لکھوں گا ۔ میرا یہ خط ان کے علاوہ مرزا علاء الدین خاں علائی، حکیم مومن، میرزا تفتہ، سید یوسف مرزا، قدر بلگرامی، حکیم غلام نجف خان وغیرہ کو سنا دینا، میرن صاحب کو دعا، میر تقی میر کی طرف جانا تو میرا اسلام لے کر جانا اور میرے لیے دعائے موت لے کر آنا۔

از سر نو موت کا طالب

غالب

۲

اے بھائی مرزا حاتم علی صاحب مہر!

تم کو دیکھنے کے لیے تڑپتے تڑپتے تم سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔ آؤ باتیں کریں۔ ادھر بیٹھو میرے قریب ہاں یہ، اپنے پہنچنے اور دہلی سے لاہور بھاگ آنے کی اطلاع قرۃ العین میر مہدی کو دے چکا ہوں۔ خط دیکھا ہوگا۔ خدا جانے ہنسے ہوگے یا روئے ہوں گے، اچھا اب سنو کہ پھر کیا بیتی جن ہمدرد کا میں نے پچھلے خط میں ذکر کیا ہے، ان کے مشورے سے ریڈیو گیا صاحب میرے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے،
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

یہ عجیب جادو نکلا۔ سر چڑھ کر بولنے والا جادو۔ اس کے ذریعے بیٹھے ہزاروں میل کی آواز سن لو۔ باتیں سن لو۔ اپنی سناتا ہے کسی کی سنتا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ بہرا ہونے کے بعد یہ وصف صرف مجھ میں ہے، مگر اس کو دیکھ کر تو میں بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیے حقے کی طرح ایک چیز کمرے میں رکھی ہوئی ہے اس کے چلم کے قریب منہ لا کر بولئے بس منہ سے بات نکلی اور عالم نشر ہوئی۔ جن گھروں میں وہ صندوقچہ سا رکھا ہوا ہے جس میں یہ آواز پہنچ جاتی ہے وہاں جہاں کی آواز چاہے سن لیجئے ایک سے ایک گانا، ایک سے بیان اور تو اور سنا ہے مشاعرے تک اس ریڈیو پر ہو جاتے ہیں اور یہاں کے مشاعرے سات سمندر پار ولایت والے بھی سن سکتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا واقعہ

ہے، جانے کو تو میں چلا گیا، مگر اب پریشان کہ میں یہاں کس مرض کی دوا بن سکتا ہوں، ان ہمدرد نے تعارف کی رسم ادا کی۔ اس سرے سے اس سرے تک غالب آیا غالب آیا کی دھوم مچ گئی، معلوم ہوا کہ یہ کوئی معمولی جگہ نہیں بلکہ باقاعدہ سرکاری محکمہ ہے۔ اس محکمہ کے افسر اعلیٰ سے اس فقیر کو ملایا گیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اس طلسم کے عقدے حل کرنے لگے اپنی میز کے نیچے خدا جانے کس بٹن کو گھمادیا کہ ایک دیوار سے نہایت میٹھی آواز میں مجھ کو میری ہی غزل سنانے لگی۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اے بھائی! میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنا شراع کردی۔ جانتے ہو کہ آسیب سے میرا نشہ کیسا ہرن ہوتا ہے میں سمجھا کہ ہو نہ ہو کچھ ایسا ہی خلل ہے مگر جب ان افسر اعلےٰ نے گھما پھرا کر سمجھایا تو بارے جان میں جان آئی۔ عقل تو چکر میں رہی مگر دل ٹھر گیا۔ معلوم ہوا ہو کہ اس ریڈیو پر میری غزلیں بہت گائی جاتی ہیں۔ مجھ سے تازہ کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں موقع غنیمت جان کر مطلب پر آ گیا۔ عرض کیا کہ پردیسی، بے سہارا ہوں، جنت کو چھوڑ کر اس کسمپری کی تلافی کردیں جس کا داغ لے کر مرا تھا، مگر فی الحال تو روزوں کی نوبت ہے اور روزی درکار ہے۔ اس محکمہ کے افسر اعلیٰ نے نہایت خندہ پیشانی سے بڑے میٹھے الفاظ میں کہا "بیشک، بیشک، اگر یہ خدمت آپ ہمارے سپرد کردیں تو زہے نصیب"۔

عرض کیا "۔ میاں تکلف چھوڑو نیکی کرسکتے ہو تو پوچھ پوچھ کر نہ کرو"۔

ان صاحب نے سراپا اخلاق بن کر فرمایا۔ ''آپ ہمارے یہاں اسٹاف آرٹسٹ ہوجائیے''۔

پوچھا۔''وہ کیا بلا ہوتی ہے؟''

ایک دلربا تبسم سے بولے ''یہ ایک ملازمت ہے اوراس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ تو اپنے آپ کو ملازم سمجھے مگر ہم آپ کو ملازم نہ سمجھے گے''۔

حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ہم سمجھیں اور آپ نہ سمجھیں۔اس میں ناسمجھی کس کی ہے''۔

کہنے لگے'' ۔قبلہ بات یہ ہے کہ یہ ملازمت سے زیادہ ایک قسم کا ٹھیکہ ہے ہم پر آپ کا دماغ لے لیں گے اوراپنی ضرورت کے مطابق اس کو نچوڑتے رہیں گے ۔ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس دماغ کا جوہر تو ہمارے پاس آجائے گا اور پھوک آپ کے پاس رہ جائے گا۔اس وقت ہم حسبِ شرائط معاہدہ پندرہ دن کا نوٹس دے کر یا اگر آپ سے ایسے ہی خوش رہے تو پندرہ دن کی تنخواہ دے کر آپ کو رخصت کردیں گے

عرض کیا: ''یعنی دماغ کا سارا عرق نکال کر بس رخصت کردیں گے اور اتنا بھی نہ کریں گے کہ اپنی نگرانی میں کسی پاگل خانے میں کم سے کم داخل ہی کرادیں۔ یہ کہاں کی مروت ہے''؟

وہ حضرت مذاق سمجھ کر ہنستے ہوئے بولے۔ ''بہت خوب فرمایا، مگر کیا عرض کیا جائے ۔اس قسم کی ملازمت کی شرطیں ہی کچھ ایسی ہیں۔''

پوچھا۔ ''یہ جتنے یہاں ملازم ہیں سب ان شرطوں پر راضی ہیں''؟

وہ بولے۔ ''جی نہیں، سب ملازم اس قسم کے نہیں ہیں چونکہ دماغ کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ لہٰذا مستقل ملازم صرف وہ ہیں جن کے دماغ سے ہم کو کوئی سروکار نہیں اگر دماغ ہے تو سبحان اللہ ورنہ کوئی مضائقہ نہیں۔ اکتسابی سندیں ہی کافی ہیں۔ ان میں بھی بہت اہل دماغ ہیں ان کو مستقل ملازم رکھنے کے بجائے اسی قسم کا عارضی معاہدہ کیا جاتا ہے۔

عرض کیا۔ ''معلوم نہیں یہ آپ فن کار کی عزت کرتے ہیں یا بے عزتی۔ قدر کرتے ہیں یا ناقدری۔''

وہ صاحب بولے ''بڑھ کر عزت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم ان کو باقاعدہ ملازم رکھنے کی جرات نہیں کرتے۔ اس سے بڑھ کر اور قدر کیا ہو گی، کہ ہم ان کو بعض صورتوں میں سرکاری ملازموں سے زیادہ تنخواہ دیتے ہیں۔ البتہ چونکہ فنکاروں میں ایک خاص قسم کا خناس سا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے اس پندار کو توڑنے کے لیے ہم بڑے سے بڑے فنکار کو چھوٹے سے چھوٹے سرکاری ملازم کے ماتحت کر دیا کرتے ہیں۔''

عرض کیا۔ ''گویا مجھ کو بھی اسی قسم کے لوگوں کی ماتحتی کرنا ہو گی''۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''یہ بات تو ہے قبلہ''۔

میں نے گفتگو کو اختتام تک پہنچانے کے لیے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کام کیا کرنا ہو گا مجھ کو''؟

کہنے لگے۔ ''غزلیں کہتے رہیے۔ منظوم ڈرامے لکھیے۔ بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے گیت لکھیے اور ہمارے یہاں جو گانے والے اور گانے والیاں آتی ہیں ان کے تلفظ درست کرایا کیجیے''۔

پوچھا۔ ''اور تنخواہ کیا ملے گی۔اس نجات کے طالب غالب کو''؟

کچھ سوچ کر بولے۔''ہم آپ کو ساڑھے تین سو تک دے دیں گے''۔

حیرت سے پوچھا۔''خشک؟ یا خلعتوں کے علاوہ؟سنو صاحب!تم جانتے ہو کہ پیشگاہ حضرت سلطان عالم سے بھی خلعتیں پاتا رہا ہوں۔چودہ پارچے کا خلعت ایک بار، اور ملبوس خاص شالی رومال دوشالہ اکثر اوقات مجھ کو اس کی عادت پڑی ہوئی ہے''۔

وہ صاحب بولے قبلہ یہ خلعتوں کا زمانہ نہیں اب تو بس تنخواہ ہی تنخواہ ہے''۔

اب میں نے صاف صاف سنائی۔میاں ہوش کی خبر لو، کس دھیان میں ہو۔ کس خیال میں ہو۔تم ساڑھے تین سو روپے پلی میں غالب کو خریدنا چاہتے ہو۔ اس کے دماغ اور اس کی دماغداری کے دام لگاتے ہو۔یہ دماغ ابھی تو ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ نیلام پر چڑھا دیا جائے، میں تم کو پرکھ رہا تھا۔ٹٹول رہا تھا۔ٹھول کر رہا تھا۔معلوم ہو گیا کہ تمہارے نزدیک میں کتنے پانی میں ہوں۔بخشو مجھ کو''۔

وہ خدا جانے کیا سمجھاتے رہے، کیا کیا فرماتے رہے،مگر میں سیدھا بھاگا اپنے کیمپ کی طرف۔اپنے کو برا بھلا کہتا ہو کہ کیوں آ گیا تھا یہاں۔عزیز گرامی میر مہدی ملیں تو کہہ دیجئے کہ ہاں خوب ہو رہی ہے قدر دانی۔واقعی بقول تمہارے اہل فن کا زمانہ ہے۔

''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' اور پوچھتا ہے تو اس طرح جس کا حال لکھا۔خدا اس پوچھنے سے بچائے۔خدا کسی غیرت دار کو یہ دن نہ دکھائے۔

یہ خط بھی سب کو دکھا دیجیے گا۔کاش پھر سب ایک جا ہوں ہے ہے کیونکر اکجا

ہوں دیکھیے زمانہ اور کیا کیا دکھائے گا کس کس در کی خاک چھنوائے ۔ سید یوسف مرزا ملیں تو مزاج پرسی کر لیجیے ۔ معلوم نہیں اب ان کی خارش کا کیا حال ہے اس بندۂ خدا نے جنت میں بھی خارش کو نہ چھوڑا ۔ اگلا خط ان ہی حضرت کو لکھوں گا ۔ ورنہ نازک مزاج ہیں ناراض ہو جائیں گے ۔

آپ کی خیریت کا طالب

غالب

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ میاں اس سے پہلے دو خط بھیج چکا ہوں۔ ایک میر مہدی کو دوسرا حاتم علی مہر کو نظر سے گزرے ہوں گے۔ اب میری کہانی سنو، میری زبانی سنو، کل رات طبیعت مکدر تھی۔ پڑے پڑے جی گھبرایا۔ کمپ کے جن ہمدرد کا ذکر پچھلے خطوط میں کر چکا ہوں۔ آدمی اچھے ہیں اور ہر اچھا آدمی چونکہ تھوڑا بہت چغد ہوتا ہے لہذا وہ بے چارے بھی حسبِ حیثیت چغد واقع ہوئے ہیں۔ میرے پاس تشریف لائے اور خبر سنائی کہ آج شہر میں ایک مشاعرہ ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ چل کر دیکھوں تو سہی کہ مشاعرے اب کیسے ہوتے ہیں۔ اے بھائی، اب جو پہنچا ہوں مشاعرے میں تو صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب بہادر کے دربار کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ گیا، نہ مسند نہ تکیہ، نہ شمع نہ فانوس، نہ چلم نہ حقہ، سب کرسیوں پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں اور ایک صاحب ایک اونچے چبوترے پر کھڑے کلام پڑھ رہے ہیں اور سنو، اب مشاعرے میں شاعر گاتا ہے اور سننے والے تالیاں بجاتے ہیں۔ عورتیں ہنستی ہیں بچے غل مچاتے ہیں۔ میں ایک کونے میں بیٹھا توبہ استغفار کرتا رہا۔ آج بہرا ہونا بھی کام نہ آیا۔ ایک آلہ کے ذریعے آواز کو اتنا اونچا کر دیا جاتا تھا کہ میر ایسا بہرا بھی سن لے اور سن بھی وہ لے جو خدا کسی کو نہ سنوائے۔ عروض کو لنگڑا کر دیا ہے۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کی نورتن چٹنی پیش کی جاتی ہے۔ وہ چٹنی نہیں سیٹھی اور بے مزہ ایک صاحب کے چند مصرعے یاد رہ گئے تم بھی سن لو۔

تمہاری تمنائے کہنہ اٹھی ہے لہو کی بہاروں کا دامن سنبھالے

لبوں پر لیئے حیلہ ءِ نسل و رنگت

نگاہوں میں عذرِ من و تو کا دھندلا سہارا

کہ تم کو بھی مل جائے پابستگیءِ مسلسل کا ثمرہ

فضاؤں میں گونجے یہ نعرہ

''مہاراج کی جے! شہنشاہ کا بخت قائم!!''

اے بھائی یوسف مرزا۔ للہ بتاؤ یہ کیا ہے، تمام شعرائے فردوس کو سناؤ میر تقی سے پوچھو۔ نظیر اکبرآبادی شاید کچھ بتادیں۔ انشا شاید کچھ روشنی ڈالیں۔ میرا تو دماغ چکر گیا۔ لو اور سنو، اس مختلف البطن شاعری کے بعد ایک صاحب نے اعلان کرنا شروع کر دیا۔

''حضرات! اس نظم میں جو دعوتِ فکر ہے اس کے لیے صاحبانِ فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ اس قحط الرجال میں اگر آپ کو ایک بھی صاحبِ فکر و نظر کسی گوشہ میں مل جائے تو غنیمت سمجھئے۔ میں آپ کو سراغ دیتا ہوں امروہہ میں ایک صاحب نظر موجود ہیں۔ جایئے اور ڈھونڈھ لایئے۔ پتہ صرف یہ ہے نظر امروہی۔ پیغام اگر پہنچ گیا ہو تو نظر صاحب امروہی تشریف لے آئیں۔''

اور صاحب من! ایک نوجوان نے آ کر غزل سرائی شروع کر دی۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر یہ اعلان کیا تھا۔ یہ بات کیا ہوئی، میرے کمپ کے ساتھی نے بتایا کہ یہ اعلان کرنے والے صاحب دِلی سے آئے ہیں اور مشاعروں میں تعارف کی رسم ادا کرتے رہتے ہیں۔ یوسف مرزا! آج معلوم ہوا کہ دِلہ کیوں ویران ہوئی، اب

بتاؤ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں بھی دِلی والا ہوں تو کہیں مجھے بھی پکڑ کر اعلاپچی نہ بنا دیں۔ میں تو چھپکے سے اٹھا اور کھسک آیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

یہ خط سب کو سنا دینا۔ اگلا خط مرزا تفتہ کو لکھوں گا اُسے مانگ کر پڑھ لینا۔

اس دنیا سے نجات کا طالب

غالب

۴

اجی مرزا تفتہ! تم بے وفا یا میں گناہگار، میں 'مغلچہ' اور تم بھی 'مغلچہ'، ہم لوگ بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے، کہو تمھاری محبوبہ کب تک داغ دینے والی ہیں، مگر وہ کیا داغ دیں گی، آپ مرے بھی تو کہاں جنت میں جہاں موت کا نشان نہیں۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو اب میری سنو، پچھلے خط میں ایک مشاعرے کا حال لکھ چکا ہوں، آج ایک اور تماشے کا حال لکھتا ہوں۔

آج گھومتا پھرتا پر چھائیوں کی دنیا میں جا نکلا، چلتی پھرتی، منہ بولتی سرکھیاتی تصویریں کی بستی میں جس کو یہ لوگ فلم کمپنی کہتے ہیں۔ تم پوچھوگے کہ یہ کیا ہے، مگر سمجھاؤں کیا خاک خود ہی کب سمجھا ہوں، عجیب شعبدہ ہے، اے بھائی پر چھائیاں باتیں کرتی ہیں، ناچتی ہیں، گاتی ہیں، ہنستی ہیں روتی ہیں اور سب ہی کچھ کرتی ہیں بس ہاتھ نہیں آتیں۔ ان دنیا والوں نے عجیب عجیب طلسم ایجاد کر لیے ہیں جو کبھی وہم وگمان میں بھی نہ آتے تھے

میرے کمپ کے ہمدرد نے فلم کمپنی کے مالک سے نہ جانے میرے متعلق کیا کہہ دیا کہ وہ تو بس فرش راہ ہو گیا، کہنے لگا کہ ہمارے لئے گانے لکھ دیجئے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بھائی میرے گانے لکھے میری بلا، غزل لکھ لیتا ہوں وہ کہو تو لکھ دو۔ اس نے کہا جی ہاں وہی اور پھر لگا بکنے۔ "دیکھئے مرزا صاحب! ہمارا ہیرو جب

دیکھتا ہے کہ اس کو کسی طرح کامیابی نہیں ہو سکتی کچھ گڑ بڑ گھٹالا ہو گیا اور جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ لڑکی اس کو نہیں مل سکتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ دنیا کو چھوڑ کو سنیاس لے لیتا ہے۔ اس جگہ گانا چاہیے۔ کچھ بڑا ٹریجڈی کا ہو گانا۔''

میں خاک سمجھتا، اس بے زبان کو ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ بھائی میرے اس موقع کے لیے بس یہ غزل ٹھیک ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

منہ کھول کر وحشیوں کی طرح سنتا رہا پھر بولا۔ ''نہیں مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسا لکھ دیجیے جیسے وہ غزل ہے کہ۔

جب تم ہی چلے پردیس لگا کے ٹھیس تو پیتم پیارا، دن میں کون ہمارا

میں ایک دم چیخا۔ ''یہ کیا بکواس ہے، کس مسخرے نے کہا یہ غزل ہے۔ اس نے گانا گوانے والے استاد کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ہیں ہمارے میوزک ڈائیریکٹر ان ہی کی یہ فرمائش ہے''۔ اس شخص نے اور بھی کمال بات کہی ''دیکھیے صاحب آپ تو نثر کے چھوٹے بڑے فقرے لکھ دیجیے، بس گانا میں خود بنا لوں گا ''۔ میں تڑپ کر اٹھا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا، دیر ہوئی یہاں پہنچے ہوئے مگر اب تک وحشت طاری ہے۔ اے بھئی مرزا کسی طرح کہہ سن کر موت کے فرشتے کو راضی کرلو کہ مجھ کو لے جائے سنا ہے فانی بدایوانی سے اُس کے اچھے مراسم ہیں۔ ان ہی کی سفارش پہنچواؤ۔

ملاقات کا طالب غالب

قدرت اللہ شہاب

غمِ جاناں

شاعر: کیا لکھ رہے؟

افسانہ نگار: خاک۔

شاعر: بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین میں کچھ فکرِ سخن کروں۔

مصور: اپنا بھی یہی ارادہ ہے۔ جب تک خاک کا تصور نہ کیا جائے، طبیعت کسی رنگ پر جمنے ہی نہیں پاتی۔

شاعر: آؤ مل کر خاک کی باتیں کریں یا خس و خاشاک کی باتیں کریں۔

افسانہ نگار: تسلیمات! صاحبو، آپ دونوں گدھے ہیں۔

شاعر: واللہ! خوب یاد دلایا۔ ابھی کل میں نے "نوائے خر" کے نام سے ایک شاندار نظم کہی ہے۔ بند عرض کیا ہے

مجھ سے پہلی سی مشقت میرے مزدور نہ مانگ!
اور بھی کام ہیں دنیا میں مشقت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بوجھ کی راحت کے سوا
تو جو مل جائے اکیلا، تو دولتی جھاڑوں
خاک میں تجھ کو لٹا کر تیرے کپڑے پھاڑوں
مجھ سے پہلی سی مشقت میرے مزدور نہ مانگ!

مصور: میرا اگلا شاہکار بھی اسی حسین و جمیل چوپائے پر ہوگا۔ کیوب ازم کے

نظریات کے مطابق جو فنی صلاحیتیں گدھے میں پائی جاتی ہیں، وہ کسی دوسرے جاندار میں نہیں ہیں۔

افسانہ نگار: میرا خیال ہے کہ گدھے کے بعد آپ حضرات بندر پر طبع آزمائی فرمائیں گے۔

مصور: بے شک، سر ریلزم میں آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ہر سبجیکٹ کو اس کی مرکزی حقیقت کے قریب ترین لایا جائے، حضرت انسان کی مرکزی اصلیت بندر کے نزدیک پہنچ کر بہت واضح ہو جاتی ہے۔

شاعر: سروں کے ہرے کھیت میں اٹھلائے بندریا بیلوں کو جتے دیکھ کر

اترائے بندریا

مسکائے بندریا

شرمائے بندریا۔۔۔۔۔۔۔۔

مصور: میں تو یہی رائے دوں گا، اگر آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے افسانوں میں بندروں کا مناسب منصب ضرور دیجئے۔

افسانہ نگار: نہ صاحب مجھے بخشئے، میں ابھی اللہ کی نعمتوں سے اس درجہ محروم نہیں ہوا، کہ بندر کی طرف رجوع کروں۔

مصور: خیر آپ کی مرضی صحیح رائے دینا میرا فرض تھا۔ اگر آپ کو بندروں سے دلچسپی نہیں تو مینڈک اور مرغ بھی بڑے شاداب موضوع ہیں۔

شاعر: مرغ پر اس خاکسار نے ایک مسدس کہا تھا، ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیں

سپیدم خواب سے دنیا کو جگائیں تو ہم

نیند کے ماتوں کو تکبیر سنائیں تو ہم
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ہم
ترے دالان کو بیٹوں سے سجائیں تو ہم
پھر بھی اٹھتے ہی چھری ہم چلائی تو نے
حیف یوں رسمِ وفا خوب نبھائی تو نے

افسانہ نگار: صاحبو، یہ بندر، گدھے، مینڈک اور مرغ آپ کو مبارک ہوں مجھے ان حسین وجمیل موضوعات سے قطعی (قطعی) کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شاعر: غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغلہ ترک کر دیا ہے؟

افسانہ نگار: جی نہیں، میں خدا کے فضل سے اب تک افسانے لکھتا ہوں اور خوب لکھتا ہوں۔

مصور: اگر آپ کو زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف لیلیٰ کے شہزادوں، جنوں کے بادشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقین ہوں گے؟

افسانہ نگار: جی نہیں، خدا میری جمیلہ کو سلامت رکھے، اس کے ہوتے ہوئے مجھے جنوں کے بادشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کا سہارا لینے کی مطلقاً حاجت نہیں۔

شاعر: ہائے کیا نام لیا ظالم نے!

مصور: زندگی کے خوابیدہ تار جھنجھوڑ ڈالے اس نام نے۔

شاعر: ہائے، کیا بات ہے جمیلہ کی۔ ایک زمانہ تھا، کہ اس کی رنگ برنگی چوڑیوں کی کھنک سے شعریت کے طوفان اُبلتے تھے۔

مصور: اس کے جسم کے اقلیدسی خطوط اور اس کی گھنیری بھوؤں کی سیاہ جھالریں میرے شاہکاروں کی معراج تھیں۔

شاعر: اس کی لانبی لانبی، کمر تک بل کھاتی ہوئی زلفوں کا تصور میری شاعری کی جان تھا

مصور: میں نے اس کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر ابھارنے کی خاطر اپنے فن کمال پہنچا دیا۔

شاعر: لیکن ہائے! جب سے جمیلہ نے اپنی زلف دوتا کٹوا کر بوبڈ ہیئر رکھ لیے، میری شاعری مر گئی۔

مصور: اب وہ اپنی جھالردار بھوئیں استرے سے مونڈ کر ان کی جگہ سرمے کی تنی ہوئی لکیریں کھینچتی ہے۔ میرے شاعر میرا فن برباد ہو گیا۔

شاعر: میرے پیارے افسانہ نویس، تم اس جمیلہ پر جتنی کہانیاں چاہے لکھتے رہو، اب اس میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

افسانہ نگار: تم دونوں بڑے کور ذوق عاشق ہو۔ جس نکتے پر آ کر تمہارا فن مر گیا ہے، وہاں سے میرے آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے، اگر تم نے جمیلہ کی رعنائیوں کو ایک نظر دیکھنا ہے تو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں طلسم ہوشربا کے نظارے دکھاؤں گا

۔

شاعر: کہاں چلو گے؟

افسانہ نگار: بوٹ کلب۔

مصور: تی! مجھے وہاں جا کر ابکائیاں آتی ہیں، میں نے کئی مہینے وہاں کی خاک

چھائی ہے اور جب کبھی وہاں جاتا ہوں ،تو میرا جی چاہتا ہے کہ قصاب کی دکان لٹکی ہوئی گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں ۔

افسانہ نگار: اگر تمہیں کچے گوشت سے اس قدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں ، میں تمہیں میٹروپول کی رقص گاہ میں لے چلوں گا ۔ وہاں جمیلہ کے لچکیلے بدن کو رنگین غباروں کی طرح رقصاں دیکھ کر تمہارا دل شاد اور روح منور ہو جائے گی ۔

شاعر: میرے دوست! خدا کے لیے مجھے وہاں کی یاد نہ دلاؤ ۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کئی کئی راتیں جاگا ہوں ، لیکن ہر بار وہاں جا کر میری شاعری کا جوہر خاک ہو جاتا ہے ، جب میں جمیلہ کو ہنسی خوشی ہر دوست اور دشمن کے ساتھ باری باری دوش بدوش ،بازا بہ بازا ،سینہ بہ سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں ،تو میری شاعری میں رقیب روسیاہ کا لطف فنا ہو جاتا ہے ۔

مصور: اب وہ میرے سٹوڈیو میں ماڈل بننے بھی نہیں آتی ، بلکہ فوٹو گرافروں کے پیچھے بھاگتی ہے تا کہ اس کی تصویر اخبار کے پہلے صفحات پر شائع ہوں ۔

شاعر: اس کے فلیٹ میں بجلی کی گھنٹی لگے ہوئی ہے اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سہنے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا

مصور: میرے نزدیک جمیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے ۔ اب میں اس کی یاد میں اپنے آرٹ کو نئی نئی شاہراہوں پر چلا رہا ہوں ۔ جب مجھے جمیلہ کی خوبصورت اور سڈول ٹانگوں کا خیال آتا ہے تو میں رنگوں کی آمیزش سے چونے اور سیمنٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں ۔ جب مجھے اس کے حسین چہرے کی یاد ستاتی ہے ،تو میں ایکس رے کے فوٹو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچوں کی تخلیق کرتا

ہوں۔۔۔۔۔۔

افسانہ نگار: صاحبو، مجھے آپ دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ ، میں تمہیں جمیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی جھلک دکھاؤں گا۔

شاعر: میں خوب جانتا ہوں، کہ اب تم ہمیں کسی رفیوجی کالونی چلنے کی دعوت دو گے!

مصور: میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میرے ڈبو کے سارے رنگ ختم ہو گئے ہیں، لیکن ہندوستان سے آنے والے ریفیوجیوں کی کی تعداد میں کمی نہیں ہونے پاتی۔ میر آرٹ اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قاصر ہے۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔

شاعر: میں نے بھی اس کوچے کی بہت ہیرا پھیری کی ہے، اور کئی بار اسی تاک جھانک میں پٹا بھی ہوں۔ نا صاحب، اب وہاں جانے سے میری توبہ ہی بھلی۔

افسانہ نگار: تم بڑے بزدل انسان ہو، میری طرف دیکھو، کتنی بار میں نے خود جوتے کھائے ہیں، لیکن میں ابھی تک رفیوجیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا۔

شاعر: تمہارا کیا ہے تم تو بے حیا ہو۔ ہر روز جوتے کھاتے ہو اور پھر کپڑے جھاڑ کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہو، لیکن شاعر کا دل بڑا ازک ہوتا ہے، میرے یار، ذرا سی ٹھیس لگنے سے آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تم شوق سے جا کر جوتے کھاؤ، اور افسانے لکھو۔ میں یہاں بیٹھ کر ''اونٹ گاڑی'' پر اپنی نظم مکمل کروں گا اور میرا دوست مصور لنگور کی لہراتی ہوئی بانکی دم کی نقاشی کرے گا۔ آہا ہا، سبحان اللہ کیا غضب کے شعر ہیں عرض کیا ہے:

اونٹ پھر آیا دل زار! نہیں اونٹ نہیں!
یہ تو گاڑی ہے کہیں اور چلی جائے گی
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا پاؤڈر کا غبار
پھڑ پھڑانے لگے شانوں پہ ترا شیدہ بال

فکر تونسوی

بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا ، اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اکلوتی اور پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ بلہ لگا رکھا ہے

میں نے عرض کیا۔ ”یہ کیا ہے حضور؟“

وہ بولی ”جھنڈا اونچا رہے ہمارا“۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشک بتاں تھا، آج کسی انجمن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا۔

”اٹھو، میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو“

میں نے کچھ مسکرا کر (اور کچھ ڈر کر) کہا۔ ”اے انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ“۔

وہ اپنی سڈول باہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی۔

”آج کھانا نہیں ملے گا، آج چولہا ڈاؤن اسٹرائیک ہے“۔

شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گھمبیر ہے اور بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے یہ کس قسم کی ستم گر نے انقلابی چھاپہ مارا ہے کہ آج محترمہ کہ

آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب ولہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کیساتھ کہا۔

''بیگم! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم میری بیوی ہو''۔

تڑاق سے جواب آیا۔ ''ہاں، مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں''۔

''مگر ڈارلنگ!'' میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا۔ ''مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس گھر کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو، بتاؤ ہو کہ نہیں؟''

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کرجاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آ گرتی تھی، لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی۔ ''سیٹھ جی! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔'' صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور۔۔۔۔

جو ہم سے ٹکرائے گا چُور چُور ہو جائے گا۔''

میں نے کہا'' ۔کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعت آیا تھا؟''

وہ بولی ''نہیں شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ لہٰذا میرے مطالبات مانئے نہیں تو۔۔۔''

''کون سے مطالبات''۔

''سب سے پہلے بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی بلکہ جنگ کی سی گھن گرج تھی۔ ''سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں۔ صبح پانچ سے بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انہیں کم کر کے نو گھنٹے کیے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی دستور ہے''۔

''مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے''۔

وہ بھڑک اٹھی۔ اور بائی دے وے، جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ ہاں ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لیے نو گھنٹے کے اوقات آپکو منظور ہیں''؟

میں نے کہا۔ ''دیکھو (ڈارلنگ نہیں) ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں''؟

سوکن کا جلا عورت کی نازک رگ ہے، میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھی کہ ورکرز ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے، مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی۔

''یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے، آپ چاہے تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں''۔

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لیے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔ ''مگر اُسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے تمہارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔

تم چاہو تو اس تنخواہ میں ملازمہ رکھ سکتی ہو''۔

''اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی''۔

''تو پھر کیا کیا جائے''۔

''میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اسے خود سوچنا چاہیے''۔

''آل رائٹ''۔ میں نے تنگ آ کر کہا ''مینجمینٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گا ۔اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے''۔

''دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے''۔

''مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں، مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا''۔

''دیکھئے آپ مذاق میں مت ٹالئے (حالانکہ اللہ کی قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ہے، مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آ دھمکتے ہیں، کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے آ ٹپکتا ہے، دیولی، دسہرہ، عید ،بقر عید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی، بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے''؟ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا، لیکن مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (خدا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا، لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے

کہا

''دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی''۔

''لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں''۔

''میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہو جائے گی۔ سارا کام اس روز چوپٹ ہو جائے گا، یوں لگے گا ، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرادی گئی ہے۔ بچے روئیں گے۔ میں رووں گا، گھر کی بلی اور طوطا اور چوہا سبھی روئیں گے میں پوچھتا ہوں، تمہاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا''؟

''آپ کیجئے گا''۔ جذبات سے بالکل عاری ہورہی تھی ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا ''اچھا چلو میں تمہاری ہفتہ وار چھٹی منظور کرتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کروگی کیا''؟

''بس بیٹھی رہوں گی، لیٹی رہوں گی، تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی''۔

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے اور یجنل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوورٹائم کا لالچ دے دوں، یعنی چھٹی کے دن کام کرو، تو دگنی اُجرت ملے گی، اوورٹائم کی رقم

جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا، لیکن بیوی کو اوور ٹائم کے ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا لہٰذا میں نے مردانہ فراغ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی ''ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو''۔

میکے کے پچ، پر بیگم بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے، اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرگھونپ دیا گیا ہے، مطالبے کے ساتھ شرط کی پچ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لئے تھے، میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور بیگم کی آزادی میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیرِ لب تبسم سے اس فیصلے پر صادر کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا:۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لیے اسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں رہے۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہوگئی ہے، مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے

جھٹ کہا'' ۔بیگم مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے ۔ بلکہ صرف ہمدردی ہے''۔

وہ تڑپ اٹھی ''مگر صرف ہمدردی سے تو بینائن بھی نہیں آسکتی''۔

''تو بینائن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ''روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی لو۔''تو اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی ۔افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کے فلاسفی بھول گئیں''

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیارِ زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔اس نے آنسو کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کیے اور دھمکی دی ''گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھالو خالی خولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی''۔

''تو پھر کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں''؟

''اپنی آمدنی بڑھاؤ''۔انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

''کیسے؟''

''رشوت لو، جیب کتری شروع کردو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائسنس لے لو۔ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے''۔

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔گزشتہ ایک سو برس سے جو

خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے، میں اسے چند کرنسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیانوں اور آلو گوبھی کی خاطر برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مصر تھی۔ "ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں اس لیے میرا مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹائیک کے لیے تیار ہو جاؤ"۔

اس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہر پن کو مشکوک قرار دے دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا، مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں گا، خاندانی اخلاق کو طلاق نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی دہجرانی خاموشی کے بعد بیگم بولی۔ "تو اب کیا ارادے ہیں"؟

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے"۔ میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے، اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس بات پر بھی غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کراؤں یا نہ کراؤں"؟

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے"۔

اس مرحلے پر آ کر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے مطابق بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ میں خصلت کے مطابق یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہیں۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی کھایا اور

پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کی گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم آنسو میری پیشانی پر آ گرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھو، کھانا کھالو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے"۔

سید امتیاز علی تاج (بی اے)

چچا چھکن نے تصویر ٹانگی

چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں ابے لونڈے، جا بے لونڈے، یہ کیجو، وہ دیجو، گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جاؤ پرسوں پرلے روز کا ذکر ہے، دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا، اس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی، کل شام کہیں چچی کی نظر اس پر پڑی، بولیں "چھٹن کے ابا تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے خیر سے بچوں کا گھر ٹھیرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟"

"ٹانگتا اور کون، میں خود ہی ٹانگوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے تم رہنے دو میں سب کچھ خود ہی کیئے لیتا ہوں"۔

کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اتار چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا۔ "بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آؤ"۔ ادھر مودے سے کہا۔ مودے، مودے! جانا امامی کے پیچھے، کہیو، تین تین انچ کی ہوں میخیں۔ بھاگ کر جا۔ جا لیجو اُسے راستے میں ہی۔ لیجئے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی اور اب آئی گھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا "او ننھے! جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا بنو! جاؤ! اپنے بستے میں چُغتی

نکال لاؤ اور وہ سیڑھی یہاں لا کر لگا دے اور ہاں دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹن بیٹے چائے پی لی تم نے۔ جانا تو ذرا اپنے ہمسائے میر باقر علی کے گھر کہنا ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے کہ اب آپ کی ٹانگ کیسی ہے اور یہ کہو، وہ جو ہے نہ آپ کے پاس کیا نام ہے اس کا؟ اے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ ملول تھا، اللہ جانے کیا تھا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا تو یوں کہہ دیجو، وہ آپ کے پاس آلہ ہے نہ جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ذرا دیر کو دے دیجیے، تصویر ٹانگنی ہے، جائیو میرے بیٹے، پر دیکھو سلام ضرور کہنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ اچھا یہ تم کہاں چل دیے چھٹن، کہا جو ہے ذرا دیر یہیں ٹھہرے رہو، سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ مودا مل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نہ؟ بس بہت ٹھیک ہیں، مگر اے لو سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ اب کیا کروں؟ جانا میرا بھائی جلدی سے ہوا کی طرح جا، اور دیکھو بس گز سوا گز کی ہو سُتلی، دیکھو تو کتنی جلدی آتا ہے اور سنا سُتلی نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی، کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیے ہے، لے آ اور دودو! دودو کہاں گیا؟ دودو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے، یوں نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا''۔

لیجئے صاحب خدا خدا کر کے تصویر اٹھانے کا وقت آیا، مگر ہونی شدنی، چچا اُسے اٹھا کر ذرا وزن کا اندازہ کر رہے تھے کہ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گر کر شیشہ کرچی کرچی ہو گیا۔ ''ہت ہے'' کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر جوتا کا معائنہ شروع کر دیا، وقت کی بات انگلی میں شیشہ چبھ گیا۔

خون کی تلی بندھ گئی، تصویر کو بھول کر اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا، شیروانی کی جیب میں، شیروانی اتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے تھے، کبھی اس سے ٹکر کھاتے تو کبھی اس سے، سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈھ نکالے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا، اور کیا جھوٹ کہتا ہوں؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈھ سکتے، جو ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے، میں نے اتار کر رکھی ہے بھئی بڑے''

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں ''ارے بھئی رہنے دینا، رہنے دینا مل گئی شیروانی۔ ڈھونڈھ لی ہم نے تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہوں تو نظر نہیں آتا ہے''

آدھے گھنٹے تک انگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا اور تمام قصے طے کرنے پر کہیں تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے سیڑھی آئی، چوکی آئی۔ شمع لائی گئی، چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں، اور گھر بھر (جس میں میں اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا، اوپر پہنچے ایک نے کرسی پر چڑھ کر میخیں بڑھائیں، ایک قبول کر لی دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا، سنبھالا ہی تھا کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔

ستی ہوئی آواز میں بولے ''اے لو، اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی۔ دیکھنا کہاں گئی؟''

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر رہے ہیں، اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑی مسلسل بڑبڑ رہے ہیں۔

''ملی؟ ارے کم بختوں! ڈھونڈھی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا، میں اب رات بھر یوں ہی سیڑھی پر کھڑا کھڑا سوکھا کروں گا؟ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو اندھو۔۔''!

یہ سن کر سب کی جان میں جان آتی ہے تو پہلی میخ ہی مل جاتی ہے۔ اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

''یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ! الو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ سات آدمی اور کسی کو نہیں معلوم، ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا''۔

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ لگا اور میخ گڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ یہ بھول بیٹھے کہ ماپنے کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ لگایا تھا؟ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے تھے کہ شائد نشان نظر آ جائے۔ ہر ایک کو الگ الگ جگہ نشان دکھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری الو گدھا کہہ کر کرسی سے اتر جانے کو کہہ رہے ہیں۔ آخر پھر چفتی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پچیس انچ کے فاصلے پر لگی

ہوئی تھی۔ بارہ اور بارہ اور بارہ اور لیے پانچ اور؟ بچوں کی زبانی حساب کو سوال ملا ۔ با آواز بلند حل کرنا شروع کیا اور جواب نکالا تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ، ایک نے دوسرے کا غلط بتایا۔ اسی تو تو میں میں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا ۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی۔

اب کے چچا چھتی سے نہیں ماپتے، ستلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر پینتالیس درجے کا زاویہ بنا کر ستلی کا سرا کونے تک پہنچانے کی کوشش میں ہیں کہ ستلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں کہ اسی کوشش میں زمین پر آرہتے ہیں کونے میں ستار رکھی ہے جس کے تمام تار چچا کے بوجھ سے یک لخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

اب چچا جان کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں، سننے کے قابل ہوتے ہیں، مگر چچی روک دیتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ''اپنی عمر کا نہیں تو کچھ ان بچوں کا ہی خیال کرو''۔

بہت دشواری کے بعد چچا جان ازسرِ نو میخ گاڑنے کی جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے پر، آپ سی کر کے ہتھوڑا ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نیچے آگرتا ہے کسی کے پاؤں پر، ہائے ہائے اور اُفوہ مار ڈالا شروع ہو جاتی ہیں۔ چچی جل بھن کر کہتی ہیں۔ ''یوں میخ گاڑنی ہوا کرے تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دے دیا کیجئے۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں، اور نہیں تو۔

چچا کچھ نادم ہو کر جواب دیتے ہیں''۔ یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے۔ یعنی ہو کیا، جس پر یہ طعنے دیئے جا رہے ہیں۔ بھلا صاحب کان ہوئے۔

آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہیں دیا کریں گے''

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی۔ میخ پر دوسری چوٹ جو پڑی تو اس جگہ کا پلستر نرم تھا، پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے اس زور سے دیوار سے ٹکرائے کہ ناک غیرت والی ہوتی تو پچک ہی کر رہ جاتی۔

اس کے بعد ازسر،نو چفتی اور رسی تلاش کی گئی اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی اور کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی، وہ بھی کیسی ٹیڑھی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پر آئی۔ چاروں طرف گز بھر دیوار کی یہ حالت گویا چاند ماری ہوتی رہی۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور چور نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آخری سیڑھی پر دھم سے جو اترتے ہیں تو کہاری غریب کے پاؤں پر پاؤں، غریب تھی، تڑپ ہی تو اٹھی۔ چچا اس کی چیخ سن کر ذرا سراسیمہ تو ہوئے مگر پل بھر میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے

''اتنی سی بات تھی لوگ اس کام کے لئے مستری کو بلوایا کرتے ہیں''۔

سعادت حسن منٹو

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ یہی جی میں آیا کہ گھر سے نکل کر ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا پر جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا۔ بجلی کے کھمبے پر دیکھا، شہ نشین پر دیکھا، چھجے پر دیکھا، غرضیکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد۔۔یہ لکڑیوں کے۔۔۔ٹال ہے پاکستان زندہ باد فٹافٹ مہاجر ہیئر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد، یہاں تالے مرمت کئے جاتے ہیں

پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے۔۔۔ پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال پاکستان زند باد، الحمدللہ کہ یہ دکان سید نواز حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا۔۔۔ پاکستان زند باد۔۔۔یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے۔۔۔۔یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجئے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کھلی تھی۔ میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں

نے حلوائی سے کہا ''یہ الٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے''؟

اس نے گھور کر کر مجھے دیکھا اور کہا۔ ''دیکھتے نہیں ہو''؟

میں نے دیکھا۔۔ پنکھے کا رخ قائد اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی ۔۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا۔ ''پاکستان زندہ باد'' اور لسی پیے بغیر آگے چل دیا۔

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں اس دکان سے چپل خریدے تھے۔ یہ پوری والا کدھر سے آ گیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو، لیکن بورڈ وہی تھا، سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں سوچا، آگ لگانے جلانے میں اس نے بھی کافی مدد کی ہو گی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی! گرم گرم پوریاں ہیں''۔

میں نے کہا۔۔ ''بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو یہاں جوتوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی''

پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا۔ ''جوتوں کی دکان اب بھی ہے، لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری چھ بجے سے شروع ہو جاتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے''۔

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف

دیں گے، اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے، لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کی بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں اِدھر اُدھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا، اس پر ایک بورڈ لگا تھا۔ ''یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے''۔

میں نے قدم تیز کر دیے۔

دکانوں کے سائن بورڈ میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔

تحریر خوشخط تھی اور نام بھی جاذبِ نظر تھے۔ مثال کے طور ''آرائش''۔ ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہوگا۔ ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں ''ماحضر'' لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام ''پاپو شیانہ'' تھا، یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا۔ ''زمہریر'' ضرور قلفیوں کی دکان ہوگی۔

میں نے خوش ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی، پوچھا ''یہ کیا ہے''؟ جواب ملا ''ہوٹل۔'' چلتا پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لیے انگیٹھی اور توا موجود، چار سالن تیار، شامی کباب تلنے کے لیے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے، برف، لیمونیڈ کی بوتلیں، دہی کا کونڈا، لیموں نچوڑنے کا

کھٹکا، گلاس، پلیٹیں غرض کہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے، میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گما دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا۔ ''کیا ہو، بچہ ہے، کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ہی تو ہوتا ہے ایک روپے کا نوٹ، کہیں گر پڑا ہوگا۔ خبر دار جو تم نے اس پر ہاتھ اُٹھایا''۔

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے اُلجھ گیا اور کہنے لگا۔ ''تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے، لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے آج کل''۔ یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کے پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں! بہت بری طرح پیٹ رہا تھا بے چارے کو''۔

''بچارہ اس کا اپنا لڑکا ہے''۔

''کیا کہا؟''

''باپ اور بیٹے کا یہی کاروبار ہے۔ دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ سے پیدا کر لیتے ہیں''۔

میں نے کہا ٹھیک ہے''۔ اور قدم بڑھا دیے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل

لیے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔۔ دہلی میں جوتا چل گیا۔۔ لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا۔۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی، کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے، آج کا تازہ نوائے صبح'' آج کا تازہ '' ابو الوقت، آج کا تازہ ''سنہرا پاکستان''

اخبار فروشوں لڑکوں کا سیلاب گزر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ، سنجیدہ اور متین صورت، ایک ہاتھ میں تھیلا تھا، دوسرے میں اخباروں کا بنڈل۔ میں نے پوچھا:

''کیا آپ اخبار بیچتی ہیں''؟

مختصر جواب ملا۔ ''جی ہاں!''

میں نے دو اخبار خریدے اور دل ہی دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا غول کا غول نمودار ہوا۔ بھونک رہے تھے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے، پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا، کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن سی سی کت ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھنکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں ان کا خیال تو رکھنا چاہیے۔ جو پناہ گیر ہیں

ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں ۔۔اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تا کہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی ۔ میں نے قدم بڑھانے شروع کر دیے۔

میں نے ایک اخبار کھولا اور سے دیکھنا شروع کیا۔سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی ،تین رنگوں میں ایکٹرس کا جسم نیم عریاں تھا۔ نیچے یہ عبارت درج تھی:

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے،اس کا اندازہ اوپر کی تصویر سے ہوسکتا ہے"۔

میں نے دل ہی دل میں پاکستان نعرہ لگایا اور اخبار کوفٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ دوسرا اخبار کھولا ۔ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی۔ مضمون یہ تھا:

"میں نے کل اپنی سائیکل الائیڈ ز بنک کے باہر رکھی ۔کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی ہے۔میں غریب مہاجر ہوں ،جس صاحب نے لی ہو براہِ کرم مجھے واپس کر دیں"۔ میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی ۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔میں نے دل ہی دل میں کہا۔"

اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی''۔

دو تین سائیکلیں دیکھیں، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مرد چلا رہے تھے اور ایک ایک برقع پوش عورت پیچھے کیریر پر بیٹھی تھی، پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی، لیکن برقع پوش عورت آگے ہینڈل پر بیٹھی تھی۔ دفعتہً خربوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے، پھسلنے اور بریک لگنے کے دوہرے عمل سے سائیکل الٹ کر گری، میں دوڑا مدد کے لیے۔ مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بیچاری سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا۔۔ مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا۔۔۔''آپ تشریف لے جایئے، ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں''۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا، عورت کے سر پر اوندھا سیدھا برقع اٹکایا اور اس کو ہینڈل پر بٹھایا یہ جا وہ جا۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آگے سڑک پر خربوزے کا کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تھوڑی ہی دور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا'' مسلمان عورت اور پردہ''۔

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی، مگر وہ بت کہاں تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا۔ پوچھا۔'' کیوں صاحب یہاں ایک بت ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟''

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔۔''چلا گیا''۔

''چلا گیا۔۔۔آپ کا مطلب ہے اپنے آپ ہی چلا گیا؟''

وہ مسکرایا۔۔۔ ''نہیں اسے لے گئے''۔

میں پوچھا۔ ''کون''؟

جواب ملا۔ ''جن کا تھا''۔

میں نے دل میں کہا۔ ''لو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے۔۔۔ ایک دوہ بھی آئے گا جب لوگ اپنے اپنے مردے بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے''۔

یہی سوچتے ہوئے قدم اٹھانے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹہل رہے تھے، مجھ سے کہا۔ ''بت کہیں گیا نہیں۔ یہیں ہے اور محفوظ ہے''۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''عجائب گھر میں''۔

میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ ''اے خدا وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو جائیں''۔

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے صاحبزادے نے ان سے کہا۔

''ابا جان! آج ہم چھولے کھائیں گے''۔

ابا جان کے کان سرخ ہو گئے۔ ''کیا کہا؟''

برخوردار نے جواب دیا۔ ''ہم آج چھولے کھائیں گے''۔

ابا جان کے کان اور سرخ ہو گئے۔ ''چھولے کیا ہوا، چنے کہو''۔

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''نہیں ابا جان! چنے دلی میں ہوتے ہیں یہاں سب چھولے ہی کھاتے ہیں۔۔۔ ابا جان کے کان اپنی اصلی حالت پر

آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا لارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا، لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی ۔صنفِ نازک تو قریب قریب مفقود تھی ۔پھول کھلے ہوئے تھے ۔کلیاں چٹک رہی تھیں ۔ہلکی پھلکی فضا میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں ۔میں نے سوچا عورتوں کو کیا ہوا ہو جو گھر میں قید ہیں ۔ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم ، اس سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتیں ۔۔۔لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی ۔۔۔۔اور جب میں نے لارنس باغ کی روشوں پر پھٹی پھٹی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو محوِ خرام دیکھا تو مجھے دکھ ہوا اور اس دکھ میں مزید اضافہ ہو گیا جب میں نے سوچا کہ پھول بیکار کھل رہے ہیں ۔کلیاں بے مطلب چٹک رہی ہیں ۔یہ جوان ان کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں ۔یہ جوان کے تعطر سے بالکل بے خبر ہیں کیا ان کی جگہ اس باغ کے بجائے کوئی ذہنی شفا خانہ نہیں، کوئی مدرسہ نہیں جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھولی جائیں؟ ان کی روحوں کے زنگ آلود تالے توڑے جائیں، اگر کوئی ایسا نہیں رستا، میرا مطلب ہے اگر انسان کا ذہن عاجز ہے ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وہ انہیں چڑیا گھر میں نہیں رکھ سکتا جو لارنس گارڈن ہی میں قائم ہے۔

میری طبیعت مکدر ہو گئی ۔باغ سے باہر نکال رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا
''کیوں صاحب! یہی باغِ جناح ہے''؟
میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں یہ لارنس باغ ہے''۔

وہ صاحب مسکرائے۔ "آپ چڑیا گھر سے تشریف لا رہے ہیں"؟

"جی ہاں!"

وہ صاحب ہنس پڑے۔ "قبلہ! جب سے پاکستان قائم ہوا ہے اس کا نام باغ جناح ہوگیا ہے"۔

میں نے ان سے کہا "پاکستان زندہ باد"۔ وہ اور زیادہ ہنستے ہوئے لارنس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دوزخ سے باہر نکلا ہوں۔۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردیء ہمسایہ در بہشت

حاجی لق لق

آل لاہور روڈ کانفرس

لاہور میں ریل بابو کانفرنس ہوئی ،سبزی کانفرنس ہوئی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ لاہور کی سڑکوں میں بیداری پیدا نہ ہوتی ،چنانچہ انہوں نے آل لاہور روڈ کانفرنس کے نام سے ایک انجمن بنائی اور تانگہ یونین اور ریلوے یونین کے مشہور لیڈر مسٹر ایم اے خاں کے ہاتھ عنان صدارت دی

مسٹر خاں نے اس اعزاز کو بخوشی قبول کرلیا ۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ روڈ کانفرنس کی باگ دوڑ تانگے کے گھوڑے کی لگام سے بہرصورت اچھی ہے اور پھر روڈ اور تانگے میں قریبی رشتہ داری ہے ۔دونوں کی عنانِ حکومت ہاتھ آجائے تو کیا ہی بات ہے ۔ضرورت کے وقت جب تانگوں کی ہڑتال کرائی جائے گی تو سڑکوں کی بھی ہڑتال کرادی جائے گی ۔تاکہ پیدل چلنے والے بھی اس روز سڑکوں کا استعمال نہ کرسکیں ۔اس کی ترکیب آسان ہے جس طرح روڈ ڈیپارٹمنٹ سڑک کے سرے پر ایک بورڈ نصب کردیتا ہے کہ سڑک مرمت کے لیے بند ہے، ۔

اسی طرح روڈ کانفرنس کے صدر بھی بورڈ لگا سکتے ہیں جن پر لکھا ہو کہ خبردار اس سڑک پر مت چلو یہ ہڑتال کرہی ہے

پچھلے دنوں سائیں روڈے شاہ کے تکیے میں آل روڈ کانفرنس کا پہلا اجلاس عام مسٹر ایم اے خاں کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں متعدد سڑکوں نے

تقریریں کیں اور چند قراردادیں منظور کر کے لاہور کارپوریشن کے چیف افسر پنجاب کے گورنر ہندوستان کے وائسرائے اور قلمرو برطانیہ کے وزیر اعظم کو ارسال کی گئی، لیکن مسٹر ٹیلر جو ان دنوں لاہور کارپوریشن کے چیف افسر تھے۔ ان اختیارات کی رو سے جو آپ کو ضابطہ سڑکداری کی دفعہ ۸۴۰ کے ماتحت حاصل تھے حکم دے دیا کہ اس کانفرنس کی کاروائی اخبارات میں شائع نہ کرائی جائے۔ اب چونکہ ٹیلر صاحب تشریف لے جا چکے تھے، اس لیے میں دفعہ مذکورہ کے ماتحت صادر شدہ حکم کی خلاف ورزی کر کے کانفرنس کے رومداد شائع کر رہا ہوں۔

یہ کانفرنس منٹو پارک میں منعقد ہوئی جس میں ایک وسیع اور شاندار پنڈال تعمیر کیا گیا تھا۔ پنڈال کے وسط میں گول چکر بنایا گیا تھا اور قناتی دیواروں پر جا بجا خوشنما قطعے آویزاں کیے گئے تھے جو اس قسم کے تھے۔

''بائیں طرف چلو، سڑک یہاں سے پار کرو، روشنی کا وقت، سڑک مرمت کے لیے بند ہے وغیرہ۔

صاحب صدر ''زندہ باد'' کے نعروں میں تشریف لائے اور کرسی صدارت پر رونق افروز ہو گئے اور آپ نے ایک مختصر تقریر سے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ آپ نے فرمایا

''معزز خواتین! آپ میں سے بعض میری مائیں ہیں کیونکہ میں ان کی آغوش میں پل کر بڑھا ہوا ہوں۔ بعض نہیں ہیں، کیونکہ وہ کم و بیش میری ہم عمر ہیں بعض بیٹیاں ہیں کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے بنی ہیں اور رہاں بعض میری دادیاں ہیں بھی ہیں (اس پر پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا)

مسٹر خاں نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے صدارت کا فخر بخشا۔

میں آپ کے اس انتخاب کے داد دیتا ہوں ۔اس خدمت کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا۔وہ میں ہی ہوں جس کے نہ صرف بوٹ ان سڑکوں کے چکر کاٹتے کاٹتے گھس گئے بلکہ میری ایک ٹانگ بھی معذور ہوگئی۔میں ریل کی سڑک پر کام کرنے والے مزدوروں کا بھی نمائندہ ہوں اور تانگوں کی نمائندگی بھی کرتا ہوں جن کے دم سے آپ سب کی رونق ہے(نعرہ مسٹر خاں زندہ باد)''میں اب آپ کا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا اور کاروائی شروع کرتا ہوں محترمہ میکلوڈ روڈ صاحبہ تشریف لاکر ہمیں اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں ۔

میکلوڈ روڈ تقریر کرنے کے لیے ڈائس پر ڈٹ گئیں اور اس نے اپنی تقریر یوں شروع کی:

صاحب صدر اور معزز بہنوں! خدا کا شکر ہے کہ ہماری قوم میں بھی بیداری پیدا ہوئی اور ہم آج مل بیٹھنے کے قابل ہوگئیں ہیں ۔میری تقریر کا موضوع کیا ہے؟ کچھ اظہار خدمات، کچھ دل کی باتیں، کچھ گلے شکوے، اور بس، میں لاہور کی طویل ترین سڑکوں میں شمار کی جاتی ہوں ۔ریلوے اسٹیشن کے تانگوں کے اڈے سے شروع ہو جاتی ہوں ۔پھر ذرا آگے بڑھ کر بہن مال روڈ سے ہم آغوش ہو جاتی ہوں ۔میں اپنے دامن میں لاہور بھر کی تفریحات لیے ہوئے ہوں ۔میرے کناروں پر کوئی نصف درجن سینما ہال واقع ہیں جو شام کے وقت سارے لاہور کو

اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جب کوئی فلم کسی سینما یا ہال میں لگتی ہے تو ہال کے اندر کی بہ نسبت باہر زیادہ رونق ہوتی ہے، ٹکٹ گھر کے باہر بقول شخصے آدمی پر آدمی چڑھا ہوتا ہے۔

دھینگا مشتی میں کپڑی پھٹ جاتے ہیں۔ گالی گلوچ اور چیخ و پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور جب شو ختم ہو جاتا ہے اور تماشائی گھروں کو لوٹتے ہیں تو میں فلم پر ان کے تبصرے سُن سُن کر حیران ہو جاتی ہوں اور دل ہی دل میں کہتی ہوں کہ اخباروں اور رسالوں والے خوامخواہ تنقیدوں پر سیاسی کاغذ اور وقت صرف کرتے ہیں، اصلی تنقید یہ لوگ کرتے ہیں اور ان میں بھی وہ لوگ جو ہال کے چنگڑ محلّہ میں بیٹھ کر آئے ہوں۔

میں کئی ہوٹل بھی اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہوں اور ایک دیسی میخانہ بھی۔ ہوٹلوں سے زیادہ میخانے میں چہل پہل ہوتی ہے۔ یہ ہندو مسلم بھنگی چمار اتحاد کا مکمل نمونہ ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ جو کام بڑے بڑے لیڈر نہیں کر سکتے وہ میرا میخانہ انجام دے رہا ہے۔ یہاں نہ ہندو پانی اور مسلمان پانی کا سوال ہے نہ ہندو روٹی اور مسلمان روٹی کا وہی گلاس ہندوؤں کے لئے اور وہی مسلمانوں کے لیے وہی سکھوں کے لیے اور وہی بھنگیوں کے لیے جب یہ لوگ سرشار ہو کر بھانت بھانت کی بولیاں بولتے اور گاتے بجاتے ہیں تو لطف آ جاتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ ’’یار تم میرے بھائی ہو بلکہ باپ ہو‘‘۔

دوسرا کہتا ہے کہ ’’میں تمہارا نوکر ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ میں لاٹ کی پرواہ نہیں کرتا‘‘۔ جب یہ لوگ پی پلا کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی دھڑام

سے گر پڑتا ہے۔ میں اس کو سینے سے لگا لیتی ہوں اور اس وقت تک نہیں چھوڑتی ہوں جب تک کوئی پولیس والا آ کر اس کو میرے سینے سے جدا نہ کر دے

یہ سب رونقیں انسانوں کے لیے ہیں، لیکن میرے لیے یہ سب کچھ مصیبت ہے۔ میرے سینے پر اسقدر ٹریفک گزرتا ہے کہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔ میں سب ظلم سہتی ہوں اور اف تک نہیں کرتی۔ آدھی رات کے بعد جب صرف پولیس اور بنا سپتی پولیس کے آدمی رہ جاتے ہیں تو مجھے آرام نصیب ہوتا ہے، لیکن مجھے سب سے بڑا غم یہ ہے کہ صوبہ پنجاب کو حکومت خود اختیاری بھی مل گئی۔ وزیر اعظم بھی دیسی اور دوسرے وزیر بھی دیسی۔ لاہور کارپوریشن کا چیف افسر بھی اب دیسی ہے لیکن میں بدستور میم صاحب ہوں۔ یعنی میکلوڈ روڈ۔ کیا مجھے مشرف با اسلام یا شدھ نہیں کیا جا سکتا؟ مجھے امید ہے کہ میری دوسری بہنیں بھی جو ابھی تک ولایتی نام سے موسوم ہیں۔ میری طرح شاکی ہوں گی اور میں اس کانفرنس سے گزارش کروں گی کہ وہ اس معاملے کو ہاتھ میں لے''۔

ان الفاظ پر محترمہ میکلوڈ روڈ نے اپنی تقریر ختم کی اور اس کے بعد محترمہ نسبت روڈ نے اپنی تقریر شروع کی۔ آپ نے فرمایا:۔

''میں محترمہ میکلوڈ روڈ کی شکر گزار ہوں کہ نام کے معاملے میں انہوں نے میرے دل کی بات کہی۔ آپ کو معلوم ہے، میں پائے نسبتی کی طرح کوئی نسبتی روڈ نہیں ہوں بلکہ میرا نام بھی انگریزی ہے۔ میں بے آباد سڑک ہوا کرتی تھی لیکن آج خدا کے فضل سے میں لاہور کی حسین ترین سڑکوں میں شمار کی جاتی ہوں اس لیے شام کو مجھ حسن کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ میں حسین نوجوانوں اور حسین

عورتوں کی مرغوب سیر گاہ ہوں۔ کالج کی لڑکیاں بن سنور کر نکلتی ہیں تو میں پرستان بن جاتی ہوں۔ ادھر کالج کے لڑکے بھی کوٹ کی جیبوں میں بہت سے دل بھر کر آجاتے ہیں، جہاں کوئی حسین پسند آیا ایک دل جیب سے نکالا اور اس کی خوبصورت سینڈل پر دے مارا کبھی کبھی ہندو مسلم فساد کی طرح میرے ہاں بھی مرد اور عورتوں کا فساد بھی ہو جاتا ہے۔ جس میں عورت سلیپروں کو استعمال کرتی ہیں اور مرد آہوں کا یہی وجہ ہے کہ پولیس والے سفید کپڑوں میں متعین کر دیے گئے ہیں جو سائیکل لیے گشت کرتے رہتے ہیں، لیکن عشق و محبت کے معاملے میں پولیس کیا کر سکتی ہے۔ حسن و عشق کی کارفرمائیاں جاری ہیں اور جاری رہیں گی۔

میں مخلوط تعلیم کی حامی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کالج بنا رکھا ہے جس میں تعلیم مخلوط ہے۔ مجھ پر واقع کالج بھی مخلوط، مجھ پر چلنے والے بھی مخلوط اور میرا نام بھی مخلوط، وہ اس لیے اگرچہ میرا نام انگریزی زبان میں ہے، لیکن نسبت اردو کا لفظ بھی ہے، اس لیے نسبت روڈ کو بھی مخلوط ہی سمجھئے۔ مجھے اس بات کی شکایت ہے کہ اس کانفرنس میں کوچوں اور بازاروں کو کیوں نہیں شامل کیا گیا اور اجلاس کو مخلوط کیوں نہیں بنایا گیا۔ بازار اور سڑکوں کو مخلوط اجلاس زیدہ اپ ٹو ڈیٹ ہوتا ہے۔

مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اگر ہے تو صرف یہ کہ میرے دامن میں ایک ایسے ہندو روزنامے کا دفتر ہے جو میرے مخلوطی نظریئے کی مخالفت کرتا رہتا ہے اور میری پیدا کردہ آزادی کی راہ میں حائل ہوتا ہے، اکثر سوچتی ہوں کہ گرد اڑا اڑا کر اس دفتر کے کمروں کو اتنا گرد آلود کرتی رہو کہ اخبار والے تنگ آ کر اس مکان کو

چھوڑیں اور کسی اور سڑک پر چلے جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار کے ساتھ کمیٹی والوں کی سازباز ہے، وہ مجھ پر اتنی گرد ہونے ہی نہیں دیتے کہ میں انتقام لے سکوں"۔

نسبت روڈ نے اپنی تقریر ختم کی اور سرکلر روڈ کی باری آئی۔ اس نے لمبی چوڑی تمہید کے بعد کہا: "میں اپنی قسم کی واحد سڑک ہوں۔ میرا سر ہے نہ پیر، ابتدا ہے نہ انتہا، لاہور شہر میرا محور ہے اور میں اس کے اردگرد گھومتی ہوں۔ میں سب سڑکوں سے زیادہ مصیبت زدہ ہوں۔ غم والم نے میرے سینے میں جا بجا گڑھے ڈال دیے ہیں۔ یہ زخم ایسے ہیں کہ ایک جگہ سے بھرتے ہیں تو دوسری طرف سے پھوٹ نکلتے ہیں۔

لاہور میں سب سے زیادہ ٹریفک میرے سینے پر سے گزرتا ہے اور ٹریفک بھی زیادہ تر تانگوں کا گھوڑوں کے سم دن بھر میرا سینہ کریدتے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میرے دکھ کا کوئی علاج نہیں، کمیٹی والے بھی مجھ غریب کی طرف کم توجہ کرتے ہیں، کیونکہ انہیں ہماری گوری بہن مال روڈ کی نازبرداریوں ہی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔۔۔۔"

ان الفاظ پر مال روڈ نے احتجاج کیا اور صاحب صدر کی توجہ اس ذاتی حملے کی طرف منعطف کرائی۔ صاحب صدر کے حکم پر سرکلر روڈ نے اپنے وہ الفاظ واپس لیے اور تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "قدرت نے مجھ میں ایک خوبی رکھی ہے وہ یہ کہ مجھ پر چلنے والے تانگہ سوار کا کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ بدہضمی کے مریض یا ڈاکٹر تا حکیم کے پاس جانے کی بجائے تانگے میں سوار ہو کر میرے ہاں آتے ہیں

۔گویا میں اچھی خاصی ''امرت دھارا'' ہوں۔ان الفاظ پر ریلوے روڈ نے اٹھ کر کہا امرت دھارا کا کارخانہ میری ملکیت ہے، امرت دھارا میرے ہاں ملتا ہے۔ آپ نے میرے پیشے پر حملہ کیا ہے''۔

سرکلر روڈ کو یہاں بھی اپنے الفاظ واپس لینے پڑے اور وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔

''میرے منہ سے تو ایسی ہی باتیں نکلتی رہیں گیں۔اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے''۔

اس کے بعد مال روڈ نے اپنی تقریر یوں شروع کی۔

''ایک بہن نے ابھی ابھی طعنہ دیا تھا کہ کمیٹی والوں کو مال روڈ کی ناز برداریوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ میری طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے، لیکن میری بہن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ میری اور اس کی حیثیت میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔میں گوری ہوں وہ کالی، مجھ سے تعلق رکھنے والے صاحب لوگ اور اس کے چاہنے والے مہاجے ساہجے، میرا واسطہ موٹروں سے اور اس کا واسطہ تانگوں سے کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ میری ملاقات دن میں دو دفعہ لاٹ صاحب سے ہوتی ہے۔ایک دفعہ جب وہ دفتر جاتے ہیں اور دوسری دفعہ جب وہ دفتر سے واپس آتے ہیں، اگر موچی دروازے کے ایک پہلوان اور لاٹ صاحب میں کوئی فرق نہیں تو اس بہن میں یا دوسری کالی بہنوں میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں''؟

ان الفاظ پر چاروں طرف شیم شیم کی صدائیں بلند ہوئیں اور مال روڈ موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔اس کے بعد صاحب صدر نے مندرجہ ذیل ریزولیوشن پیش کیے جو

بالاتفاق منظور ہوئے۔

۱۔ کارپوریشن پر زور دیا جائے کہ وہ سڑکوں کے انگریزی ناموں کو دیسی ناموں میں بدل دیں

۲۔ نسبت روڈ کے بڑے چوک میں عشق کے دیوتا کامریں بت نصب کیا جائے

۳۔ مال روڈ کو پانچ سال کے لیے سرکلر روڈ کی جگہ اور سرکلر روڈ کو مال روڈ کی جگہ تبدیل کیا جائے

ابنِ انشا

اُستاد مرحوم

الہ دین نام تھا اور چراغ تخلص ۔ وطن مالوف ریواڑی جو گڑ گاؤں کے مردم خیز ضلع میں اہلِ کمال کی ایک بستی ہے اور آم کے آچار کے لیے مشہور ۔ وہاں دھنیوں کے محلے میں ان کی خاندانی حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں ۔ نگر دادا ان کے اپنے خاتم تھے ۔ شاہ غازی اورنگزیب نے شہرہ سنا تو خلعت و پارچے دے کر دلی بلوایا اور اپنی محلسرا کے لحاف بھرنے پر مامور کیا ۔ اللہ دیا نام تھا، لیکن ندافُ الملک کے خطاب سے مشہور تھے ۔ دلی میں یہ بارہ برس رہے ۔

وجاہت خاندانی کے ساتھ دولتِ روحانی بھی استاد مرحوم کو ورثے میں ملی تھی، ننھیال کی طرف سے سولہویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب نو گزے پیر سے جا ملتا ہے جن کا مزارِ اقدس پاکستان اور ہندوستان کے قریب ہر بڑے شہر میں موجود ہے اور زیارت گہِ ہر خاص و عام ہے ۔ انہی دونوں کی نسبتوں کا ذکر کر کے کبھی کبھار کہا کرتے کہ شاعری میرے لیے ذریعۂ عزت نہیں ۔ اپنے نام کے ساتھ ننگِ اسلاف ضرور لکھا کرتے تھے ۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی انہیں یہی لکھنا شروع کر دیا ۔

استاد مرحوم کہ پورا نام ان کا حضرت شاہ الدین چراغ چشتی نظامی ریواڑوی تھا ۔ ہمیں ہائی سکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے ۔ وطن کی نسبت سے اردو تو

ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی ، فارسی میں کمال کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچیس پشت پہلے ان کے مورث اعلیٰ خراسان آئے تھے ۔ کیوں آئے تھے؟ یہ سوال راقم کے دل میں بھی اکثر اٹھتا تھا۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر پوچھ لیا اور احتیاطاً وضاحت کر دی کہ مقصد اعتراض نہیں ، دریافت معلومات ہیں ، فرمایا ۔ ۔ ۔ بابر کیوں آیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی کیوں آیا تھا؟ اب جو راقم نے اس سوال نما جواب کی بلاغت پر غور کیا تو اپنی کم فہمی پر بے حد شرمندگی ہوئی ۔ بابر نہ آتا تو ابراھیم لودھی کس سے شکست کھاتا ؟ خاندان مغلیہ کہاں سے آتا ؟ اتنی صدیاں ہندوستان کی رعایا بادشاہوں کے بغیر کیا کرتی ؟ مالیہ اور اخراج کس کو دیتی ؟ کچھ ایسی ہی حکمت استاد مرحوم کے مورث اعلیٰ کے ہندوستان آنے میں ضرور ہوگی ، جس تک معمولی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی ۔ خیر یہ ذکر تو ضمناً آ گیا۔ مقصود کلام یہ کہ خراسان کی نسبت سے فارسی ایک طرح ان کے گھر کی زبان تھی ۔ عربی کے بھی فاضل تھے ، اگرچہ باقاعدہ پڑھی نہ تھی ۔ عزیم اسرار احمد کا نکاح پڑھایا تھا ، اور کوئی کاغذ پرچی سامنے رکھے بغیر ، ماشاللہ ، استغفر اللہ ، نعوذ باللہ ، لاحول ولاقوۃ ، الا باللہ ، اور ایسے ہی کئی اور عربی کے جملے بے تکان بولتے تھے ۔ خیر خراسان بھی کہے ں عرب کی طرف کو ہے ۔ لہذا عربی پر ان کا عبور تعجب نہیں ، ہاں انگریزی کی لیاقت جو انہوں نے از خود پیدا کی تھی ، اس پر بھی راقم کو حیرت ہوتی تھی ۔ ایک بار ایک دیہاتی منہ اٹھائے ان کی کلاس میں گھس آیا ۔ حضرت فوراً انگریزی میں حکم دیا ۔ گٹ آؤٹ ۔ اسے تعمیل کرتے ہی بنی ۔ علاقے کا مال افسر انگریز تھا ایک روز سکول میں نکل آیا اور آدھا گھنٹا گفتگو کرتا رہا۔ استاد مرحوم برابر سمجھتے گئے اور سر ہلاتے گئے ۔ بیٹش بیٹش میں

موقع بموقع یس یس اور پلیز پلیز بھی کہتے جاتے تھے۔

پرانے بزرگوں سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کے متعلق سنا ہے کہ انگریزی سمجھتے خوب جانتے تھے، لیکن بولنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمارے استاد کا بھی یہی عمل تھا۔ ہمیں انگریزی میں ان کے تجر کا پہلے علم تھا۔ ہو یہ کہ ایک روز ہماری انگریزی کی کلاس میں نکل آئے اور پوچھا لڑکوں بتاؤ ماش کی دال کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں ؟ سب چپ کون بتاتا۔ پھر سوال کیا کریلے کی انگریزی کیا ہے؟ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر استاد مرحوم نے بتایا اور ''انگلش ٹیچر'' کھول کر اس کی تصدیق بھی کردی۔ یہ کتاب جو انگریزی کے علم کا قاموس ہے، سفر وحضر میں استاد مرحوم کے ساتھ رہتی تھی اور بڑے بڑے دان ان کے سامنے آتے کتراتے تھے کہ نہ جانے کب کس ترکاری کا نام انگریزی میں پوچھ لیں۔ انگریزی تحریر پر ان کی قدرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دستخط بھی انگریزی میں ہی کیا کرتے تھے۔

استاد مرحوم نے اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے طبیعت میں بھی موزوں پائی تھی اور ہر طرح کا شعر کہنے پر قادر تھے۔ اردو فارسی میں ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اگلی نسلوں کے کام آئے گا۔ اس علم وفضل کے باوجود انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اسکول میگزین جس کے یہ نگراں تھے، ایڈیٹر نے استاد مرحوم کے متعلق یہ لکھ دیا کہ وہ سعدی کی ہم پلہ ہیں۔ انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ اسکول میگزین کا یہ پرچہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور ایک ایک کو دکھاتے کہ دیکھو لوگوں کی میرے متعلق یہ رائے ہے، حالانکہ من آنم کہ من دانم ایڈیٹر کو بھی

جودسویں جماعت کا طالبعلم تھا، بلا کر فہمائیش کی عزیزی یہ زمانہ اور طرح کا ہے۔ ایسی باتیں نہیں لکھا کرتے، لوگ تو مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ حسد کے مارے جانے کیا کیا کہتے پھریں گے

اہلِ علم، خصوصاً شعراء کے متعلق اکثر یہ سنا ہے کہ ہمعصروں اور پیشروؤں کے کمال کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ استاد مرحوم میں یہ بات نہ تھی۔ بہت فراغ دل تھے۔ فرماتے تھے، غالب اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھا لکھتا تھا۔ میر کے بعض اشعار کی بھی تعریف کرتے تھے۔ امیر خسرو کے بھی معترف تھے۔ برملا کہتے کہ ذہین آدمی تھے اور ان کی کہہ مکرنیاں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ امیر خسرو کی ایک غزل استاد مرحوم کی ایک غزل کی زمین میں ہے فرماتے، انصاف یہ ہے کہ پہلی نظر میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے۔ پھر بتاتے کہ امیر خسرو مرحوم سے کہاں کہاں محاورے کی لغزش ہوئی ہے۔ اقبال کے متعلق کہتے تھے کہ سیالکوٹ میں ایسا شاعر اب تک پیدا نہیں ہا تھا۔ اس شہر کو ان کی ذات پر فخر کرنا چاہیئے۔ ایک بار بتایا کہ اقبال سے میری خط وکتابت رہی ہے۔ دو تین خط علامہ مرحوم کو انہوں نے لکھے تھے کہ کسی کو ثالث بنا کر مجھ سے شاعری کا مقابلہ کر لیجئے راقم نے نے پوچھا نہیں کہ ان کا جواب آیا کہ نہیں۔

استاد مرحوم کو عموماً مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا تھا۔ کیونکہ سب پر چھا جاتے تھے اور اچھے اچھے شاعروں کو خفیف ہونا پڑتا تھا خود بھی نہ جاتے تھے کہ مجھ فقیر کو ان ہنگاموں سے کیا مطلب۔ البتہ جوبلی کا مشاعرہ ہوا تو ہمارے اصرار پر اس میں شریک ہوئے اور ہر چند کے مدعو نہ تھے، منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دیوانہ

کسمنڈی، خیال گڑگانوی اور حسرت بانس بریلوی جیسے اساتذہ سٹیج پر موجود تھے، اس کے باوجود بھی استاد مرحوم کو پہلے پڑھنے کی دعوت دی گئی وہ منظر اب تک راقم کی آنکھوں میں ہے کہ استاد نہایت تمکنت کے ساتھ ہولے ہولے قدم اٹھائے مائیک پر پہنچے اور ترنم سے اپنی مشہور غزل پڑھنی شروع کی۔۔۔۔

ہے رشتہ غم اور دل مجبور کی گردن
ہے اپنے لیے اب یہ بڑی دور کی گردن

ہال میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ لوگوں نے سانس روک لیے۔ استاد مرحوم نے داد کے لیے صاحب صدر کی طرف دیکھا، لیکن وہ ابھی تشریف نہ لائے تھے، کرسی صدارت خالی پڑی تھی۔ دوسرا شعر اس بھی زوردار تھا۔۔۔۔

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
اور دار پہ ہے حضرت منصور کی گردن

دوسرا مصرع تمام نہ ہوا کہ داد کا طوفان پھٹ پڑا۔ مشاعرے کی چھت اڑنا سنا ضرور تھا۔ دیکھنے کا اتفاق آج ہوا۔ اب تک شعراء ایک شعر میں ایک مضمون باندھتے رہے ہیں۔ وہ بھی بمشکل۔ اس شعر میں استاد مرحوم نے ہر مصرعے میں ایک مضمون باندھا تھا اور خوب باندھا ہے۔ لوگ سٹیج کی طرف دوڑے۔ غالباً استاد مرحوم کی پابوسی کے لیے لیکن رضا کاروں نے انہیں باز رکھا۔ اسٹیج پر بیٹھے استادوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنی غزلیں پھاڑ دی اور اٹھ گئے۔ جان گئے تھے کہ اب ہمارا رنگ کیا جمے گا ادھر لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ تیسرے شعر پر ہی فرمائش ہونے لگی کہ مقطع پڑھیے، مقطع پڑھیے۔۔۔۔ چوتھے شعر پر مجمع نے

قابو ہو رہا تھا کہ صدر جلسہ کی سواری آ گئی اور منتظمین نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے استاد مرحوم کو بغلی دروازے کے باہر چھوڑ کر اجازت چاہی۔ اب ضمناً ایک لطیفہ بھی سن لیجئے جس سے اخبار والوں کی ذہنیت عیاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح روزنامہ ''پتنگ'' کے رپورٹر نے لکھا کہ جن استادوں نے غزلیں پھاڑی تھیں وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ عجب نامعقول مشاعرے میں آ گئے ہیں۔ لوگوں کی بے محابا داد کو اس بد باطن نے ہوٹنگ کا نام دیا اور استاد مرحوم کے اس مصرعے کو

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

بوجہ لاعلمی یا شرارت بجائے توارد کے سرقہ قرار دیا، بات فقط اتنی تھی کہ منتظمین نے ایڈیٹر پتنگ کے اہلِ خانہ کو مشاعرے کے پاس معقول تعداد میں نہ بھیجے تھے، اگر یہ بات تھی تو اسے منتظمین کے خلاف لکھنا چاہیے تھا نہ کہ استاد مرحوم کے خلاف اور پھر اس قسم کے فقروں کا کیا جواز کہ استاد چراغ شعر نہیں پڑھ رہے تھے روئی دھن رہے تھے، صحیح محاورہ روئی دھننا نہیں دھکنا ہے۔

اس دن کے بعد سے مشاعرے والے استاد کا ایسا ادب کرنے لگے کہ اگر استاد اپنی کریم النفسی سے مجبور ہو کر پیغام بھجوا دیتے کہ میں شریک ہونے کے لیے آ رہا ہوں تو وہ خود معذرت کے لیے دوڑ آتے کہ آپ کی صحت اور موفیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ استاد تو استاد ہیں۔ ہمیں ان کے ناچیز شاگردوں کو بھی رقعہ آ جاتا کہ معمولی مشاعرہ ہے آپ کے لائق نہیں۔ زحمت نہ فرمائیں۔

استاد مرحوم کو رباعی، قصیدہ، غزل وغیرہ کے علاوہ تضمین سے خاص دلچسپی تھی۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کے بچے کے ختنے پر جو دھوم دھامی مشاعرہ ہوا۔ اس کے لیے

آپ نے غالب کی غزل کی مخمس میں تضمین کی تھی اس پر بے انتہا داد ملی جب یہ بند کے چوتھے اور پانچویں مصرع پر آئے تو لوگ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے ڈونگرے برساتے۔

یہ سچ ہے کہ استاد مرحوم کو نام اتنا مشہور نہ ہوا جتنا ان کے ہمعصروں اقبال، حفیظ، جوش وغیرہ کا۔ بات یہ ہے کہ یہ زمانہ پروپیگنڈے کا تھا اور استاد نام و نمود اور چھپنے چھپانے کے قائل نہ تھے۔ اور ایک بار راقم نے استاد مرحوم کے ایما پر ان کی کچھ غزلیں مختلف رسالوں میں بھجوائی تھیں۔ ان میں سے ایک لالہ چونی لال خستہ کے ریواڑی گزٹ میں آب و تاب سے چھپی لیکن باقی واپس آگئیں۔ آئندہ کے لیے منع کر دیا اور اپنی طرف اشارہ کر کے یہ پڑھا۔

اے تماشگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

یہی حال ان کے مجموعوں کا تھا۔ اپنا کلام مضبوط ولایتی کاغذ پر لکھتے تھے اور جب پورا رجسٹر ہو جاتا تو اس کی جلد بنوا کر، جلد اول، جلد دوم، وغیرہ لکھ کر الماری میں سجا دیتے۔ مولانا کے ہاں مخلوطات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا اور ایک بات میں تو یہ ذخیرہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، خدا بخش لائبریری وغیرہ کے ذخیروں سے بھی ممیز اور فائق سمجھنا چاہئے۔ ان کتب خانوں میں سب مخلوطات پرانے زمانے کے ہیں بعض تو ہزار ہزار سال پرانے خستہ اور بدرنگ، ہاتھ لگاؤ تو مٹی ہو جائیں۔ لیکن استاد مرحوم کے سبھی مخلوطات نہایت اچھی شکل میں تھے اور زیادہ تر ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ بیسویں صدی کے مخلوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ

غالباً کسی کے پاس نہ ہوگا۔ استاد کی جو چیزیں جو طباعت کے عیب سے آلودہ نہ ہوئیں ۔ اسے بھی راقم مصلحتِ خداوندی سمجھتا ہے ، اگر سبھی چیزیں چھپ جایا کریں تو قلمی نسخے کہاں سے آیا کریں اور قلمی نسخے نہ ہوں تو لوگ ریسرچ کس پر کریں اور ریسرچ نہ ہوں تو ادب کی ترقی رک جائے اور پی ایچ ڈی نقاد پیدا ہونے بند ہو جائیں ۔

راقم نے ایک بار عرض کیا کہ ان نوادر کو تو کسی ریسرچ لائبریری میں ہونا چاہیے ۔ فرمایا میرا اپنا یہی خیال تھا، اور میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لکھا بھی تھا اور مسودات کی فہرست منسلک کی تھی ۔ ان بے چاروں نے شکریہ ادا کیا، لیکن معذرت کی کہ فی الحال ہماری لائبریری میں جگہ کی کمی ہے ۔ البتہ نعمت اللہ کباڑی مرحوم کہ دہلی کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے اور مخطوطات سے جدیدہ و مفیدہ کا یہ سارا ذخیرہ اٹھانے کو تیار تھے ۔ اماں بی یعنی استاد مرحوم کی منجھلی اہلیہ نے کئی بار کہا بھی کہ اس وقت اچھا بھاؤ جا رہا ہے، تلوا دو، لیکن استاد مرحوم نے کبھی لالچ گوارہ نہیں کیا جواب دیا کہ یہی تو میرا مقصد جلبِ منفعت نہیں خدمتِ ادب ہے ۔

استاد مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ اور شکستہ تھا ۔ کسی خاص صنعت میں لکھتے تھے جس کا نام اس وقت راقم کے ذہن سے اتر گیا ہے خوبی اس کی یہ ہے کہ صرف لکھنے والا پڑھ سکتا ہے ۔ راقم التحریر کے املا میں بھی جو لوگوں کو یہ خصوصیات نظر آتی ہے ۔ ادھر ہی کا فیضان ہے ۔

طبیعت میں ایجاد کا مادہ تھا ۔ لکیر کے فقیر نہ تھے ۔ اب اسی لفظ فیضان کو لیجئے

اسے وہ ''ظ'' سے لکھتے تھے ۔ ایک بار طوطا رام صیاد نے پر اعتراض بھی کیا ۔ یہ صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے تھے، اور معمولی تعلیم یافتہ تھے ۔ استاد مرحوم نے چمک کر جواب دیا ۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے، ہم جیسا لکھیں گے وہی سند ہوگا ۔ ماسٹر جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔ بعد میں راقم کو استاد مرحوم نے ایک مستند قلمی نسخے میں فیضان ''ظ'' سے لکھا ہو دکھایا ۔ اس نسخے کا نام یاد نہیں، لیکن کم از کم پچیس سال پرانا ہوگا اور خود استاد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا ۔ ان شہادتوں کے باوجود اتنے وسیع القلب تھے کہ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے ''ض'' سے لکھنا بھی غلط نہیں ۔ اسی طرح بہت سے اور الفاظ تھے ج کا تلفظ اور املا وہ عام رواج سے ہٹ کر کرتے تھے ۔ کوئی انگشت نمائی کرتا تو جواب دیتے کہ ہمارے گاؤں میں یونہی لکھتے ہیں ۔ معترض چپ ہو جاتا ۔

استاد مرحوم کے اوصاف حمیدہ کا حال لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے ۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ۔ مختصر یہ کہ دریا دل آدمی تھے کوئی شخص کوئی چیز پیش کرتا تو کبھی انکار نہ کرتے ۔ دوسری طرف اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے، کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ دیتے، دوسروں کو بھی منع کر دیتے کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہے، اس کی خودداری مجروح ہوگی ۔ اس شخص کو پند و نصائح سے مطمئن کر کے بھیج دیتے ۔

استاد مرحوم کی طبیعت خوشامد سے نفور تھی ۔ راقم کو معلوم نہ تھا کہ محکمہ تعلیم کے افسروں نے اور ڈپٹی کمشنروں کے علاوہ، کہ حاکم ضلع ہونے کے لحاظ سے اولوالامر کی تعریف میں آتے ہیں ۔ انہوں نے کبھی کسی کا قصیدہ کہا ہو ۔ البتہ کسی افسر یا

سیٹھ کے ہاں شادی ہوتو سہرا کہہ کر لے جاتے اور ترنم سے پڑھ کر سناتے ۔ فرماتے یہ وضعداری ہے، اس کا انعام کسی نے دے دیا تو لے لیا ورنہ اصرار نہ کرتے تھے۔ اشاعت تعلیم سے دلچسپی تھی چنانچہ ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر تعلیمات کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔

استاد مرحوم کا مسلک صلح کل تھا۔ جس زمانے میں مولوی محمد عمر انسپکٹر تعینات تھے۔ یہ تنظیم اہل سنت کے جلوسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی جگہ ظلِ حسنین امروہی آئے تو ان کی تنظیم سے شکایتیں پیدا ہو گئیں اور اثنا عشری مسجد میں دیکھے جانے لگے۔ اہل بیت کے جو مرثیے ان کے دیوان میں ہیں اسی زمانے کے ہیں کچھ دنوں قاضی نور احمد کا تقرر بھی اس خدمت پر رہا۔ یہ قادیانی احمدی تھے۔ استاد مرحوم ان دنوں برملا فرماتے تھے کہ مجھے تو اگر اسلام کی سچی روح کہیں نظر آتی ہے تو انہی کے ہاں۔ اس سال عید کی نماز انہوں نے احمدیوں کی مسجد میں پڑھی، فرماتے سبھی خلکے گھر ہیں۔ کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ پنڈت رادھے شیام ہیڈ ماسٹر ان سے ہمیشہ خوش رہے۔ انہیں استاد سے ہی معلوم ہوا تھا کہ کرشن جی باقاعدہ نبی تھے اور تورات میں ان کی آمد کا ذکر ہے۔

موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں نور بھی تھا، لیکن محلے والے اچھے نہ تھے۔ استاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہوتا دل جمعی سے تکمیل شوق کریں ۔ ویسے بھی کبھی کبھی محفل میں ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی ان کا محبوب ساز تھا اور سہگل مرحوم کی مشہور غزل نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے، سنانی شروع کر دیتے، ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرکے

ایک ایک کر کے اٹھ جاتے، کیونکہ اس فن کے ریاض کے لیے تنہائی ضروری ہے۔

استاد مرحوم ہاتھ دیکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے طبیب حاذق بھی تھے۔ آخر میں طبابت تو انہوں نے ترک کردی تھی، کیونکہ ایک مریض کے رشتہ داروں نے جوان کے زیرِ علاج تھا اور ان کی تیر بہدف دوا سکمی کی ایک خوراک کھانے کے بعد خالقِ حقیقی سے جاملا تھا، بے وجہ ایک فساد کھڑا کر دیا تھا اور نوبت پولیس تھانے تک پہنچی تھی۔ دستِ شناسی کا شوق البتہ جاری رہا۔ طبابت کی طرح اس فن میں بھی نہ کسی کے شاگرد تھے نہ کوئی کتاب پڑھی تھی۔ خود فرماتے تھے مبدا فیض کی دین ہے۔ ماضی کا حال نہایت صحت سے بتاتے تھے، لیکن اجنبیوں کا ہاتھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہی سے کھلتے تھے جن سے دیرینہ واقفیت اور رسم و راہ ہوتی۔ مستقبل کے بارے میں ان کا اصول تھا کہ لوگوں کا صحیح بات نہ بتانی چاہیے، ورنہ ان کا تقدیر اور عالمِ غیب پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اس فن سے ان کی آمدنی خاصی تھی اور اسی پر قانع تھے۔ اسکول کی تنخواہ بچا کر خدا کی راہ میں لوگوں کو سود پر دے دیتے تھے۔

ایسی دیدہ زیب شخصیتیں چشمِ فلک نے کم ہی دیکھیں ہوگی، جیسے استاد چراغ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ قد پانچ فٹ سے بھی نکلتا ہوا۔ جسم بھرا بھرا خصوصاً کمر کے آس پاس۔ سر پر میل خورے کپڑے کی ٹوپی اور اس کھ شیروانی۔ راقم نے کبھی ان کو ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔ ایک بار خود ہی فرمایا کہ ایک تو یہ خلافِ تہذیب ہے دوسرے کوے ٹھونگیں مارتے ہیں۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے چال میں بچوں کی سی معصومیت تھی، رنگ سرمئی، آنکھیں سرخ و سفید اور پھر جلال ایسا کہ مائیں دیکھ کر بچوں کو چھپا لیتی تھیں۔ دانت تمباکو خوری کی کثرت سے شہید ہو گئے

تھے، لہذا تمبا کو چھوڑ دیا۔ فقط نسوار کا شوق رکھا تھا، چشمہ لگاتے تھے، لیکن ہماری طرح چشمے کے غلام نہ تھے۔ بالعموم اس کے اوپر سے دیکھتے تھے، سرخ کمر بند میں چابیوں کا گچھا چاندی کے گھنگھروؤں کی طرح بجتا۔ دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔ اس لیے گیارہ تک با آسانی گن لیتے تھے حواس پر ایسا ہی قابو تھا کہ جس محفل میں چاہتے تھے اور خراٹے لینے لگتے تھے، پھر آپ ہی آپ اٹھ بیٹھتے تھے، کھانے کا شوق ہمیشہ سے تھا ،خصوصاً دعوتوں میں فرماتے کھانے میں دو خوبیاں ہونی چاہیئے۔ اچھا ہوں اور بہت ہو۔ کھانے کے آداب کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ سب سے پہلے شروع کرو اور سب سے آخر میں ختم کرو۔ جس ضیافت میں استاد مرحوم ہوتے، لوگ کھاتے کم ان کی طرف رشک سے زیادہ دیکھتے تھے۔ لیکن یہ جوانی کی باتیں ہیں آخر میں پرہیزی کھانا کھانے لگتے۔ میزبان کے ہاں پہلے سے ہی کہلوا دیتے کہ یخنی وغیرہ کا انتظام کر لینا اور میٹھے میں سوائے حلوے کے اور کچھ زیادہ نہ ہو۔ چوزے کے متعلق فرماتے کہ زود ہضم ہے خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دال سے احتراز فرماتے کہ نفع پیدا کرتی ہے۔

بزلہ سنجی استاد مرحوم کی طبیعت میں ایسے تھے جیسے باجے میں راگ، جیسے تلوار میں جوہر، لطائف بیربل و ملا دو پیازہ'' کے سب لطیفے نوک زبان تھے۔ ان سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطیفوں کی تخصیص نہیں لوگ ان کی دوسری باتوں پر بھی ہنستے تھے۔

ایسا بڑا آدمی اور سادگی کا یہ عالم کہ کبھی خیال نہ کیا کہ لباس میلا ہے یا پیوند لگا

ہے۔فرماتے انسان کا من اجلا ہونا چاہیے۔تن تو ایک عارضی چولا ہے۔اس مضمون کو کبیر کا ایک دوہا تھ بھی پڑھتے۔کپڑا پہننے کا سلیقہ تھا۔ایک کالی اچکن کو پورے بیس برس تک چلایا۔جب سردی آتی۔اسی جھاڑ کو پہن لیتے۔فرماتے، کپڑے کے دشمن دو ہیں۔دھوبی اور استری۔واقع سچ ہے، یہ اچکن جو آخر میں ملگجے رنگ کی ہوگئی تھی۔دھوبی اور استری کے ہتھے چڑھ جاتی تو کبھی کی غارت ہوگئی ہوتی۔ایک روز اسے پہنے راقم کے ہمراہ کسی قوالی میں جارہے تھے قوالی کرنے نہیں، سننے، کہ چورا ہے پر رکنا پڑا۔ایک مرد شریف نے نہ جانے کیا خیال کرکے ان کے ہاتھ پر ٹکا رکھ دیا۔راقم کچھ کہنے کو تھا کہ استاد مرحوم نے اشارے سے منع کر دیا اور ٹکا جیب میں ڈال لیا یہی حال جوتے کا تھا۔فرماتے جوتا ایسی چیز ہے کبھی ناکارہ ہو ہی نہیں سکتا۔تلا پھٹ جاتا تو نیا لگوا لیتے، اوپر کا حصہ پھٹ جاتا تو اسے بدلوا لیتے۔داڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح پر رعب، گھنی اور لمبی، اسے ترشواتے نہیں تھے۔فرماتے خدا کا نور ہے۔بعض لوگوں کو گمان تھا کہ کہ پیسا بچانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔لیکن یہ غلط ہے ان کا پاس پیسا بہت تھا اور جمع کرنے کا شوق بھی تھا لیکن پیسے کی طمع ان میں نہیں تھی

استاد مرحوم یوں تو اپنے سبھی شاگردوں سے محبت کرتے تھے، حاجی امام دین سوختہ بیکری والے، خلیفہ اے ڈی مقراض مالک جنٹلمین ہیئر کٹنگ سیلون، حسین بخش مدعی، عرائض نویس وغیرہ سبھی ان کے اخلاقِ حسنہ اور الطاف عمیم کی گواہی دیں گے، لیکن راقم سے ان کو ربط خاص تھا۔فرماتے میرے علم وفضل کا صیح جانشین تو ہو گا۔رات کا کھانا اکثر راقم کے ساتھ کھاتے اور وقت کی پابندی کا لحاظ اس درجہ

تھا کہ اکثر ہم دستر خوان پر بیٹھے ادھر استاد مرحوم پھاٹک سے نمودار ہوئے، بچوں سے لگاؤ تھا۔ جو بچہ ہمت کرکے ان کے پاس آتا انعام پاتا۔ ایک بار راقم کے بڑے بھتیجے کو ایک دکنی دی تھی۔ وہ اب تک استاد مرحوم کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے ہے۔

ایک دن فرمایا۔ ایک بات کہوں؟ راقم نے عرض کیا، فرمایئے، بولے جھوٹ تو نہ سمجھوگے؟ راقم نے کہا، خانہ زاد کی کیا مجال! فرمایا۔ تو کان کھول کر سنو، میری نظر میں تم جوش، جگر، وغیرہ بلکہ آج کل کے سبھی شاعروں سے اچھا لکھتے ہو۔ راقم نے آبدیدہ ہوکر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کیا سب آپ کا فیض ہے، ورنہ بندہ کچھ بھی نہ تھا۔ قارئین اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ استاد مرحوم کی نظر کتنی گہری تھی اور رائے کتنی صائب ان کا یہ قول راقم نے اکثر لوگوں کو سنایا، معضوں نے جو انصاف پسند تھے۔ اعتراف کیا کہ ہاں ایسے استاد کا ایسا شاگرد کیوں نہ ہو، کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے کہا کہ یہ بات استاد نے شاید تمہارا دل بڑھانے کو کہی ہو۔ ان سے راقم کیا بحث کرتا، یہی کہا آپ جو فرمائیں بجا ہے، لیکن دل میں سوچا کہ جس شخص کو زندگی بھر تملق اور زمانہ سازی سے واسطہ نہ رہا ہو وہ اس بات میں کیوں مبالغہ کرنے لگا اور پھر اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کے لیے

۱۹۶۳ء عجب سال تھا۔ اس میں دنیا کو ایک طرف صدر کینیڈی کا داغ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف علم و فضل اور جود وسخا کا یہ آفتاب جس نے واقعی چراغ بن کر زمانے کو روشن کیا تھا۔ غروب ہوگیا۔ عمر عزیز کے ۸۶ برس ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کچھ دن باقی تھے ہائے استاد۔۔

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد ستد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

وصال تاندلیانولہ ہی میں ہوا جہاں استاد مرحوم پاکستان بننے کے بعد مقیم ہو گئے تھے اور گھی کی آڑھت کرتے تھے۔ سنا ہے معمولہ بخار ہوا تھا اور ہر چند کہ اپنے ہی مجربات سے علاج کیا، طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ راقم کو خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا ''ہائے اللہ دین کا چراغ بجھ گیا''۔ عدد گنے تو پورے ۱۳۸۳ھ کیسی برجستہ اور سہل ممتنع تاریخ ہے۔ آج استاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے

استاد کے خاندان کی کیفیت بھی مختصر الفاظ میں عرض کروں۔ چار شادیاں تھیں پانچویں عمر بھر نہ کی۔ کیونکہ شرع سے انحراف منظور نہ تھا۔ آہ بھر کر فرماتے جب تک چاروں زندہ ہیں، ایک اور کیسے کرلوں، شروع میں چار کی اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ سلوک یکساں ہو۔ سو الحمد اللہ کہ چاروں کا سلوک ان سے یکساں تھا، لیکن استاد بھی ایسے صابر تھے کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اولاد صرف ایک سے ہوئی۔ امید ہے کہ عزیز مکرم ہدایت علی ان کے فرزند اکبر جو خود بھی موزوں طبع ہیں اور فراغ تخلص کرتے ہیں اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ رسمی تعلیم ان کی زیادہ نہیں۔ صفائے باطن کے مراحل فقیروں کے تکیوں اور قوالی کی محفلوں میں طے کیے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ استاد مرحوم کے وصال کے بعد سر عام انھوں نے شراب پینا ترک کر دیا تھا اور افیم بھی اب اعتدال سے کھاتے ہیں یہ بھی اپنے نامی والد کی طرح روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ لہذا

تعزیت کے خط میں فوراً پانچ سو روپے منگوا بھیجے۔ راقم نے لکھا کہ عزیزی۔ اس خانوادے پر متاع دل و جان نثار کر چکا ہوں۔ روپیہ کیا پیچھے رہ گیا؟ تم یوں کرو کہ استاد مرحوم کہ قبر پر سبز چادر چڑھا کر بیٹھ جاؤ، خدا برکت دے گا اور وہیں رزق پہنچا دیا کرے گا۔ اگر فتح علی مبارک علی راضی ہو جائیں تو سبحان اللہ سال کے سال عرس سراپا قدس کا اہتمام بھی کرو۔ معلوم نہیں یہ خط ان کو ملا یا نہیں کیونکہ پھر جواب نہیں آیا اور راقم کو بھی مکروہات دینوی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ دوبارہ خط لکھتا۔

کنہیالال کپور

مرزا کامل

مرزا کامل ان افراد میں سے ہیں جن پر حالی کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ویسے دیکھنے میں وہ بھلے چنگے نظر آتے تھے، لیکن اپنی گفتگو میں کچھ اس انداز سے دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ سامعین دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے عجیب وغریب انکشافات پر لطیفوں کا گمان ہوتا ہے لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ مرزا پر طرح طرح کے فقرے کستے ہیں، لیکن مرزا پریشان ہوتے ہیں نہ پشیمان، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی لیاقت کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

ایک مجلس میں مونا لیزا کا ذکر چل رہا تھا۔ کسی شخص نے مرزا کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے چٹخارہ لیتے ہوئے فرمایا ''اجی صاحب! کیا بات ہے مونا لیزا کی۔ یونان کی حسین ترین رقاصہ سکندر اعظم کی ص الخاص منظور نظر تھی۔ کہتے ہیں جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا تو وہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دارا کو سکندر نے نہیں مونا لیزا نے قتل کیا تھا اور قتل کرنے سے پہلے اُسے اپنے تیر نظر سے بری طرح گھائل کر دیا تھا۔ مرنے سے پہلے دارا نے مونا لیزا کو مخاطب کر کے فارسی کا یہ شعر پڑھا تھا جس کا مفہوم اردو کے شاعر نے یوں ادا کیا ہے

ہم کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے

ایران سے مونالیزا مصر پہنچی جہاں اس کی ملاقات قلوپطرہ سے ہوئی۔قلوپطرہ کے محل میں اینٹنی نے اسے دیکھ کر کہا تھا ''کاش قلوپطرہ کی بجائے مجھے تم سے عشق ہوتا ''۔

اس شخص نے مرزا صاحب کو مطلع کرتے ہوئے کہا ''حضور! مونالیزا تو ایک مشہور تصویر کا نام ہے ،جسے لیونارڈو ڈاونچی کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے''۔

مرزا صاحب نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھتے ہوئے کہا ''میں گوشت پوست کی مونالیزا کی بات کر رہا ہوں۔یہ مونالیزا اس زمانے میں ہوا کرتی تھی جب تمہارا لیونارڈو ڈاونچی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔یہ وہی مونالیزا ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس کی ناک ذرا اور تیکھی ہوتی تو وہ آدھی دنیا کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر سکتی تھی''۔

''ہم نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے''۔

''آئندہ یاد رکھیے گا''۔

ایک اور محفل میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی کہ کالی داس شیکسپیئر سے بڑا ڈرامائسٹ ہے یا نہیں۔مرزا نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے یہ فتویٰ صادر کیا۔۔۔
''کالی داس چوتھی اور شیکسپیئر سولہویں صدی میں ہوا اس لیے کالی داس شیکسپیئر سے بارہ صدیاں بڑا ڈرامائسٹ ہے اس کے علاوہ ہمیں یہ نکتہ بھی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ کالی داس سے چرائے ہیں۔۔۔

مثال کے طور پر''؟ کسی نے سوال کیا۔

''ہیملٹ کا پلاٹ شکنتلا سے چرایا گیا ہے''۔

''لیکن ان ڈراموں کے پلاٹ میں کوئی مشابہت نہیں''

''ہے کیسے نہیں''؟ مرزا نے چمک کر کہا ''معلوم ہوتا ہے آپ نے ہیملٹ پڑھا ہے نہ شکنتلا''

''اچھا آپ ہی بتائیں، ان دو ڈراموں کے پلاٹ میں کون سی چیز مشترک ہے''۔

''کئی چیزیں ہیں، مثلاً ہیملٹ ایک موقع پر سوچتا ہے، زندگی اچھی یا خودکشی۔ اسی طرح جب دشینت شکنتلا کو ٹھکرا دیتا ہے تو وہ بھی اس انداز میں سوچتی ہے''۔

''اول تو یہ غلط ہے، بالفرض آپ کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس ''جز'' کا ''کل'' سے کوئی تعلق خاص تعلق نہیں''۔

''یہ تعلق آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا، کیونکہ آپ کی واقفیت محدود اور معلومات ناقص ہیں۔۔۔''

ایک دفعہ دو اشخاص میں ایک شعر کے متعلق جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے مرزا کے پاس پہنچے اور ان کے رائے طلب کی مرزا نے کہا ''شعر پڑھیے'' شعر پڑھا گیا۔ مرزا نے اسے دو ایک بار خود پڑھا اور فرمایا واقعی بے نظیر شعر ہے

دل تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامندی کر گئی

''میں کہتا ہوں کہ یہ شعر غالب، میرے دوست کا خیال ہے ذوق کا ہے آپ کی کیا رائے ہے''؟

''حضرات''مرزا نے کہا'' آپ دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے، نہ ذوق کا دراصل اسے تین شاعروں نے مل کر کہا ہے۔۔۔۔۔اور وہ تھے، دل شاہجہاپنوری، حضرت جگر مرادآبادی اور محترمہ ادا بدایوانی ،ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ تینوں کے تخلص شعر میں موجود ہیں''۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اس دن ہوا جب ایک طالب علم نے مرزا سے فانی کے ایک مشہور شعر کی تشریح کرنے کے لیے کہا وہ شعر تھا:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

مرزا نے بڑی سنجیدگی سے کہا'' یہ ایک مزاحیہ شعر ہے۔ عاشق معشوق کو ڈرانے کے لیے کفن میں گھس جاتا ہے اور کچھ دیر کے لیے چپ سادھ لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مہر سکوت توڑتا ہے اور معشوق کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی بے رخی پر طنز کرتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے۔ ورنہ اگر واقعی اس کی موت ہو گئی ہوتی تو وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکتا تھا،شعر کہنا تو دور کی بات''۔

مرزا نے کبھی کسی غیر ملک کی سیاحت نہیں کی، لیکن اگر کوئی شخص ان کے سامنے کسی غیر ملک کا ذکر چھیڑ دیتا تو وہ اس میں دخل دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک نوجوان جولندن سے لوٹا تھا، ہائیڈ پارک کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔

مرزا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''جی ہاں ہائیڈ پارک انگلینڈ کی سب

سے بڑی کھالوں کی منڈی، جہاں ہر قسم کے جانوروں کی کھال مل جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے وہاں سے ایک لومڑی کی کھال دو پاؤنڈ میں خریدی تھی''۔

''لیکن صاحب ہائیڈ پارک کھالوں کی منڈی نہیں ایک پارک کا نام ہے جہاں تقریر کی مکمل آزادی ہے''۔

''آپ کا قیاس بالکل غلط ہے، اگر یہ محض پارک ہوتا تو پھر اس کا نام ہائیڈ پارک رکھنے کی کیا ضرورت تھی''؟

کل شام تو مرزا نے کمال ہی کر دیا۔ایک مصری سیاح نے ان سے دریافت کیا''کیا آپ کبھی مصر بھی گئے ہیں''؟

''جی ہاں، کئی بار مصر جانے کا اتفاق ہوا ہے''۔

''اہرام مصر بھی دیکھے''؟

''دیکھے؟ مرزا مے چونک کر کہا''ان ہی کے ہاں تو ہمارا قیام رہا۔وہ تو ہمارے جگری دوست ہیں۔ان سے بڑھ کر مہمان نواز رئیس شاید ہی مصر میں ہوں گے''۔

''اور ابوالہول''؟

''اوہ مولانا ابوالہول! ان سے ایک قہوہ خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔بڑے دلچسپ آدمی ہیں، بہت دیر تک مصر اور ہندوستان کی پرانی تہذیبوں سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔۔۔''

اب مصری سیاح کے چونکنے کی باری تھی۔''لیکن مرزا صاحب، اہرامِ مصر تو مینار ہیں اور ابوالہول ایک بت کا نام ہے جس کا چہرہ کا اور دھڑ شیر کا ہے''۔

مرزا صاحب نے ذرہ بھر بھی نہ جھینپتے ہوئے جواب دیا ''۔دیکھیے صاحب جب ہم مصر گئے تھے تب تو اہرامِ مصر کا شمار رئیسوں میں ہوتا تھا اور ابوالہول مولانا کہلاتے تھے ،اب اگر گردش زمانہ سے وہ میناروں اور بت میں تبدیل ہو گئے ہوں تو ہم کہہ نہیں سکتے''۔

مصری سیاح نے غالب کا مصرع زیرِ لب دہرایا

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اے حمید

قصہ پہلے درویش کا

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی

اچھے عیسے ہو کہ مریضوں کا خیال اچھا ہے!
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر عش عش کر اٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگا، پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا:

''بھائیو! اس غلام کمترین کی داستان بڑی الم ناک ہے، اس قدر الم ناک کہ رسالہ ''شام سویرا'' کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لیے چھاپنے سے انکار کر دیا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستان غریب حمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی دور ہمارے ارد گرد پھیلا ہوا ہے میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر میری خوب آؤ بھگت ہوئی اور جاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرطِ محبت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا اور جب میرا چہرہ چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرطِ

عقیدت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹ لیں اور ان میں سے ہوٹلوں کے بل نکال کر لے گیا۔ ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔قریب آ کر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑ دی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگا۔ میں نے پوچھا:

''بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟''

اس پر وہ مرد بدلگام لیکن خوش کلام یوں بولا:

''وہی جو غمزہ اور شتر غمزہ ہوتا ہے''۔

میں دماغ ہی دماغ میں اس آدمی کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ باہر آ کر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے

ایکا یکی ایک تانگہ میری قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اڑ گئے۔اس لیے کہ اس کی پچھلے سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا حاجیوں والا زرد رومال سر پر باندھے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل۔۔۔۔۔یہ میں کون سے شہر میں آ گیا ہوں۔

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی طرف چل دیا۔ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے۔قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا:

''اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں''!

اتنا سن کر میں چپکے سے ایک طرف کھسک گیا، کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار سے میں گزر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں، چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لیے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوراں کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

''یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے''

''نوٹ: کھانا کھانے کے لیے پچھلی گلی میں تشریف لائیں''۔

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دوکان کی پیشانی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا:

''یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹیاں بکتی ہیں''

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آ گیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا، کچھ دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آمی دوسرے سے کہنے لگا:

''میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا''۔

دوسرے آدمی نے بڑی لاپرواہی سے کہا:

''دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے''۔

اس پر آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹوں اٹھائیں اور انہیں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا۔ دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کم سن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا:

''اب جان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں، مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں''۔ اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کانپتے ہوئے کہا:

''بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا''۔

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا اور کہا:

''اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجئے۔۔۔ مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے''۔

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں بھائیوں کی دکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میں ششدر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر ابل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا اور وہ پلڑوں میں پڑا لے انہیں تول رہا تھا۔ فوارے کے داہنی جانب میں

نے سبز گھاس پر ایک بڑے ہی معصوم صورت گڈے اور بڑے ہی پیارے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہی ہنس رہا تھا ۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا:

''ہیلو بے بی! سویٹ بے بی! او ہیلو کڈی بسکٹ کھاؤ گے''؟

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیے۔ نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

''مسٹر مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو''۔

اے اللہ کے درویشوں! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا۔۔

کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں

میں خود ''لایا'' نہیں ''آیا'' گیا ہوں

میرے حواس ابھی ٹھکانے پر آئے نہیں تھے۔ میں انہیں ٹھکانے پر لانے کے لیے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو ان صاحب سے ذرا دو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

''کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے''؟

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ موصول ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے

ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری، میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نظر سے گھورنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میرے پنچ کے پاؤں تلے زمین نکل گئی، کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لیے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا، لیکن یہاں آ کر بھی عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا، اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی، پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لیے چالان ہو رہا تھا کہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا:

''داتا کے دربار چلیئے گا جناب''؟

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

''سرکار پلک جھپکتے میں پہنچا دوں گا، پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے''۔

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا:

''جھوٹ بکتا ہے، میں صرف ایک ہارس پاور ہوں''۔

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ گھومتے پھرتے شہر کی چار دیواری میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے۔۔

اک ماجرا سناتا ہوں حسن و عشق کا
"لے لی" کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا
بعدِ فنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا
کیا ؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے
وے منڈیا سیالکوٹیا!

پہلے قوال اٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انہوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا۔

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیے ستمگر تیرے لیئے

اس پہلے ہی مصرعے میں لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ دیے۔ درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے جمع کر کے لے گئے میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے اور آگے چل پڑا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تا کہ میرے حواس باطینیہ حواس خمسہ سے لطف اندوز ہوں!"

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور

پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کا سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا:

''بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خاش حال لوگ دستر خوان پر کھانا چن کر مہانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی امید میں، میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پر اسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر ایک نے پستول باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا:

''ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو''۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ انہوں نے اسی دوران میں طرح طرح کے کھانے آرڈر کر دیے اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے مینجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے مینجر نے مجھے حوالہ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کیے پانچ روپے حوالات کے داروغہ کو دیے، پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں راتوں کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوشِ جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے بٹوے میں ڈالی، بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار و قطار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھا دیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا:

''براہ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیں اور اگر آپ ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہئے کہ چائے ایش ٹرے میں لائے''۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے اور بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہ کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ دو ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گذر گئے

من کا پنچھی بول اٹھا ہے

بول سجن تیری جیب میں کیا ہے؟

جیب میں کیا ہے؟

میری جیب کی بات نہ پوچھو

ہائے کوئی پیسہ نہیں ۔۔۔۔۔۔

اب میرے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا۔ مصری شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس والوں نے روک لیا۔۔۔

’’کون ہو تم‘‘؟

میں نے کہا:

’’پہلا درویش!‘‘

میرا اتنا ہی جواب سن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں ایک رات بھر کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔

رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔

’’نیکی کر دریا میں ڈال‘‘۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دم نکل آئی ہے۔ میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا کہیں گانا ہو رہا تھا۔

’’میری گٹھری کولاگا چور

مسافر جاگ ذرا۔۔۔۔۔

اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکیے میں آ کر دم لیا ہے، انشاءاللہ اسی جگہ دم دوں گا''۔

یہ قصہ سن کر دو درویش ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا:

''بھائی! خدا کے لیے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے۔ میں نیا نیا اخبار کا ایڈیٹر ہوا ہوں''۔

ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصے کا!

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

پطرس بخاری

سینما کا عشق

''سینما کا عشق'' عنوان تو عجب ہوس خیز ہے، لیکن افسوس اس مضمون سے آپ کی تمام تو قعات مجروح ہوں گی ۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں ۔

اس آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں ۔ میں تو سینما کے معاملہ میں اوائل عمر ہی میں بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں، لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینم گویا میری ایک دکھتی رگ بن گیا ہے ۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں، بعض دردانگیز واقعات کی یادتازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے ۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے ۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں ۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں، لیکن خدا شاہد ہے ان کی دوستی سے جو ہمیں نقصان پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضہ قدرت سے بھی باہر ہوں گے ۔

جب سینما کا ارادہ ہو ۔ ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری یہ ہوتی ہے کہ پہلے سے تیار رہیں اور

اپنی تمام مصروفیات کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے میں ہرج واقع نہ ہو،لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے:

ارے بھئی چلے گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟اور پھر کبھی ہم نے تم سے ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو''؟

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانہ سا ہو گیا، کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان میں کہتا ہوں:

''بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ٹھیک ہے نا''؟

میری یہ بات عام پر ٹال دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

''کیوں بھئی، سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا''؟

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔۔۔''بھئی یہ ہمیں معلوم نہیں''۔

''میرا خیال ہے چھ بجے ہی شروع ہوتا ہے''۔

''اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں''۔

''نہیں مجھے یقین ہے، چھ بجے شروع ہوتا ہے''۔

''تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو''؟

اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

''ارے بھئی چلو''۔

''چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے''؟

''اور تم کر کیا رہے ہو''!

''پان کے لیے ذرا تمبا کو لے رہا تھا''۔

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں، پھر آگے نکل جاتا ہوں، پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتار سے ہوں، لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ، بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں، کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ ''یہ دروازہ بند کر دو جی''! یا اللہ اب کہاں جاؤں۔ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا، ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار سے پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے، وہاں سمجھتا ہوں کہ خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاندا اس ٹخنوں کو ٹکر خواتین کے گھٹنوں کے دامن سے بچا، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں، وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں۔۔۔ ''میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو خوامخواہ میں ہم کو رسوا کروا دیا نا! گدھا کہیں کا!'' اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ

والی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

ان تماشے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سا ہے اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے، سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے، اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کر دیتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے ہٹاتے نہیں، بلکہ بازو کو ویسے خمیدہ رکھے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے دستے کے بیچ سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کرسی کی نشست کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہوں۔ چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں، غرضیکہ یہ دل لگی یونہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں تو اب فلم کیسے دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے ''یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم دیکھنے دو''۔

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور قتلِ عمد خودکشی زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں، دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا بہر حال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن کمبخت اس دل کا کیا کروں اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہی سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع وفرمانبردار۔اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں۔خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز جانتے ہیں اتنے ہی میری بیوی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے، انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں، لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب کو ہی لیجئے۔گو کہ محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر فائز ہیں لیکن شکل وصورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔جوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں، جیب کترے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ہماری اہلیہ کی یہ

کیفیت ہے کہ محلّہ کا کوئی بد معاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب، مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے، ہمارے گھر میں ''موئے کبوتر باز'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کمبخت مرزا کو اپنے کبھی پاس پھٹکنے نہ دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے۔ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے دروازہ کھٹکھٹایا کہنے لگے اندر آ جاؤ، ہم نے کہا نہیں، آتے تم باہر آؤ، خیر آخر اندر آ گیا، بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے کہنے لگے بیٹھ جاؤ، ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر کار بیٹھ گئے معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے مرزا بولے، کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا کچھ نہیں، کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے، پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو پھر سوچا مذاق سمجھے گا اس لیے ڈھنگ سے بات شروع

کرو، لیکن سمجھ نہیں آیا کہ پہلے کیا کہے۔ آخر ہم نے کہا:

''مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں''؟

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے کبوتروں کو ایک ایک کرکے گنوانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل فشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے اس دن تو ہم یونہی چلے آئے، لیکن ابھی کھٹ پھٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے سوچا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے، اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس بات کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن ہم صبح صبح نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا

جانے کس پر اسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے "توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔۔" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا، لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی، جب سے ہماری شادی ہوئی روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی سے کہا کہ میں انکار نہیں کرسکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا!

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کر دیے یعنی اب بے شک دوست آئیں گے، بے شک اودھم مچے گا، میں بے شک کھاؤں گا، بے شک جب چاہوں اٹھوں، بے شک تھیٹر جاؤں، میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی"۔

ساتھ اسٹیشن گیا۔ جب گاڑی میں سوار کر چکا تو کہنے لگی خط ضرور لکھتے رہیے"۔

میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی"!

"کھانا وقت پر کھالیا کیجیے اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں"۔

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ،میرا دل بھی بے تاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا،ایک اخبار خرید اتہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا ،اب جہاں چاہوں جاؤں ، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں ۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جائے تو گو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں ۔لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں ، کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی ۔ بھاگتا ہوا سٹیشن سے باہر نکلا۔آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا، سگریٹ سلگایا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا ،تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا، باہر ہی سے نوکر کو آواز دی:

’’امجد!‘‘

’’حضور!‘‘

’’دیکھ حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے‘‘۔

"بہت اچھا"۔

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے"۔

"بہت اچھا حضور!"

اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے مار کر باہر نکال دو"۔

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہو تو سنسان، آدمی کا نام نشان تک نہیں، سب کمرے دیکھ ڈالے، بلئیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا اس سے پوچھا:

"کیوں بے آج کوئی نہیں آیا"؟

کہنے لگا، "حضور آپ جانتے ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے"؟

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہیں سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا، دیکھ کر بہت حیران ہوئے، میں نے سب حال بیان کیا، کہنے لگے "تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو، تھوڑا سا کام رہ گیا ہے بس ابھی بھگتا کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا کیا پروگرام ہے"؟

میں نے کہا۔ "تھیٹر!"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا

اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی، جمائی پر جمائی حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں، لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا، اے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا، سارا دن میرا ضائع کر دیا''۔

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیہ پر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا، اور کہنے لگا، ''حضور حجام آیا ہے''۔

ہم نے کہا یہیں بلا لاؤ''۔ یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا ہے کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا دل میں آیا کہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور

سوداٸیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سردئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا، باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا، گھر سونا سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا، لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بےتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے، لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بےقرار ہوتا گیا۔

آخر رہا نہ گیا، باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں، تم فوراً آجاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہو۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھی اور دل پر جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک لو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی سب یار لوگ وہی جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا کہ حقے میں ذرا سا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا جو بھی کھیل کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے، قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت اور سنجیدگی کے ساتھ، لیکن ایک

دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کیے یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا آدھ مذاحیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے، لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے، دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور، سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا۔ "پھر جو آج چور بنا اس کی شامت آجائے گی" دوسرے نے کہا اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے، سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے"۔

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے"۔ "کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے"۔ دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوکدار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے"۔ سب نے کہا کیا دماغ پایا ہے حضور نے، کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے، ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل

کسی اور کی باری آجائے گی''۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی، ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقع الٹا تو روشن آرا۔

دم خشک ہوگیا، بدن پر لرزہ سا طاری ہوگیا، زبان بند ہوگئی، سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرو کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی ۔۔۔۔ لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں جہاں تک میں ہوں مجھ سے بہتر میں دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے، لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کردیا اس لیے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی مختصر باتیں کیا کروں گا۔

''خط یہ ہے؟''

''جی ہاں!''

''دے جاؤ، چلے جاؤ

''بھاگ جاؤ''

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا، آپ دیکھیے تو سہی

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

شفیق الرحمٰن

تزکِ نادری عرف سیاحت نامہ ہند

رقم زدہ: اعلیٰ حضرت جناب نادرشاہ سابق شہنشاہ، سابق ابنِ شمشیر، سابق مرحوم ومغفور وغیرہ وغیرہ

پیش لفظ ،عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحت ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگر چہ ہم مقامی مورخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے، تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرادیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانبدار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے، دراصل ہمیں اپنی دورافتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی حملے کا خیال ہمیں راستے

میں آیا۔ تخت طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا، عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوادیں، اور قتلِ عام؟ قتلِ عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑی ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمال ما با صورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا، اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والیِ کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والیِ کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پروپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا، ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے تھے۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں

شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے، کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی، بمشکل ہمیں باہر نکالا گیا، بڑے پشیمان ہوئے، تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند الو دکھائی دیے۔ یہاں کا الو ایرانی الو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ الوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہولیا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا کر لیتا اور رات بھر ہاؤ مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا گستاخی کرتا ہے، اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جانثار معروض ہو کہ فال نیک ہے۔ الو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے، ہم اس کے جواب پر خوش ہوء اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو الو شناش کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحت ہند کا ارادہ

کابلی فوج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حال تھی جنھوں نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت

بخشی۔ اب ماشاءاللہ نادشاہی حکم، نادری قہر نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ویسے کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع فرما دیا۔

شہباز خاں الوشناس ہر روز ملک ہندوستاں کی خبریں سناتا کہ کابل میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار، پتنگ، بھنگ، چرس اور دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو الوشناس بھی چست ہو گیا، اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلادی جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی انہیں دیکھا تھا اور نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر، چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا یہ بے کار وقت کیوں نہ سیاحت ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:۔

براہِ افغانستان: خیبر ایجنسی پشاور لاہور پانی پت

براہِ بلوچستان: سمہ سٹہ ٹھنڈہ دلی

ہم پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدین شہر فصیل تک بلکہ درہ خیبر تک چھوڑتے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے۔ والیے کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحت ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا، لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے، یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پروپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر ہم اہل ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس آئیں تب اس کا جانا موزوں ہوگا، وہ پھر روتا تھا۔ اسے ازراہ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درہ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درے میں پرند چرند، انسان بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی خداوند باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار پشاور سے کچھ درے آ کر سعادت آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا، کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دوسو مہر طلائی نذر اور ایک مرصع گھوڑا بطور پیش کش گذارنا، ہم نے بھی ازراہ مروت ایک دنبہ عنایت کر ڈالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا، پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندرگان درگاہ تو بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔

ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے، نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے، کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز کسی نے ہمیں بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا، کچھ اور چیز تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے ارادہ کرر ہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بایزید ابن یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہ تلطف اسے گلے لگایا اور پیار بھینچا، وہ بے ہوش ہو گیا،۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے، لخلخہ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفو چکر ہو گیا۔ ہم نے اہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں بجوا دیں مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

و لعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے عجیب وغریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں، نہایت پر شوکت فیل جسم جانور تھا۔ دو دانت تھے جو صرف دکھانے کے لے ہیں۔ ناک جس جو سونڈ کہا جاتا ہے، زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصہ کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی۔ ڈرائیور علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری کرنے سے انکار کر دیا۔

لطیفہ

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کہ گدی کی پیش کش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسان کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی سے نذر کرتے ہیں۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر لکھ دیتا ہے، جنھیں تعویز کہتے ہیں۔ ان تعویزوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سر پرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اڑائی ہے۔

لیکن جب الوشناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لے کر آیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے، ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے، اگر پہلے پتا ہوتا تو سیدھے ہند آ کر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا، لیکن الوشناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالت ہمیشہ کچھ ایسے ویسے رہتے ہیں اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاءاللہ العزیز!

اختر شماری

کل رات اختر شماری کی، دوسو پچاس تارے گنے ہوں گے کہ نیند آ گئی، باقی بشرطِ زندگی کل گنیں گے۔

شتر غمزے

مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے، محفوظ ہوئے کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی اور اس ملک میں عام ہے۔

ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعدار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں، لیکن الوشناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آ کر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہرگز نہ تھا۔ الوشناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا، لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ الوشناس چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ہندی سپاہی تھا۔ الوشناس کے کہنے پر ہم نے اس کو پانچ سے طلائی مہریں دیں، ابھی ایک گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل

گئے۔ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں ایک نہایت مفید رسم ہے جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، لیکن مقصد ایک ہے۔۔۔۔اسے یہاں رشوت کہتے ہیں۔کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو میں سنور جائیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔رشوت دینے والے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے اس کی کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ہم واپس ایران جا کر اس رسم کو ضرور جاری کریں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لیں تھیں، باقی کوتوال کو دیں۔جس نے اپنا حصہ رکھ کر بقیہ رقم قلعدار کے حوالے کی۔قلعدار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیئے۔واقعی یہ ملک عجوبہ روزگار ہے!

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوتا شجر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار، مبارک نفس، متوکل اور گوشہ نشین ہیں۔گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں، فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تارک الدنیا بنا جائے پھر شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں۔پنجاب سے وادی کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے۔دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں جنھیں سینہ

بسینہ رکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدیدِ عہدِ شباب تھی۔

ہمارا سنجیدہ ہونا

گلستان بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پر حاضر ہوا۔ ملتجی ہوا کہ چلیے مشتاقان دید راہ دیکھ رہے ہیں، تربوزوں کا موسم بھی ہے ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر اولو شناس کو حسبِ معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے، بیکانیر لق و دق صحرا ہے جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی، فوراً ایلچی کو بلوکر الٹا لٹکوا دیا، جب بکا واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا گیا۔ اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا سوچا کہ اہلِ ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے۔ اس نے یہ فہرست پیش کی۔

۱ اہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آورانِ ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔

۲ ہندی گویے ترانوں کو "نادرنا دھیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

۳ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

۴ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

۵ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصہ ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کیا جائے۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی کوشش کی، جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد

شاہدرے کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں، چال ڈھال سب لڑکوں سی تھی، نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیقات کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نے نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے، گھمسان کا رن پڑا، گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا۔ اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کترا تی گزر جاتی، گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار

فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروز پور۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ الوشناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصدقت صول کیا۔

شام کو الوشناس کچھ اور منصب داروں کا لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے، کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سیکڑی اور پچاسویں تک پہنچ گئی، یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے، لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے، مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درہ خیبر سے آتے ہیں انہیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں ٹھہر نہیں سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے، ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے، سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو، معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو

پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا، ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ایں ایلچی بے معنی مے ناب اولی۔کسی طبلچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اس بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔آدمی باذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے اسے بلوالیا۔بولا یا شہنشاہ! سنا ہے آپ تبدیلیء آب وہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں، جہاں تک آب وہوا کا تعلق ہے، اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے، اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفرخرچ قبول فرما کر ہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ الوشناس نے شبہ کرا دیا کہ اہل ہند پر ہم اپنا محبوب مشغلہ استعمال کر رہے ہیں۔یہ رقم ہمیں تحفتہً پیش کی جا رہی ہے۔شام کو ہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔عجب ڈھمل یقین لوگ ہیں۔الوشناس نے اصل وجہ بتائی جب درباری مذکورہ دلی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں، بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا

۔اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو! ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو۔

ہم نے سوچا کہ ابھی اتنی دور آ گئے ہیں تو دلی دیکھ کر جائیں گے ۔کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو گئی ۔ہم نے کہلوا بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے ۔اس پیغام پر باقیماندہ فوج بھی بھاگ نکلی ۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نزول اقبال دہلی کے باہر ہوا ۔قطب صاحبکی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے ۔یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے ،لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا ۔پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔فرمانبردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے ،لیکن تجویز کو تکمیل نہ پہنچ سکے ۔بصد وقت اوپر تشریف لے گئے ۔واقعی بہت اونچا مینار ہے ۔آسمان یہاں سے کافی قریب ہے سستانے کے بعد تشریف لائے ۔

حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا ،مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا ،دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے ۔ہم نے پوچھا ’’ابے حملہ کیسا‘‘؟ ایلچی نے عرض لیا ۔۔’’خداوندِ نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے

حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں، اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو مایوسی ہوگی، کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا تھا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درہ خیبر سے آنے والے''۔۔۔۔''بس بس ! آگے ہمیں پتہ ہے''۔۔ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا، لیکن لڑائی کا لطف نہیں آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے ۔ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔گھوڑے سے اتر کر بغلگیر ہوئے ،اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلہ میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگان درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سیا حاں ہے،حمام گئے ،الحمد اللہ کہ آج پورے ایک سال بعد غسل فرمایا۔صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خورد نوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیضیاب کرتے ، ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا ۔ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھائی تھی ۔اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباس شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ

جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادا معلوم ہوتا تھا، لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں ہیں ہمیں گائیڈ کی محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پا کر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومتِ ہند نے امتناع شراب کے احکامات جاری کر دیے تھے لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تخت، طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا" معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو ازحد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو چشمِ ما روشن ما شاد۔ آپ اسے بخوشی لے جا سکتے ہیں"

ایسے خلوص و محبت سے کسی کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازم ایران ہوئے تو تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کرکے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔۔۔ دلی کو اپنی ذات بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تاکہ اہلِ دلی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس دن کے لئے گھڑیاں گن رہے ہیں۔۔۔"

"کیوں گھڑیاں گن رہے ہیں، کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان

سمجھتے ہیں''؟ ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

''جی نہیں آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں''۔۔۔وہ بولا۔

''ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں جن کے متعلق کوئی استاد ذوق شعر کہیں گے'' ہم نے فرمایا۔

''یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، برس ٹھہریے بلکہ ایران کا دارالخلافہ دلی کو بنوا لیجئے''۔

''دیکھا جائے گا۔۔۔''ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

وہ گلقند والا قصہ

بات کچھ نہ تھی، مغلئی دستر خوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوہ کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرمابردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دلی دور است

اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلی دور تھی، جب لاہور پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ

کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است، اچھا بھئی چلو دلی دور است، بس!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلے سے رہتی کہ کانوں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے، ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ہی ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کے اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں، لیکن بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات بے حد زہین ہیں، ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا، دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کیا اور غرارہ دریافت کیا، تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے، لہذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے، رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور متغزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے، لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ **ملک** کے کچھ حصوں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا۔۔۔اب **ملک** کا بیشتر حصہ خودمختار ہو چکا ہے ۔جتنے صوبے اور ریاستیں خودمختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔**ملک** کے ریاستوں میں بٹتے ہی ریاستہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بے کار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آ دھمکتے ہیں۔پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا،چنبل،اور مالودہ کے علاقے لے کر ٹلے۔خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی،لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر،میدان جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے،ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے،کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے،ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہئے،انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعہ میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں،دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیاء بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ہماری طبیعت حاضر تھی۔محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔اس نے ٹالنا چاہا۔ہم نے اسے بتایا

کی ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دن سمندرِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں سوائے بادشاہِ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہِ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا مان گیا۔ ہمارا فرزند علی قلی خاں بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے، اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں، نہ نگاہیں نیچی ہیں نہ دوپٹہ کا خیال ہے، دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا۔ ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا، ہمیں گھیر لیا گیا، ہمارے دستخط لیے گئے۔ ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا، ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خریدیں، پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی ''قلی! قلی!!'' کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

''تم قلی ہو۔۔۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔بالکل۔۔۔''علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا ہو گئے تھے،مگر اس کی حس مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محفوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔''آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں''؟

''کوئی خاص کام نہیں''۔علی قلی نے جواب دیا۔

''مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے''وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

''میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرالوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔خدا حافظ!میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں''۔علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے،باز پرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا اس کے منہ سے نکل گیا،چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرادی ہیں۔پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

''نامعقول!ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا۔۔۔''ہم نے گرج کر کہا۔

''کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر۔۔۔''

''ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں۔۔۔اس نے عدم تشدد انہ انداز سے کہا کہ

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھیں، چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔۔ فرمانبردار کو وقت پر سوجھتی نہیں) عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا، وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے ایگری کلچر سنا ہوگا وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مصر ہوئے تو کہنے لگے کہ آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجئے، ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرہ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینس متوجہ ہی نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسہ میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا چلو بھر پانی لیئے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکامِ شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ الو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے البتہ ہم ازحد محفوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا، سوچا کہ اس

معاملے کو فوراً ختم کیا جائے چنانچہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا ''ابا جان! معاف فرمایئے۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے''۔

ہمیں سخت غصہ آیا یہ نئی پود ہمیں سکھائے گی، یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔

''ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔ جب سے دلی آیا ہے ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے۔۔۔ کیا ہے تیرے منہ میں۔۔۔''؟

''پان کھا رہا ہوں۔۔۔ کسی نے دیا تھا۔۔'' وہ بولا۔

''یہ کسی کون ہے؟ وہی عرس والی لڑکی تو نہیں۔۔۔؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے۔۔۔'' ہم نے فرمایا۔

''ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو خوشنما تِل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے''۔

''مصیبت تو یہ ہے کہ آج کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں''

''اب جان محبت بری چیز ہے'' وہ سرد آہ کھینچ کر بولا

''تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے''۔

''اب جان! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے۔۔۔۔۔ اس سے۔۔۔۔۔''۔

''خبردار گستاخی کرتا ہے، جانتا نہیں تو نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے''۔

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ۔۔۔"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے سمجھا؟"

سمجھ گیا۔۔۔ اب جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے"؟

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے؟

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحب حضوری حقہ بردار معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا ج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسب توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند میں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں، ہم حیران ہوئے کہ ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی:

۱۔ درہ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے۔ وہاں سے دلی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم والشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے پڑے ہیں، سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے، غار ہائے الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے تا کہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑ نیکا ہفتہ بڑے زور وشور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تا کہ لوگوں کو حملہ آوروں کا نام آسانی یاد رہ سکیں اور تاریخِ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنوانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہی، مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں، جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے وغیرہ وغیرہ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں، لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خوامخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں، ہم کبھی نہیں پچھتاتے حالانکہ ہم کسی زمانے میں

بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں، کیا یاد کرے گا، لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے بزرگ کی شان کے شایاں ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والد بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی ''شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں، ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔''

ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں''۔ علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

''تمہارے کنبے کے متعلق امی پوچھ رہی تھیں تم مغل ہو''؟

''مغل وغیرہ کا تو پتہ نہیں، ویسے ہم ابن شمشیر ابن شمشیر ہوتے ہیں۔۔۔۔'' علی قلی بولا

''بہر حال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے۔۔۔''

''چال تو میں ابھی دکھا دیتا ہوں۔۔۔'' علی قلی نے بھولپن سے کہا۔۔۔۔

''رہ گیا چال چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہاں دیکھ لینا''۔

''ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں، وہ کہتی

ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا کرے گا، یا یوں ہو کہ اب جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کو ریاست الاٹ کرا دیں"۔

"تجویز تو یہ بھی اچھی ہے۔۔۔" وہ نا خلف بولا۔۔۔ لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کروں گی"۔

"تم اس کی فکر نہ کرو، ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے"۔

علی قلی بگڑنے لگا۔۔۔"تم پرسوں شام کو کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں"؟

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے تمھارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے"۔

ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی، یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں، سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے، علی قلی لڑکی سے شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کی سانس سے مے رنگین کی بو آتی ہے جسے وہ الائچی یا پون سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی آستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب

لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں، خصوصاً چند گھونٹ بادۂ رنگین چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بوٹا شجرپوری کا نسخہ نکالا جو انھوں محبت اتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں کام پر بھیج دیا جاتا، پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی علی الصبح اسے دکھائی گئی۔ سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصل شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دلی کا رخ ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک دنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوٹا شجرپوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے انشاء اللہ تعالٰی

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سید برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع واقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر ''اصلی شہنشاہی بادشاہ گران مملکتِ ہند'' لکھا تھا۔ اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انہیں بلا کا چست و چالاک و چارسو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے، محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ

گرد رکار ہیں۔وہ ملتمس ہوا کہ ان ہی کے دم سے تو دلی میں رونق ہے واللہ انہیں چھوڑ جائیے ،گدا گر البتہ حاضر ہیں''۔

''وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں۔۔۔۔''ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شوروغل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آرہا ہے،آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ سازخاں سے ملتی ہے،یہ زمانہ سازخاں ہی تھا۔ہمیں پہچان گیا،معانقہ کیا،معلوم ہوا کہ **ملک** بڑے لیڈروں میں سے ہے۔خدا کی شان کہ یہی زمانہ خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا،آج اس شان وشوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھے تو رشک کریں۔شام کو ہم نے اسے مدعو کرکے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں لامرقع رہی ہے۔**ملک** اور قوم کی خدمت کرکے اس رتبے کو پہنچا ہے۔شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہوگیا۔ہمارے استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آکر بکریوں کی اون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی،پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہوگیا۔ایک روز شومئی قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کرلیا گیا۔صاحب پوسٹر سے جیل میں تعارف ہو۔رہائی کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا(جو خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھی)کہ لاٹھی چارج

کی مہیب صدا کانوں میں پڑی، گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر اپنے تئیں کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا، رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتشبازی سے استقبال کیا شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا، لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے لاکھ درجے بہتر تھا۔ چنانچہ ہر مہینے یہی تماشا ہوتا رہا۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی، اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا، کتابوں کی تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔ خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے، پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بری نہیں ہے زمانہ ساز خاں معروض ہو کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوا ہے کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں"۔ ہم نے فرمایا کہ علی قلی خان روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے، لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے، ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصہ لینا

ان دنوں الیکشن زوروں پر تھی۔ الوشناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں۔ انشااللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاگروں سے مشورہ لینا بے کار تھا، کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی ہے، لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار نے حسب معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں، جب ہم نے اس کو برا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہردلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرکثیر تحفتاً بٹھایا گیا، تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا، چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا، دو مال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زدو کوب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی، حقہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی، لوگوں کو تحفے اور زرِنقد دیا، رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہردلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو ازحد پشیمان ہوئے، افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوشی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پرواہ

کرتے ہیں اور محفوظ ہوتے ہے

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دلی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

الوشناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائے۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائیش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔، وہ بولا لال قلعہ میں تو ہم رہتے ہیں، آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجئے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا، ہم لوگ تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباواجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں جنھیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ انداز میں کہا، یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً اتر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا، لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی تھی۔ الوشناس بھاگا بھاگا آیا، بولا محمد شاہ خزانے میں ہے اور زرد و جواہرات اِدھر اُدھر چھپا رہا ہے ہم فوراً موقع پر پہنچ گئے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے

اس نے ایک وزنی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی ۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہذا ہم دونوں نے اپنی پگڑیاں بدلیں گے ۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہوا ۔

ہندی وزارے شکر رنجی

الوشناس اور محمد شاہ کے وزرای کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزراء کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی تھی ۔ الوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی ۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کی میل ہے لہذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے ۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے، بولا اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوائی جائے ۔ ہم مان گئے، ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی، ہم نے دستخط شروع کیے ۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابن شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے، دستخط مختصر ہونے چاہیئے، عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں اس نے شکستہ حروف میں محض ''ایم ایس رنگیلا'' لکھا ۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا معروض ہوا کہ محاسب اعلیٰ کے اعراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے ۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا ۔ محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہئے، پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو

آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اسی دفتری کاروائی سے طبیعت بدمزہ ہوگئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

''ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے''؟ ہم نے پوچھا۔

''وزیرستان سے''! وہ بولا۔

اور یہ وزیر آباد کیا ہے''؟

''یہ یونہی ہے''۔

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خاں جاگیردار کی شادی پر گئے، دولہا کی عجب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہیں، پھر زدوکوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا، سوچا کہ ان بن ہوگئی ہے، لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہیں ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولہا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں، کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں، لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آگئے، جب دولہا نے ''قبول کیا'' کہا بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر ''پھنس گیا'' کا نعرہ لگایا اور غائب ہوگئے ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا، لیکن ہم خواتین سے دور رہتے۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور رکھتے، ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دوران گفتگو ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اف، اوئی، اللہ، توبہ، ہائے، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس بہو کے قصیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر جھنجلا اٹھتے، بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے، چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسنے دیے کہ اگر نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا، پھر فائیل منگا کر وہ تمام کانفیڈ خطوط دکھائے جو ہندی امرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا (ہماری حملہ آوری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی)

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے، لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انہیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں، جنوب کے بھولے سے بھی نہیں نوازتے، ہم نے چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے اس لیے معذوری ظہر کی۔ انہوں نے التجا کی شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تا کہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اتروا تے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، یہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے۔ خاتون موصوف کا گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا دربار میں اس نے ''بے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی'' والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑانے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا، لیکن پھر الوشناس کے سمجھانے پر سنبھل گیا۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں، بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی

ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہوگئیں۔ لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی آنی جانی ہیں

ایک روز ہم چڑ گئے، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے۔۔

ساٹھویں سال میں قدم آیا
زلف مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی !!
غمزہ و نازو دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے، دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے، لیکن قطعی رائے قایم نہ کرسکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل وصورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آکر اسے دُرے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی درانی ہے، چنانچہ اسے معاف کیا اور الوشناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بدرستہ معروض ہوا کہ روئے پرنور پر وہ پر ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہمارے تسلی نہ ہوئی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند

ہے لہذا خاتون موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دور دور رہنے لگے۔ خاتون مذکورہ ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر، رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت!

جامعہ فرقانی

آج صبح فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے۔ آستانِ بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے، بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلبا کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے، کورس پورا کرے تو علامہ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابو البرکات، ابو الفضل، ابو الفضیلت عموماً سرکاری حکاموں، جامعہ کے معلمین کے دوتوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابو البرکات ہے اور تین مرتبہ ابو الفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامہ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے

منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی۔ شادی کرتے وقت شکل وصورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل وصورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی لڑکے دلہن کے علاوہ ایک جہیز کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی تبھی اس ملک میں بے چاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خوامخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار۔ پہلے ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:

''حضرات! کیا روزِ سعید جامعہ کی زندگی میں آیا کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذاتِ والا صفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں۔

آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارہ کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب خاں صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبیہ مبارک سے ظاہر

ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں، شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل۔۔۔ خیر جانے دیجیے۔

ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے، کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں اور ہم آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں لیکن ہماری شامتِ اعمال معاف کیجیے۔۔۔ اچھا تو حضرات۔۔۔ مولانا نادر شاہ صاحب"

ہم کو اس بدتمیز ملا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولانا، ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے، اچھا اسے سمجھیں گے۔ ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا:

"پیارے اطفال، معلمین، حضرات و پرنسپل ملا الف اللہ! آپ نے ہمیں یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم سب کو آپ کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اول تو ہمیں آپ حضرات کی زبوصحت پر تعجب ہوتا ہے، رونا بھی آتا ہے، ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں، بخدا ہمیں ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گذار رہا تھا، دوسری طرف کپڑے کو جھٹکے سے نیچے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی

ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا کر رہے ہیں، زندگی پر احسان کر رہے ہیں، آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیے بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیئے:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے

حضرات و اطفال! ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اتار دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا انہیں زدوکوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ کیا کہ ان سے کشتہ لڑیں گے، لیکن یہاں کی آب ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے، یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہو۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے کیا فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں

گے، ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر، آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا، کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے اور تو اور آپ نے خاندان غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے، آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے، یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے، یہ آب وہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا، وہ لوگ خوب سر دھنتے ہیں اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں، گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے، پھر ایک شخص کو دیکھا گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا۔ ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض و غضب آیا چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے، غالباً رات راگ نے غمگین کر دیا، رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگل کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیوں سے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔۔۔"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی ملا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی۔ ہم دیر تک بولتے رہے، ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا، اچانک چند بدتمیز طلباء کہ جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

ملا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا:

"نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ کو ان کا مناسب جواب دیں گے۔۔۔"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ایک کونے میں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ "کیا آپ کو ملوکیت پسند ہے"؟ پوچھا گیا۔

"ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں۔۔۔" ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے۔۔۔" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا۔ "ہم خود شہنشاہ ہیں"۔

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں۔۔۔ خصوصاً جب ہم سب ایک جیسے ہیں"۔ ایک اور برخوردار بولے۔

''ہاں!'' ہم نے فرمایا ''جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں، لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے''۔

''صاف صاف بتایئے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب ۔۔۔''

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیئے) جواب دیا۔''ہم شہباز خاں الوشناس کی بائیں جانب ہیں اور ملا فرقان اللہ کے دائیں جانب ۔۔۔''

''کیا آپ ایران سے آئے ہیں ۔۔۔''؟

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے ۔۔''ہاں ہاں برخوردار! اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو''؟

''شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا''؟ ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھایا تھا، لیکن اس سوال نے ہمیں تیخ پا کر دیا تھا۔ ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا، میز پر ہمارا مکہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ ملا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

نوازنا ملا فرقان اللہ کو

ہمیں ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی ملا کی شرارت ہے، پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی بھنی تقریر کروانا پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالات کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ ملائی کا ڈھونگ

ہے، خوب عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام دیا جائے ۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خورد ونوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے ۔ ہم نے دوبارہ دربار میں عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا ۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرمان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفر کردار کو پہنچا ۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا ۔

اہل ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت مول لے لی ۔ دنیا میں سچ بولنا جرم ہے، ذرا سی تنقید لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی ۔۔۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں ۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی ۔ گذشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں چنانچہ طبیعت کچھ گراں تھی ۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے، اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ افواہ اڑا دی کہ نعوذباللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں ۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں ۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں الوشناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا، فقیر سمجھ کر جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا، ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تا کہ بوقت ضرورت آ سکیں، مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشور دیا کہ ہم انہیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔اس سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے۔ان پر آوازیں کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ایسی اور کئی واردات کی اطلاع ملی، ہم اسپ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تا کہ رعایا کو شرف دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کر سکیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں، یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے ''نادر شاہ مردہ باد'' کے نعرے سنائے دیئے، اسی وقت غیض وغضب میں تختِ طاؤس سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کرو یہ تھا وہ قتلِ عام۔۔۔ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کر سکتے تھے۔گرمی سخت تھی ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہل شہر کو زدو کوب کیا تھا اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوۓ۔۔۔'' کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی''۔۔۔

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع ۔۔۔ ”مگر کہ زندہ کنی خلق را وبازکشی ۔۔۔ سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انہوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی، سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہے تھے، گرمی زیادہ تھی ہمارا دل پسیج گیا۔ بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چمپت ہوئے، خیر، اب تلوار میان میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا، ہم نے فوراً منادی کرادی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہوا ہے، بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار تو میان میں سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص بھی کروائیں جو امراء کے لیے ہو، پھر سوچا اہلِ دلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں، تیمور کا قتلِ عام تین دن رات تک ہوتا رہا تھا، بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے

شام کو وہی بزرگ آئے، ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے، ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے، مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطف انہیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا، وہ فوراً بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئیں تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے،

پتہ نہیں کیوں، شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاءاللہ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے۔ مچھلیاں تھیں کہ جلال شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا، اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے، لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا، ہمارا دم گھٹنے لگا، گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انہوں نے داعئ اجل لبیک کہہ کر سعادت دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہئے۔

واپسی کا قصد

ایک کباڑے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے فرمانبردار خاں کی کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کی کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کے باوجود نہ پہن سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہتے ہیں۔ دلی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خراٹے لیتے ہیں، صبح کی چائے

اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اترتے، قیلولے کی عادت قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے، ہماری رنگت سنولاتی جارہی ہے، اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے۔ تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں، کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی، لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آباو آجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر مل میں عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ ہماری تقریر اور قتلِ عام سے پبلک ہماری دشمن بن گئی ہے ہر روز بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ سیٹل ہونے کے خیالات پر لعنت بھیجی اور کوچ کرنے کا مصمم ارادہ کیا

ہمارا دلی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے ازراہ مروت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہیں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپ نمرود پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آرہے ہیں۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ

چڑھالیا۔تعزیزی طور پر اہل ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والئ کابل سے نجات

والئ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائے ورنہ مروت بعید ہوگا۔ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جنھیں ہم مرتے دم تک جدا نہیں کر سکتے۔البتہ کچھ پوستینیں، دنبے یا گلقند درکار ہوتو وہ دے سکتے ہیں۔والئ کابل راضی نہ ہوتا تھا، عجب ہونق آدمی ہے دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔بہتیرا سمجھایا کہ آدمی خدا سے لو لگانی چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔شیخ بوناشجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیا داری سے مستثنےٰ ہو کر تارک دنیا بنے ہوئے ہیں اس پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ گستاخانہ بولا۔آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں بن جاتے۔بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں، وقت آنے پر تارک الدنیا بن کر دکھائے گیں۔جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا۔آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب ہند گیا تو کرکری ہوگی۔کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔آخر ازراہ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈے، دو نبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز فرمایا اور اس حریص لیمونچوڑ سے رہائی پائی۔

ختم شد

تتمہ

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی ۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے ۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیت ایزدی ہرگز نہ تھی ، اگر ہم فرمابردار خاں کا کہا مان لیتے اور راتی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا ، خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔۔۔

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھئے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور ، ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں

ابراھیم جلیس

دماغ چاٹنے والے

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے، مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں جن کے باروں رہ رپ مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی یا کاش اب ان سے میری رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی''۔۔۔۔ یہ جملہ تو بالکل رسمی ہے۔اس کے معنی و مفہوم اور اس کی اہمیت پر غور کیے بغیر خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس جملے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور اس لیے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔۔۔۔ ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں کہ اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بیحد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں کی صاحبان۔۔۔ میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل نہ پہلی بار خوشی ہوئی تھی اور نہ اب ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے معاف کیجئے اور خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیئے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کر سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شائد میں ایسا نہیں کہہ سکتا میں لا کھ کوشش کروں تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا، کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرات ہی نہیں

،جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک (پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر) کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی۔۔۔۔

اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرات رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے، لیکن چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تن آسان بھی ہوں۔ اس لیے مجھ میں اخلاقی جرات پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

مگر از راہِ انصاف آپ فرمایے کہ سید شاہ ضیاالحسن سے مل کر کسی صیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟

مجھے اپنے دوست محمد ریاض خان پر بے حد غصہ آتا ہے کہ جس نے سید شاہ ضیاالحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن متعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاالحسن سے کسی شخص کا تعارف ہوگا۔ وہ دن اس کے لیے۔یقیناً ایک منحوس دن ہوگا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ سید ضیا الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگتا ہوں وہ اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے، مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے شکست مان کر مجبوراً دانت کھول کر مسکرانا پڑتا ہے اور پھر میں پوچھتا ہوں۔۔۔

''اوہ! سید شاہ ضیاالحسن صاحب۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں''؟ اب پھر کچھ نہ کریں پوچھئے۔ سید شاہ ضیا الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے تو گھنٹوں چلتی رہتی ہے۔

رکنے کا نام ہی نہیں لیتی ہے۔ آپ بیٹھیے اور اپنے صبر وضبط کا امتحان دیتے رہئے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہوگی۔ سید شاہ ضیاالحسن کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ وہ دو دو تین تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کرسکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں تو۔ یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوگی جبھی تو لوگ اپنے رحم جگر کو دیکھنے کی بجائے ہمہ تن گوش بڑے انہماک اس کی باتیں سنتے رہے ہیں۔ سید شاہ ضیاالحسن کبھی جاننے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ ہیں۔ وہ اس کی کبھی پرواہ نہیں کرے گا کہ آپ کو بخار ہے اور دردِسر ہے یا اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کررہے ہیں، اسے تو بس یہ خوش فہمی کہ وہ بڑا دلچسپ اور باتونی یا ایک اچھا مجلسی آدمی ہے۔ اسی لیے وہ باتیں شروع کردیتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں ہر موضوع کی باتیں کردیتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں ہر موضوع کی باتیں، ایران کی باتیں تو ران کی باتیں، مہمل باتیں، بیکار باتیں، ضیاالحسن باتیں ہی باتیں کرتا رہتا ہے، مگر! نزدیک سے بغور دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ باتیں کررہا ہے بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ انسان کے حلق میں زبان اس لیے جڑ دی گئی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں، مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاالحسن جب کبھی ملتا ہے تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ ”نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ بس ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے دو ایک منٹ باتیں کرتا چلوں“۔

اب سنئے اس کی دو ایک منٹ باتیں ۔۔۔

ارے بھئی ۔۔۔ کچھ سنا تم نے ۔۔۔ ابھی ابھی ایک بڑا افسوسناک واقعہ ہوا ۔وہ موہن لال ہے نا ۔۔۔ چلتی موٹر سے گر پڑا ۔ بے چارہ کو سخت چوٹ آئی''۔

میں پوچھتا ہوں ۔۔۔

''کون موہن لال ۔۔''؟

وہ حیرت سے کہتا ہے ۔۔۔ ارے موہن لال کو نہیں جانتے ۔ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے تم کبھی اس سے ملے ہی نہیں ۔موہن لال بے چاری ایک بڑا پیارا دوست ہے ۔ڈپٹی دیا نرائن کا بھانجا، بڑا دلچسپ ہنس مکھ ۔۔۔ بالکل ڈپٹی دیا نرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل ۔۔۔ ہے ہے ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے ۔ابھی ابھی پچھلی جولائے میں وہ سورگباش ہوئے ہیں ۔۔۔ بڑی حسرت ناک موت تھی ۔۔۔ ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا وہ بے چارہ قمر الدین بھی تو مر گیا ۔اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی ۔قمر الدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے ہوں گے بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے ۔

ارے ہاں بھئی ۔تمہارے چھوٹے کا مزاج اب کیسا ہے؟ کون سے ڈاکٹر کا علاج کروا رہے ہو ۔آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ہی نہیں ۔سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں ۔اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کالج پڑھانے والے بھی ڈاکٹر ہیں ۔اس پر ایک بات یاد آ گئی ۔وہ جو ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے ۔بڑا خودار آدمی تھا ۔میں نے اپنی زندگی میں صرف دو خودار آدمی دیکھے ہیں ایک تو ڈاکٹر

فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ ،تم نے محمد قاسم طلبہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہو گا کہ ایک بار انہوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ۔۔۔

''اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے''

محمد قاسم خودار آدمی تھا۔ اس نے ویسے دکان میں ہی بیٹھے بیٹھے کہا۔۔

''غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو'' ۔۔۔یہ ہے خوداری۔۔۔تجارت کرتا ہے۔ آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا ذیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت۔۔۔ارے بھائی جلیس، اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اماں یار بیٹھو۔۔۔کہاں جا رہے ہو، بیٹھو بھئی بیٹھو۔

مگر میں نے جواب دیا کہ مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے، معاف کرنا ضیا الحسن محمد قاسم طبلچی کی داستان خوداری پوری طرح سن نہ سکا، مگر کیا کروں مجبور ہوں، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ان صاحب سے ملنا ضروری ہے، اور اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہو گی، اچھا پھر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔

اس کے بعد میں وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنا ہے، مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا ان کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں ڈپٹی دیا نرائن آنجہانی یا چھوٹے بچوں والے مرحوم قمر الدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات

اور خودار طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔موہن لال جسے میں جانتا تک نہیں ،بھیا گر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں؟ ڈپٹی دیا نرائن بڑے خوش بڑے مذاق اور زندہ دل آدمی تھے ،تو وہ ہوں گے ۔قمر الدین کی موت بڑی حسرت ناک تھی بھی اس کی موت میں میرا کیا دخل؟۔۔۔ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفیٰ دے دیا ،تو میرا کیا فائدہ۔محمد قاسم طبلہ والے اگر خودار ہیں تو ہوا کریں مجھے تو ان سے طبلہ درست نہیں کرانا ہے۔

مجھے صرف اکیلے ضیاالحسن سے شکایت نہیں بلکہ ضیاالحسن کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے ،میرا روئے سخن ضیاءالحسن کے سگے یا رشتے کے بھائیوں کی طرف نہیں بلکہ میری ضیاءالحسن کے پیشے کے بھائیوں یعنی ضیاءالحسن کی طرح دماغ چاٹو لوگوں سے ہے۔دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید شاہ ضیاءالحسن کے ایک اہم پیشہ بھائی ابو الفضل صاحب ہیں ۔یہ ابوالفضل صاحب کسی ضلع کی ایک تحصیل کے پیش کار ہیں۔اپنی کسی نہ کسی کاروائی کے سلسلے میں ہر اٹھوارے پندھواڑے شہر آتے رہتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملنے آتے ہیں تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں:

''میاں کب آئے''؟

''میں جواب دیتا ہوں''جی میں تو عرصے سے یہاں رہتا ہوں۔میں تو پانچ سال سے کسی چھوٹے سفر پر نہیں گیا''۔

وہ فرماتے ہیں۔۔۔''اوہ،شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں''۔میں

کہتا ہوں۔۔۔"جی میرا تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں"۔ وہ مصر ہو جاتے ہیں ۔۔"ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بمبئی میں"؟

اب میں ان سے کس طرح بحث کروں۔ اس لیے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں"۔ اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔۔۔ جی وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر بن گئے ہیں۔ (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں) وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں۔۔"ہاں میں نے کہا تھا نا۔۔۔ اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں۔۔۔"جی تو چاہتا ہے کہہ دوں جھک مار رہا ہوں۔ مگر چونکہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لیے جواب دے دیتا ہوں۔ "ماجی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں" فرماتے ہیں "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا۔ آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے"؟ ایسے سوال کے بعد اپنا اور ان کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے، مگر انسان ایک بندہ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے پیش کار ہیں، مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے بھی ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو ادھر کیے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے تک برابر میرا دماغ چاٹتے رہتے ہیں، مگر پرسوں میں نے انہیں بڑا چکمہ دیا۔ وہ شہر آئے تھے، اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پکارا۔

"میاں۔ ارے ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو بات تو سنو"۔

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کیے اور نام پلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادر طریقت ہمارے پڑوسی بزرگ بھی محکمہ مالگزاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں۔ انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی۔ اسی لیے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گزارتے ہیں۔ روزانہ رات کو کھانے کے بعد آجاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔۔۔۔

"سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے"؟

میں کوئی حافظ اخبار تو نہیں ہوں اس لیے عملاً اخبار ان کی طرف بڑھا دیتا ہوں مگر وہ اخبار جوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں، اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تو سناؤ۔ اسٹالن ہندوستان پر کب ہلا بولنے والا ہے"؟

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ نہ تو اسٹالن کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا موختہ پڑھوں۔ آپ پینشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہئے۔ میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا فالتو ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے۔ حضرت مجھے سونے دیجئے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے واللہ ناجائز فائدہ تو نہ اٹھایئے۔

ضیاء الحسن صاحب کے چوتھے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں ہرفن مولا کہتے ہیں مگر انہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ بہت

اچھے شاعر، بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصور، بہت اچھے گویے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ بُلبل ترنگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں، مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے مرض" میں گرفتار ہیں۔ جب کبھی میں انہیں نظر آ جاتا ہوں تو بس پکڑ کر زبردستی موٹر میں بیٹھا کر سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چائے سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر پہلا سگریٹ ہی جلاتا ہوں کہ وہ اپنی تازہ نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ واہ کہنے لگتا ہوں۔ پندرہ بیس تازہ معلومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں۔ رومانوی افسانے، سیاسی افسانے تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔

دہ بج گئے، اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیرِ بحث آ جاتی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کھچے مقالے تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے لیجئے۔ اب پانچ بج گئے، شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ نثرِ نظم کے بے وزنی پروگراموں کے لیے موزوں ہوتا ہے اس لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے ٹیبل ٹاک ہوتی ہے۔ نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور سناٹ طاری ہو جاتا ہے، مگر اس پر بھی مصوری کے شہکار دکھانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ نخلستان ہے، یہ نسیم جونیئر کی تصویر ہے"۔

''یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔جس کا چہرہ پر عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے''۔

''میری یہ تیندوے کی تصویر ہے ۔۔۔۔۔اب کے سال بمبئی کی آرٹ اگزبیشن میں بیچی جانے والی ہے''۔

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے ۔دہ بجے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا، پھر رات کے پانچ بج گئے۔اب بلبل ترنگ پر بھرویں بجانے لگے۔یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب میں کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ایک مسجد سے موذن کی اذان گونجی۔

فرمایا۔۔۔''ارے دیکھا تم نے آرٹسٹ کو گردش شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی ۔۔۔اچھا، ارے تمہاری تو آنکھیں لال ہو رہی ہیں اب تم سو جاؤ۔میں ذرا شفق کا نظارہ کروں۔۔۔''

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟۔۔۔مگر شائد میں سو نہیں سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں، کیونکہ میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا آرٹسٹ نے سارے کا سار چاٹ لیا ہے۔اب مجھے کیا کرنا چاہئیے!

اب مجھے یہ کرنا چاہیئے کہ جب بھی دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں تا کہ میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردش شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو۔ظاہر بات کہ جب سارا دماغ چاٹ جائے گا تو پھر گردش شام و سحر کی خبر ہی نہ ہوگی۔

ضیاء الحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں، بہت بچپن

سے میرے ساتھ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے بابا کی کپڑے کی دکان بیٹھ گئے، پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی اے پاس کرلیا۔اس کا رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا۔وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے:۔

بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑے کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کروں''؟

''کیا چھوٹے لڑکے کو گرجا کے سکول بھیج دوں؟ یا اپنے ہی سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں''؟

''کیا راج پھوڑے کا اپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں''؟

''کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی ٹھکوا دوں''؟

''کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں''؟

غرضیکہ رام کش جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لیے کوئی نہ کوئی صلاح مشورہ کرنے ضرور آتے ہیں اور محض اس لیے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیاءالحسن نے، پیشکار بزرگ نے، آرٹسٹ نے اور خود آپ ہی نے چاٹ ڈالا ہے ۔اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہیئے۔

اس لیے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔خدا حافظ!

کرشن چندر

لیڈر کرسی

اسمٰعیل بھائی لوندے والا کا نیلام گھر محمد علی گھر روڈ اور بھنڈی بازار کے قریب پوسٹ آفس کے سامنے واقع تھا۔ کل اتوار ہونے کی وجہ سے نیلام گھر ہر طرح اور عمر کا فرنیچر جمع تھا۔ اسمٰعیل بھائی لوندے والا آدھی رات کے قریب نیلام گھر کو تالا لگا کر چلا گیا، لیکن جلدی میں اندر کی بتی بجھانا بھول گیا۔ سو کینڈل پاور کے بلب کی تیز روشنی میں بھلا فرنیچر کو کیسے نیند آتی ہے، چنانچہ گھڑیال کے مشورے پر رات بتانے کے لیے سب اپنی اپنی آپ بیتیاں سنانا منظور کرلیا۔ کتابوں کا ریک جب اپنی کہانی سنا چکا تو کرسی نے کہا۔ اب میری کہانی سنئے۔۔۔

لیڈر کی کرسی بہت پرانی تھی۔ اس کی تین ٹانگیں تو ٹھیک تھیں، لیکن چوتھی ٹانگ بڑی بھدی اور بدشکل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اصلی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد کسی اجڈ بڑھئی نے جلدی جلدی سے لگا دی ہے۔ پشت پر چمڑا لگا ہوا تھا۔ جو متواتر استعمال سے گھس گیا تھا اور اس کی سطح پر متواتر رگڑ سے لیڈر کی پیٹھ کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ نشان اتنا بڑا تھا کہ اتنے بڑا تھا اس پر ہماری قومی آزادی کی جدوجہد کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی تھی۔ کرسی کی سیٹ پر نیلی مخمل کی روئی دار گدی جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی، اور اس میں سے پھوسڑے نکل کر باہر جھانک رہے تھے۔ کرسی کا پالش بہت پرانا تھا، اور کئی رنگ کا تھا، کہیں سے سیاہ، کہیں سے بھورا، اور جو چوتھی ٹانگ تھی وہ

ہلکے بادامی رنگ کی تھی۔ اس کرسی کو دیکھ کر بہت سے فرنیچر جو ایک ہی ساخت، ایک ہی رنگ اور ایک ہی لکڑی کے تھے، زور زور سے ہنس پڑے پڑے۔

کرسی نے خفا ہو کر کہا۔ "میری بری شکل پر مت ہنسو کبھی میں بھی تمہاری طرح جوان تھی اور خوبصورت تھی، استبدادِ زمانہ نے میرا یہ حال کر دیا ہے، مگر زمانے نے کب کسی کا سدا ساتھ دیا ہے۔ ہر فرنیچر جو پیدا ہوتا ہے۔ ایک روز بوڑھا ہوتا ہے، اور سڑ جاتا ہے، یہی اس زمانے کا ور ہے"۔۔۔۔

"سچ ہے۔۔۔۔۔ سچ ہے۔۔۔" ایک بوڑھا پلنگ کھانس کر بولا:

"خیر اب تم میرا قصہ سنو۔۔۔" کرسی ایک آہ بھر کر بولی۔۔۔ "میں بھی زندگی کے بہت سے تجربے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ میں شہر ہیم پور کی کرسی ہوں۔ ہمارے شہر کی آبادی سات لاکھ سے اوپر ہے۔ آدھی آبادی مرہٹوں کی ہے۔ آدھی یو پی والوں کی۔ یہ مدھیہ اتر پردیش کی راج دھانی ہے، لیکن یہاں پر ایک بھی کارخانہ نہیں۔۔۔ ہاں پاگل خانے گیارہ ہیں"۔

"ایسا کیوں ہے؟" ایک لیمپ شیڈ نے پوچھا۔۔۔ "جب بھی سرکار یہاں کوئی کارخانہ لگانے کا سوچتی ہے۔ مراہٹے کہتے ہیں کہ کارخانہ ہماری آبادی والے حصے میں کھلنا چاہیئے۔ یو پی والے کہتے ہیں نہیں ہماری آبادی والے حصے میں کھلنا چاہیئے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے سرکار نے ہیم پور میں شکر فیکٹری کھولنے کی منظوری دے دی۔ یہ منظوری بڑی مشکلوں سے حاصل کی گئی تھی اور مرکزی سرکار سے بہت لڑ جھگڑ کر حاصل کی گئی تھی، لیکن جب اسے عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو شہر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یو پی والے کہتے تھے، چونکہ گنا یو پی کے دیہاتوں سے آتا ہے

۔اس لیے فیکٹری ان کے علاقوں میں کھلنی چاہیئے ۔مراہٹے کہتے تھے چونکہ کا رخانے میں کام کرنے والوں مراہٹے ہوں گے ۔اس لیے یہ فیکٹری ان کے شہری علاقے میں کھلنی چاہیئے ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں دو پارٹیاں ہوگئیں ۔دونوں پارٹیاں الگ الگ جلسے کر نے لگیں ۔جلوس نکلنے لگیں ۔شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی ۔سب دکانیں بند، اسکول، کالج دفتر سب بند ہو گئے، بجلی گھر کے ملازمین نے بھی ہڑتال کر دی اور جب شہر میں بجلی نہ رہی تو جلوسوں میں بجلی کہاں سے آتی ؟اور مائیکروفون، لاؤڈ سپیکر کہاں سے کام کرتے؟ چنانچہ اچھے تقریر کرنے والوں کے دم اکھڑنے لگے، مگر چونکہ شہر میں ہڑتال تھی اور لوگوں کے پاس کوئی کام نہ تھا۔اس لیے ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے جلوسوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔اس لیے ڈھنڈیا پڑی جو مائیکروفون کے بغیر ہی تقریر کرسکیں ۔ایسی ایک ضرورت نے زمانہ حال کا وہ لیڈر پیدا کی، جس کی میں کرسی ہوں"۔

کرسی یہاں تک کہہ کر ایک لمحے کے لیے رکی، پھر اس نے داستاں جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"انہی دنوں کی بات ہے ہمارے شہر ہیم پور کے تیلیوں کے محلے میں بھیکو نام کا ایک شیر فروش رہتا تھا، جس کا کام پہلے تو بہت نہ چلتا تھا لیکن جب سے سرکار نے دودھ کے بجائے پانی میں چونا، میدہ کھریا مٹی، سفید لکڑی کا برادہ، غرض کہ پانی میں کوئی بھی سفید چیز ڈال کر اسے دودھ کے نام سے بیچنے کی اجازت دی تھی، بھیکو کا کام خوب چل نکلا تھا۔یوں بھیکو بہت شریف آدمی تھا۔اسے صرف اپنے کام

سے غرض تھی اور دوسروں کی بے ایمانی سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے بھیکو کو بہت تکلیف پہنچی، جب اس کو بڑا لڑکا گوبند آٹھویں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ اور اس نے دودھ بیچنے سے انکار کر دیا۔ میں آٹھویں فیل ہو کر دودھ بیچوں، یہ قطعی ناممکن ہے۔ گوبند نے صاف انکار کر دیا، اور جب بھیکو نے غصے میں آ کر اپنے بیٹے کو پیٹنا چاہا تو گوبند لاٹھی لے کر کھڑا ہو گیا۔ گوبند اچھ فٹ اونچے قد کا تھا۔ اس کے بڑے نتھنے پھولے ہوئے تھے، اور رخسار اندکو دھنسے ہوئے تھے جس سے اس کے جبڑے اور بھی مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں سیاہ چمکیلی اور چھوٹی چھوٹی تھیں، لیکن ان آنکھوں کے اوپر اس کی بھنویں بڑی بڑی، سیاہ اور گھنے بالوں والی تھیں، جنھوں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا ماتھا تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔ اور ہونٹ لمبے اور بڑے بڑے تھے۔ اس کے منہ کا دہانہ بہت بڑا تھا، لیکن ان سب سے بڑی اس کی آواز تھی، وہ جب بھی بولتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویو کسی نے اس کے حلق کے اندر لاؤڈ سپیکر لگا دیا ہے۔ پڑھنے میں اس کا جی مطلق نہ تھا۔ وہ سات بار آٹھویں میں فیل ہو چکا تھا اور آٹھویں بار فیل ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بھیکو نے اسے اسکول سے ہٹلیا، اور اسے کے دودھ بیچنے سے انکار پر اسے اپنے دوست جمن بیڑی فروش کی بیڑیاں بیچنے پر لگا دیا۔ جمن بیڑی فروش کی "اصلی بنارسی تمباکو والی نمبر ون بیڑی" جس کا تمباکو پرانی سڑی گھاس، ڈھاک کے پتوں اور گولر کی شاخوں کو کوٹ کوٹ کر انہیں تمباکو کی مہک دے کر تیار کیا گیا تھا۔۔ ان دنوں شہر میں بہت بکتی تھی جمن فروش نے گوبندے کو دہ روپے روز پر ملازم رکھ لیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ دو چار لونڈے اپنے ساتھ لے

کر اور ایک ٹھیلا لے کر وہ شہر کے گلی گلی کوچوں میں چلا جاتا، اور کھڑا ہو کر اپنی گرجدار بلند آواز میں میاں جمن کی "اصلی بناری تمباکو والی نمبرون بیڑی" کی تعریفیں کرتا اور لوگوں کو اسے استعمال کرنے پر آمادہ کرتا۔ گوبندے کو بھی یہ کام پسند آیا۔ ایک تو اسے اپنی آواز استعمال کرنے کا اچھا موقع مل گیا، پھر اس کے سر پر جو پھندے دار ٹوپی ہوتی اور ہاتھ میں جو گھڑیال ہوتا، اور پیچھے جو آٹھ دس لڑکوں کا کالا ؤلشکر ہوتا۔ وہ سب اسے بے حد پسند تھا، اور گویا وہ اس کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ ادھر بھیکو دودھ فروش [illegible] بھی بہت خوش ہوا کہ چلو اس کا ٹھکانہ سے کام پر لگ گیا۔

ایک دن جب وہ اتفاق سے چیلا پتی لین کے ناکے پر کھڑا ہوا اپنی گونجتی آواز میں بیڑیاں بیچ رہا تھا۔ ادھر سے یوپی والوں کا یک جلوس نکلا جو "شوگر فیکٹری ہماری ہے"۔ کے نعرے لگاتا ہوا بڑا گھوڑا میدان جلسہ کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ جلوس کے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

"شوگر فیکٹری ہماری ہے!"

اور گوبندا چلا رہا تھا۔ "بیڑی نمبرون ہماری ہے"

مگر سارے جلوس پر گوبندے کی آواز بھاری تھی۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب جلوس آگے بڑھ گیا تو گوبندے نے کیا دیکھا کہ دو آدمی جواہر جیکٹ اور دھوتی پہنے ہوئے آپس میں اس کی طرف دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے ہیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آدمی اس کے قریب آئے اور کہنے لگے۔۔۔ "یہ

کیا بیڑی بیچنے کا کام کرتے ہو؟ کوئی اچھا دریش سیوا سیوا کا کام کرو۔۔''

''بیڑی بیچنے میں مجھے دو روپے روز ملتے ہیں۔ دیش سیوز کے کام میں مجھے کیا ملے گا؟'' گوبندے نے فوراً پوچھا۔

''وہاں تمہیں پانچ روپے روز ملیں گے''۔

''تو مجھے دیش سیوا منظور ہے!''

ان دونوں آدمیوں نے گوبندے سے ہاتھ ملایا۔ اس کی پیٹھ تھپکی۔

پھر گوبندے نے پوچھا۔۔ ''مگر یہ تو آپ کو بتایا ہی نہیں کہ کام کیا ہوگا''؟

ایک آدمی نے جس کو جواہر جیکٹ دوسرے سے زیادہ خوش نما تھی۔ اپنی جیب کو تھپتپاتے ہوئے کہا:

''آج رات کو تمہیں بڑا گھوڑا ایک میدان میں ایک تقریر کرنا ہوگی؟''

''بیڑی نمبر ون کی حمایت میں''؟ گوبندے نے پوچھا:

''نہیں شوگر فیکٹری یو پی والوں کی ہے۔۔۔'' اس بات کی حمایت ہیں''۔

''مگر مجھے تقریر کرنی نہیں آتی''۔

''وہ تم رہنے دو۔ وہاں تمہیں کیا بولنا ہے، وہ سب ہم تم کو بتا دیں گے۔ ہمیں فقط تمہاری آواز چاہیئے''۔

اور یہ بات تھی بھی سچ۔۔۔ بجلی نہ ہونے سے مائیکروفون نہ ملتے تھے اور مجمع آہستہ بولنے والوں مقرروں کی تقریروں سے بور ہو جاتا ہوں۔ اس لحاظ سے گوبندے کی گرجتی گونجتی پاٹ دار آواز بہت کامیاب رہی، اور پھر گوبندے کو خود اپنی آواز بہت پسند تھی۔ وہ اسے سنتا ہی چلا گیا۔ اس لیے جو کچھ ان دونوں آدمیوں

نے اسے پڑھایا تھا وہ اس سے کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ دو ایک لطیفے اس نے اپنے پاس سے جڑ دیے، جو بہت کامیاب رہے۔ غرض کہ اس دن اس کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔ خوش نما جواہر جیکٹ والے آدمی نے جس کا نام اسے بعد میں معلوم ہوا کہ کالی چرن ورما ہے اور وہ شہر کا میونسپل کمشنر ہے، اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور اس سے کہا۔

''آج سے تو لیڈر ہو گیا گو بندے''

گو بندا خوش ہو کر بولا

''سرکار سنتا ہوں ہر لیڈر کے پاس ایک کرسی ہوتی ہے، میرے گھر میں تو ایک کرسی بھی نہیں ہے''۔

تب کالی چرن ورما نے اسی دن مجھے گپتا فرنیچر مارٹ سے خریدا اور میں اسی روز گو بندے کے گھر پہنچا دی گئی۔ گو بند مجھ پر پہلی بار بیٹھ کر بہت خوش ہوا، اور اپنے باپ، ماں اور بھائی بہنوں کے سامنے بیٹھ کر لات پر لات رکھ کر شیخی بگھارنے لگا۔

''پانچ ہزار آدمی کا مجمع تھا۔۔۔ انہوں نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے جے کارے۔۔۔ اب میں لیڈر ہو گیا ہوں باپو۔ لیڈر!''

اس کا باپ بھیکو جو ابھی بھینس کا دودھ دوہ کر آیا تھا، پریشانی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دودھ کا مٹکا پانی کے نل کے نیچے رکھ دیا اور بولا

''بیٹا لیڈری میں کیا رکھا ہے۔۔۔ دو دن کی چاندنی ہے، پھر لیڈری دھری کی

دھری رہ جائے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔۔۔لیکن ہمارا تو خاندانی دھندا سب سے اچھا ہے۔۔۔۔جس میں دودھ اور پانی ایک دفعہ مل جائیں تو پھر کبھی الگ نہیں ہوتے''۔

بھیکو دیر تک دودھ کے مٹکے میں گرتے ہوئی پانی کی دھار کو دیکھتا رہا، اور جب مٹکا لبالب بھر گیا تو اس نے پہلا مٹکا اٹھا کے اس کی جگہ دوسرا دودھ کا مٹکا رکھ دیا

گوبندے نے انکار میں سر ہلا کے کہا

''باپو، جو کام تم کرتے ہو، اس میں عزت نہیں ہے، میں ایسا کام نہ کروں گا۔ میں تو بس عزت والا کام کروں گا اور لیڈری سے بڑھ کر عزت کس بات میں ہے؟''

بھیکو چپ ہو گیا بیٹے نے بات ٹھیک کہی تھی۔

''گوبندے کی پاٹ دار آواز نے یوپی والوں کے مخالفوں کے چھکے چھڑا دیے ۔ان کے جلسوں میں لوگوں کی تعداد ہر روز بڑھتی گئی

آخر ایک روز ''شوگر فیکٹری مراہٹوں کی ہے''۔۔۔۔کی تحریک کا صدر۔۔۔ بابو ہمت راؤ پنڈھار کر رات کے دس بجے گوبندے کے گھر پہنچا۔۔۔جب گوبندا مجھ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا گھر والوں پر رعب جما رہا تھا۔۔۔ہمت راؤ پنڈھار کرنے پر پوچھا۔۔۔یہ یوپی والے تمہیں کیا دیتے ہیں''؟

''پانچ روپے ایک بھاشن کے دیتے ہیں''

''ہم دس روپے دیں گے۔ بولو ہمارے لیے کیا کام کرو گے؟''

''کروں گا کیوں نہیں؟'' گوبندا خوش ہو کر بولا۔ ''یوپی والے پانچ روپے دیتے تھے۔ اس سے پہلے اصلی بنارسی تمباکو والی بیڑی نمبرون والے صرف دو روپے دیتے ہیں۔ آپ دس روپے دیتے ہیں تو میرا سر پھیرا ہے جو آپ کا کام نہ کروں گا''۔

اس دن سے گوبندے نے ''شوگر فیکٹری مراہٹوں کی ہے'' والوں کے لیے کام کرنا شروع کیا، وہی بھاشن، وہی آواز، وہی گوبندا۔۔۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جہاں جہاں یوپی والوں کا ذکر آتا تھا وہاں اب مرہٹوں کی حمایت میں بات ہونے لگی۔ بابو ہمت راؤ پنڈھار نے گوبندے کی بڑی ہمت بندھائی۔ بھرے جلسے میں اس کا تعارف شری گوبند رام کہہ کر کرایا اور اسے۔۔۔ ''ایک انصاف پسند یوپی والے'' کے خطاب سے نوازا۔ گوبندے نہیں، گوبند رام کے کہنے پر پنڈھار کرنے پر اس کے لیے ایک میز بھی خریدی گئی جو میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میری پشت پر اعلیٰ نرم کپڑے کا غلاف چڑھایا گیا، جو آج تک آپ مجھ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اب اکثر گوبندا اکثر مجھ پر بیٹھ کر اور اپنی ٹانگیں میز پر پسار کر گھر والوں سے اپنی کامیابی کی باتیں کیا کرتا تھا، اور محلے والوں پر رعب گانٹھتا تھا۔ محلے والے بھی اس سے ڈرے ڈرے رہنے لگے تھے اور اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

گوبند رام کی لیڈری چمکنے لگی۔ پہلے یوپی والوں، پھر مرہٹوں کے لیے کام کرنے سے اس کا سارا شہر میں شہرہ ہو گیا۔ وہ ایک بار تو اس نے یہاں تک کر لیا کہ شام کو یوپی والوں کے لیے تقریر کی اور رات کو مراہٹوں کے جلسے میں جا کے بول آیا اور دونوں طرف سے پیسے وصول کیے

اور جب لوگوں نے پوچھا۔۔۔۔"یہ تم نے کیا کیا؟"

تو اس نے جواب دیا۔۔۔"بھائی شوگر فیکٹ مراہٹوں کے علاقے میں جائے یا یوپی والوں کی آبادی میں کے حصے میں کھلے، رہے گی تو ہیم پور میں!"

پنڈھار کرنے اسے زیادہ نہیں ڈانٹا۔۔۔کیونکہ اگر اب بجلی کی ہڑتال کھل گئی، اور شہر میں بجلی آ گئی، پھر جلسے کے لیے مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکر کرائے پر لینے میں پچاس ساٹھ روپے نکل جاتے ہیں اور یہاں اے عمدہ انسانی لاؤڈ سپیکر ہاتھ آ جاتا تھا

مگر پندرہ بیس روز کے بعد ہی گو بندے کی لیڈری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ہوا یہ کہ سرکار نے یوپی والوں اور مرہٹوں کی روز روز کی چپقلش سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہیم پور میں ایک سرے سے شوگر فیکٹری لگائی ہی نہ جائے۔ انہوں نے اس کام کے لیے مدراس شہر کو چن لیا، اور اسی طرح ایک اور کارخانہ ہیم پور میں کھلنے سے رہ گیا۔ ہاں اس واقعے کے بعد دو پاگل خانے اور شہر میں کھل گئے، کھلنا ہی تھا ان کو۔۔۔۔۔

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ گو بندا بے کار رہا۔ بیڑی نمبر ون اب وہ بیچ نہیں سکتا تھا، حالانکہ جمن بیڑی فروش نے اب اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے پیش نظر اسے تین روپے روز پر ملازم ہو جانے کی دعوت دے دی تھی، جسے گوبند رام نے بصد تحقیر ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانا۔۔۔۔

بولا۔۔۔"اب میں بیڑی بیچوں گا؟ کیا بات کرتے ہو تم باپو۔ میں اب کوئی بڑی شے ہی بیچوں گا۔ مجھ سے تم کوئی شوگر فیکٹری کھلوا لو، کوئی قوم بکوا لو کوئی ملک نیلام

کروالو۔۔۔مگر اب مجھ سے بیڑی نہ بیچی جائے گی''۔

اس کا باپ چپ ہو گیا، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ اس کا لڑکا پھر بے کار ہو گیا۔

آخر سوچ سوچ کر اس نے گوبندے کا بیاہ اپنی جات برادری میں کر دیا۔ روپا اس کی بہو گو بہت سندر تو نہ تھی، اور پڑھی لکھی تو بالکل نہ تھی، مگر بھینس کا دودھ دوہنے میں لاثانی تھی۔ اس لیے بھیکو نے روپا کا ناتا منظور کر لیا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ لڑکا بے کار ہے کام نہیں کرتا، مگر جب گھر میں بہو آجائے گی اور گرہستی بڑھے گی تو خود ہی کوئی کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

دن گزر گئے، مہینے گزر گئے، لیکن گوبندے کو کوئی کام نہ ملا۔ ہیم پور میں نہ کوئی کارخانہ کھلا، کوئی جھگڑا ہوا۔ اس اثنا میں میرا اچھڑا گھس گیا تھا۔ میری پشت پھٹ چکی تھی۔ گوبندا بھی پہلے سے موٹا، پہلے، پہلے سے بدمعاش پہلے سے چالاک ہو گیا تھا۔ روپا کی گود میں تین بچے کھیلتے تھے۔ وہ تو کہو بھیکو کے گھر میں برکت تھی، بلکہ پانی کی برکت تھی کہ گھر چلتا رہا، گوبندا کھا کر موٹا ہوتا رہا اور گلی محلے میں اپنی لیڈری کا خالی خولی رعب گانٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ اب تک بے کاری سے مر گیا ہوتا۔

تین سال بعد گوبندے کے دن پھرے۔ ہو یہ کہ سر پر میونسپل الیکشن آ گیا، شہر بھر میں دھڑے بازیاں اور پارٹیاں جلسے اور جلوس اور تماشے، باجے گاجے اور تقریریں پھر سے شروع ہونے لگیں۔ اب کے گوبندے نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے دھڑے بازیوں اور پارٹیوں کا غور سے مطالعہ کیا، اور مطالعہ کرنے

کے بعد وہ اس نتیجے پر جا پہنچا کہ شہر میں سسجک پارٹی کے جیتنے کے زیادہ امکان ہیں۔

سسجک پارٹی کا نام پارٹی کے عقیدے سے لیا گیا تھا۔ جو یہ تھا ''سب سے جنگ کرو!'' اس فقرے کے ہر لفظ کا پہلا حرف لے کر پارٹی کا نام سسجک رکھ دیا گیا تھا۔ گوبندے کو یہ پارٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ اس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے گوبندا اس کے جلسے میں ایک تقریر سننے گیا۔ ایک نوجوان غصے منہ لال کیے چلا رہا تھا

''لنکا والے ہم ہندوستانیوں کو شہریت نہیں دیتے۔ کیا کرنا چاہیے''؟

''جنگ کردو۔۔۔'' مجمع زور سے چلا پڑا

''جنوبی افریقہ والے ہم کو کالا سمجھ کر ہم کو بے عزت کرتے ہیں۔۔۔ بولو کیا کرنا چاہیے''؟

''جنگ کردو!'' مجمع اور بھی تیزی سے چلایا

انہی دنوں میں پاکستان کے وزیر اعظم نے ایک تقریر میں ہندوستان کا مکا دکھایا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ گوبندے کے ہاتھ میں معاملہ آ گیا۔ اس نے دوسرے دن ہی سسجک پارٹی کے بھرے جلسے میں ایک پستول داغ دیا اور ایک بے حد جوشیلی تقریر کے دوران میں کہا۔۔۔۔

''جو ہمیں مکا دکھائے گا ہم اس پستول سے اس کا سینہ چھلنی کردیں گے''

مجمع جوش میں آ گیا۔ ساری فضا میں گوبندرام زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ لوگ بے حد اشتعال میں آ کر طرح طرح کے نعرے لگانے لگے۔ گوبندرام کی

مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ جس کے پیشِ نظر سسجک پارٹی کے لیڈروں کو گوبند رام کا نام میونسپل کمشنری کے امیدواروں کی لسٹ میں شامل کرنا پڑا۔

گوبند رام اپنے حلقے سے میونسپل کمشنری کا امیدوار تو ہو گیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہوا یہ کہ اس کی تقریر کے چند روز بعد پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی۔ اس پر الزام یہ تھا کہ

۱۔ اس نے بھرے جلسے میں پستول چلایا۔

۲۔ اور پستول کا لائسنس بھی اس کے پاس نہ تھا۔

۳۔ اس نے ایسی اشتعال انگیز تقریر کی جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیاں منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

گوبن رام کو ڈھائی سال قیدِ بامشقت ہوئی۔ ادھر اس کی سسجک پارٹی بھی میونسپل الیکشن ہار گئی جس کا مقولہ تھا "۔۔۔ سب سے جنگ کرو۔۔۔" جیت دوسری پارٹی کی ہوئی جس کا مقلہ تھا۔۔۔۔ سب سے صلح کرو۔۔۔۔" یعنی سسمک پارٹی کی۔

ان ڈھائی سالوں میں میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا۔ مجھ پر وقت بے وقت دودھ کے مٹکے اور پانی کے گھڑے رکھے جانے لگے۔ کبھی کوئی چھوٹا بچہ مجھ پر بیٹھ کر پیشاب کر دیتا۔ کبھی بڈھا بھیکو اپنی میلی دھوتی سے رانیں کھجا کھجا کر میرے ڈنڈوں سے طبلے کا کام لے کر آلھا اودل گانے لگتا۔۔۔

ایک بار بچوں نے مجھے الٹا کر دیا، اور ادھر اُدھر گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ اسی طرح میں گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی۔ اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہاں

کون میری خبر گیری کرنے والا تھا۔ گوبندا تو جیل میں تھا۔ خود ہی بھیکو نے محلے کے کسی تھرڈ کلاس بڑھئی کو بلا کر مجھے ٹھوک ٹھاک کر بیٹھنے کے قابل کر دیا۔ چوتھی ٹانگ اس بڑھئی کی عطا کردہ ہے اور یہ غضب کا بادامی پالش بھی اسی کا ہے۔

خیر صاحب۔۔۔۔ڈھائی سال بھی کسی نہ کسی طرح روتے دھوتے گزر گئے اور گوبندا جیل سے چھوٹا۔ جیل میں اس کی ہیم پور کے مشہور غنڈوں سے شناسائی ہو گئی تھی۔۔۔۔اور اب وہ گوبندا نہ رہا تھا۔ اب کے جو وہ جیل سے باہر آیا تھا تو شہر کے رازدارانِ پردہ سے بخوبی واقف ہو کے لوٹا تھا اور اپنا اثر و رسوخ ان غنڈوں سے پیدا کر کے لوٹا۔

جیل سے باہر نکلنے کے بعد سچک پارٹی یعنی سب سے جنگ کرو پارٹی کے ممبروں نے اسکے گلے میں ہار پہنائے، اس کی قومی خدمت کو سراہا۔ اس کی قومی قربانیوں کی تعریف کی۔ گوبند رام نے مختصر سا اس کا شکریہ ادا کیا اور ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے گھر بیٹھ گیا۔

میونسپل الیکشن اب پھر سر پر آ رہا تھا، اور بہت سے لوگوں کو جو ٹوہ رکھتے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ گوبند رام شہر کے کن لوگوں سے متعلق ہو چکا ہے، اور کتنے ہی سینکڑوں ووٹ ان کو دلا سکتا ہے۔ گوبند رام نے ان لوگوں کا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے گھر کے آگے ایک بیٹھک بنانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ایک ٹیلی فون لگوا لیا۔ بیٹھک کو نئے ساز و سامان سے نئے فرنیچر سے سجایا گیا، مگر مجھے نہ بدلا، کمرے کی ہر چیز بدل گئی، مگر میں اس کی کرسی وہی کی وہی رہی۔

گوبند رام اکثر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا تھا

''یہ میری لیڈری کی پہلی نشانی ہے۔ میرے برے دنوں کی ساتھی ہے۔ میں اسے کبھی نہ بدلوں گا''۔

لوگوں میں سرکاری حلقوں میں، کاروباری حلقوں میں اس کا رسوخ خود بخود بڑھتا گیا۔ وہ لوگوں کے طرح کے کام کرنے لگا، اور طرح طرح کے کام ان سے لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی وہ جوشیلی ڈھب ختم ہوتی گئی اور اب وہ شہر کا ایک معزز، شریف، سنجیدہ، متین شہری سمجھا جانے لگا۔

اب کے میونسپل الیکشن میں اس نے ســـصک پارٹی کا ساتھ دیا تھا اور ان کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑا ہوا۔ ســـصک پارٹی کا مقولہ تھا۔۔۔۔ ''سب سے صلح کرو۔۔۔'' چنانچہ اس بار گوبندرام سب کے ساتھ چین جاپان، لنکا، پاکستان، افریقہ، ایران، توارن، افغانستان اور بالنجان سب کے ساتھ صلح کا حمایتی بن گیا۔ ان دنوں اس کا چہرہ ایسا بھگا بھیگا سا چکنا چپڑا سا، ایک ایسی صلح کن مسکراہٹ میں لتھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ کوئی چہرہ نہ ہو، کسی بناسپتی گھی کے ڈبے کا اشتہار ہو۔

تھوڑے دنوں میں میونسپل الیکشن کا نتیجہ آیا۔ اب کے نہ ســـجک پارٹی کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا۔ ''کصک کجک پارٹی کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا۔ ''کبھی صلح کرو کبھی جنگ کرو''۔ گوبندرام پھر ممبر ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مگر اب کے اسے اس کا زیادہ افسوس نہ ہوا۔ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ لیڈری کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ ورنہ لیڈری زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ مختلف لوگوں سے رابطے قائم کرنا چاہئیں، اور جو کوئی جو چیز مانگے اسے وہی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ صرف وہی پارٹی کامیاب ہوسکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لو

گوں کو ووٹ دیتے وقت خوش کر سکے۔ اصول بہت عمدہ اور خوش نما ہونے چاہئیں لیکن ان کے اندر کوئی نہ کوئی پیچ ایسا ہونا چاہیے، جسے ضرورت کے مطابق گھما کر فوراً بدلا جا سکے۔

بہت سوچ سوچ کے گوبندرام نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقولہ تھا ''تمھارا کس میں فائدہ ہے''؟ شہر کے بہت سے ذی ثروت اصحاب کو اپنی اسکیم سنا کے اپنے ساتھ ملا لیا، اور میونسپل الیکشن سے پہلے اس پارٹی کی بنیادوں کو مضبوط کر لیا۔ گوبندرام نے اس کا منشور پیش کرتے وقت لوگوں کے سامنے جو تقریر پیش کی، وہ اس پارٹی کی مکمل طور رہنمائی کرتی تھی۔

گوبندرام نے کہا۔۔۔

''ہماری پارٹی صرف اس بات مدِ نظر دکھے گی کہ ''تمہارا کس میں فائدہ ہے؟ انکم ٹیکس بڑھانے میں یا گھٹانے میں؟ شہر کی سڑکیں چوڑی کرنے میں یا تنگ کرنے میں؟ بجلی کا ریٹ کم کرنے میں زیادہ کرنے میں؟ ملازموں کی تنخواہیں بڑھانے میں کم کرنے میں؟ ہماری پارٹی صرف وہی کام کرے گی جس میں تمہارا فائدہ ہوگا''۔

بات معقول تھی۔ لوگوں کو جچ گئی۔ میونسپل الیکشن کے دوران میں صاف نظر آنے لگا کہ جیت اسی پارٹی کی ہوگی جس کا مقولہ تھا ''تمہارا کس میں فائدہ ہے''۔

اس پروگرام کے تحت گوبندرام نے دھوبیوں کے ریٹ بڑھانے اور صابن کے ریٹ کم کرانے کے لیے ہاں کر دی۔ نلکوں میں پانی کی مقدار بڑھانے اور پانی کا چارج کم کرانے کی سفارش کر دی۔ انہوں نے براہمنوں سے کہہ دیا کہ وہ بو

چڑ خانہ بند کر دیں گے اور چماروں سے کہہ دیا کہ انہیں چمڑا سستا اور زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے گا۔ کرایہ داروں سے کہہ دیا کہ ان کے کرائے کم کر دیے جائیں گے، اور مکان کے مالکوں سے کہہ دیا کہ مرمت کے بہانے وہ اپنے کرائے بڑھا سکیں گے۔

تھوڑے دنوں میں جب میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ ووٹ ''تمہارا کس میں فائدہ ہے'' والی پارٹی کو پڑے اور اس کے ممبر بھی سب سے زیادہ تعداد میں چنے گئے۔ اتفاق رائے سے گوبندرام کو میونسپل کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔

میونسپل کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں جب یہ سوال اٹھا: ''کہ تمہارا کس میں فائدہ ہے''؟ والے پروگرام پر کس طرح عمل کیا جائے؟۔۔۔ تو بہت دیر تک بحث ہو تی رہی۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔۔۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیسے اس پرو گرام پر عمل کیا جائے جس کی ہر شق کے خلاف جاتی ہے۔

آخر گوبندرام نے کہا۔۔۔

''میرے خیال میں یہ منشور ہی غلط ہے۔۔۔ ''تمہارا کس میں فائدہ ہے؟''

اسے بدل دینا چاہیئے اور اس کی بجائے اس پر عمل کرنا چاہیئے کہ

''اپنا کس میں فائدہ ہے؟''

چاروں طرف سے واہ واہ کا ڈونگرا برس گیا

''صدر نے کیا نکتہ پیش کیا ہے، واہ واہ گوبندرام جی۔۔۔ کیا بات پیدا کی ہے ''۔

جب سے گوبندرام جی کی پارٹی شہر ہیم پور کی سپل کمیٹی پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے

،گوبندرام اب اچاریہ گوبندرام کہلاتے ہیں۔انہوں نے اپنا محلّہ چھوڑ کر سول لائن میں رہائش اختیار کر لی ہے۔انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے جو نئے فرنیچر کی طرح اپ ٹو ڈیٹ اور خوبصورت ہے۔

مجھے پرانے گھر میں چھوڑتے وقت اچاریہ گوبندرام کو بہت دکھ ہوا،مگر ان کی نئ فیشن ایبل بیوی اس پر تیار نہ ہوئیں کہ ایسی بدہیت ،بدشکل ،ٹوٹی پھوٹی کرسی کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔

میں اس کے بعد بھی کئی سال تک پرانے گھر میں رہی۔آخر جب میرا حلیہ بالکل بگڑ گیا اور میں کسی کام کی نہ رہی تو بھیکو نے ایک دن نیلام والے کو بلایا اور اس کے ہاتھ مجھے بیچ دیا۔بیچتے وقت اس کے دل سے آہ نکلی ،اس نے آہستہ سے کہا

''یہ میرے بیٹے کی کرسی تھی''۔

''تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے؟''

''وہ میونسپل کمیٹی کا صدر ہے''۔

''صدر تو ہے،مگر کرتا کیا ہے''؟۔۔۔۔نیلام والے نے پھر پوچھا۔

''جانے کیا کرتا ہے''۔۔۔بھیکو نے جواب دیا۔

''مگر میں سوچتا ہوں وہ ابھی تک دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور نقلی تمبا کو والی بیڑی نمبرون بیچتا ہے''۔

''اس کے بعد والی داستان بڑی تلخ ہے''۔۔۔۔کرسی ایک وقفہ کے بعد بولی ۔''پہلے مجھے ایک ایسے آدمی نے خریدا جو بڑا شریف اور ایمان دار اور غریب آدمی

تھا۔۔۔لیکن مجھ پر بیٹھتے ہی وہ لاکھوں کی دولت کمانے اور بے ایمانی کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔۔

جب وہ اپنی حرکتوں کے بعد چلا گیا،۔۔۔تو مجھے ایک ایسے آدمی نے خرید لیا جو بے حد زن مرید تھا، لیکن اس گرمی نے میرے چوکھٹے پر بیٹھتے ہی اپنی بیوی کو گالیاں سنانا شروع کر دیں اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اس کی بیوی نے دیکھا کہ جب وہ اس کرسی پر بیٹھتا ہے، تبھی ایسی حرکت کرتا ہے تو اس نے اٹھا کر مجھے گھر سے باہر پھینک دیا۔

وہاں سے ایک گونگے فقیر نے مجھے اٹھا لیا۔ بدقسمتی سے وہ جونہی مجھ پر بیٹھا، اس کی زبان کھل گئی اور وہ بولنے لگا، اور بولتا ہی چلا گیا۔ اور لگاتار سات دن اور سات راتیں طوطا ہی چلا گیا۔ اور وہ سب کچھ بولتا گیا جو کبھی گوبند رام بولا کرتا تھا ۔۔۔ ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا، مگر اس کا بولنا بند نہ ہو۔ اور وہ بولتے بولتے مر گیا۔

پھر وہاں سے یہ اسماعیل بھائی لونڈے والا مجھے خرید لایا۔۔۔۔۔اب جانے میں کس کے پاس جاؤں گی۔۔مگر کہیں بھی جاؤں میری سرشت میں گوبند رام کی خصوصیات اس طرح رچ چکی ہیں کہ میں جہاں بھی جاؤں گی اس مشہور لیڈر کی کرسی ہی رہوں گی“۔

لیڈر کی کرسی اپنی داستان سنا کے چپ ہو گئی۔

محفل میں تھوڑی دیر سناٹا رہا۔

محمد خالد اختر

معلوماتی قاعدہ

ٹیڈی ازم

بچو! شاید تم جانتے نہیں یہ دنیا ہمیشہ ''ازموں'' کی بدولت آگے بڑھتی رہی ہے۔یہ ''ازم'' نہ ہوتے تو ہم شاید فتو تیلی کے کولہو کے بیل کی طرح دائرے میں چکر کاٹتے رہتے اور پہلے آدمیوں کی طرح اتنے آزاد اور قدرتی ہوتے جتنے کہ ہوا کے پرندے، 'ازم' ہمیں صحیح راستے پر لگانے کے لیے آئے۔آخر میں یہ 'ازم' اتنے زیادہ ہو گئے، اور صحیح راستے اتنے بہت کہ ہم بوکھلا گئے، بعض ازم کافی اچھے ہیں اور ان سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں۔مثلاً بدھ ازم، کنفیوشسزم، جین پال سارتر کا اگزسٹنلزم نیوڈ زم وغیرہ۔مال روڈ پر بالکل ننگے ہو کر چلنا شاید تمہیں ایک نامناسب حرکت لگے، لیکن یقین کرو یہ ایک بالکل بے ضرر چیز ہے۔اگلے روز ہم نے ریگل کے پاس ایک بالکل ننگے، میلے چھترے بالوں والے بوڑھے آدمی کو جاتے ہوئے دیکھا، گزرنے والوں میں سے کسی نے بھی اس کی طرف خاص توجہ نہ کی کہ وہ کون ہے۔دوسرے کئی ازم البتہ اتنے بے ضرر نہیں۔مثلاً نیشنلزم، پٹریا ٹزم، سوشلزم، کمیونزم۔۔۔اور نہ جانے کیا کچھ! دنیا میں اتنے سارے کہ ہم ان کے نام گنا نہیں سکتے۔ہر ایک شخص، پر کوئی نہ کوئی ازم سوار ہے۔مختلف ازموں والے

لوگ ایک دوسرے کو جنگلی، قابلِ رحم اور نیم باؤلے سمجھتے ہیں۔ ایک ازم کی دوسرے ازم پر برتری ثابت کرنے کے لیے بعض دفعہ خونخوار جنگیں بھی چھڑ جاتی ہیں جن میں لاکھوں جانوں کا نقصان ہوتا ہے

ٹیڈی ازم انگلستان اور امریکہ میں تو کافی پرانا ہو چلا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ تین چار سال سے درآمد ہوا ہے۔ ہماری یادداشت کچھ کمزور ہے۔ اس لیے یقین سے کہہ نہیں سکتے کہ یہاں کوکا کولا پہلے آیا تھا یا ٹیڈی ازم! یا دونوں ساتھ ساتھ آئے۔ ہم کوکا کولا کے قطعاً خلاف نہیں ہیں جو پینے کی اچھی چیز ہے۔ ہم خود بعض دفعہ اتنا کوکا کولا پی جاتے ہیں کہ ہمارا معدہ باقاعدہ کوکا کولا کی فیکٹری بن جاتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو نہ ہی ہم ٹیڈی ازم کے خلاف ہیں۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ ہم خود باوجود اس ادھیڑ عمر کے کسے ہوئے لباسوں میں لڑکیوں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جدید پود اصل میں یہ پہنچاننے لگی ہے کہ کولہے اور ٹانگیں جسم کا واحد قابلِ ذکر حصہ ہیں اور باقی ماندہ جس کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، پچھلی صدیوں میں انسان کے دماغ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ٹیڈی ازم نے ثابت کر دیا کہ دماغ انسان کی فزیالوجی میں ایک غیر اہم چیز ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آئیڈیل فلسفہ حیات ہے جنہیں خدا نے زیادہ دماغ نہیں دیا اور اس کے بدلے نمایاں کولہے اور سڈول رانیں عطا کی ہیں۔۔۔!

جب ٹیڈی ازم پہلے پہلے عام ہوا تو دوسرے ازموں والے ٹیڈی لوگوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے۔ اخباروں میں ٹیڈی لباس پر بہت لے دے ہوئی ہے اور بعض مقامی شرفائے کرام نے پیش گوئی کی کہ قیامت آنے والی ہے۔ اچھے پا

کبا ز ڈاڑھیوں والے لوگ کوٹھوں پر چڑھ کر اور چشمے لگا کر دجال اور اس کے گدھے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہی دنوں میں نے دجال کو ریگل سینما میں جہاں ''کم سپٹمبر'' فلم لگی تھی۔ اپنے سیاہ گدھے پر سوار داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اسنے گدھے کو دونوں سینگوں سے پکڑ کر کاروں کے پاس پارک کیا اور دو روپے دس آنے کا گیلری ٹکٹ خرید کر فلم دیکھنے جا بیٹھا۔ کسی اور نے اسے نہیں پہچانا، لیکن میں نے جالیا کہ یہی دجال ہے۔ اگرچہ اس کی وضع قطع، اس کے متعلق میرے تصور سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ یک چشم تھا اور اندھی آنکھ پر فیتے والا مونوکل پہنے تھا (زیادہ تر میں نے اسے اسی چیز سے پہچانا) اس کی چھوٹی پر وقار نوکدار ڈاڑھی تھی اور چھپکلیوں اور مینڈکوں سے چھپی ہوئی، بوشرٹ اور چودہ انچ موری کے پائنچے کی مکھن زین کی پتلون میں وہ پورا ٹیڈی تھا، بلکہ سپر ٹیڈی! اتفاق سے میں اس سے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ جب ''کم سپٹمبر'' کا ٹائٹل میوزک شروع ہوا تو میں نے اسے اپنے بوٹوں سے تال دیتے اور سر میں سیٹی بجاتے سنا۔ فلم ختم ہونے پر وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر رخصت ہو گیا، اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ اس شہر میں پھر نہیں دیکھا گیا۔ مجھے یقین ہے وہ ٹوسٹ دیکھنے اور سیکھنے آیا تھا۔

جب اتنے سارے ازم قیامت نہیں لا سکے تو ٹیڈی ازم بھی قیامت نہیں لائے گا۔ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے کہ دجال خود ٹیڈی بن گیا۔ اب اس کے ہمدم اور ہمزاد جو اس کی آمد کی ایک مدت سے دہائی دے رہے تھے۔ اب خود ٹیڈی بن چکے ہیں۔ تم جانو میں نے تمہیں کسی پچھلے سبق میں اپنے ایک خالو کے بارے میں بتایا تھا جو سردار بہادر سرکس میں شیر دل کا رنگ ماسٹر تھا۔ یہ قابلِ رشک شخص بعد

میں بڑا دیندار اور نمازی ہو گیا اور جب ایک رائل بنگال ڈاڑھی والے شیر نے (جس کا نام میرے خالو نے دلیر خاں رکھا ہوا تھا اور جس کے ساتھ اس کے تعلقات بھائیوں کے سے تھے) اس کے آدھے کان اور ایک ہاتھ کی چند انگلیوں کو کھا لیا تو میرا خالو بد دل ہو کر حج پر چلا گیا۔ وہ حج سے واپس آیا تو بالکل مختلف آدمی تھا۔ اس نے مسجع و مقطع ڈاڑھی رکھ لی اور عربی لباس میں بالکل عرب لگتا تھا۔ رنگین رسیوں والی گول ٹوپی اور سفید لہراتے ہوئے جبے میں وہ بازاروں میں گھوما کرتا تھا اور خود کو عربی الاصل ظاہر کرنے کے لیے عربی لب ولہجہ میں بات چیت کرتا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا۔ اس کا نام شجاعت خاں تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے کے نام کی رعایت سے خود کو ابوالحسنین کہلانے لگا۔ (اس کے بیٹے کا نام کریم اللہ تھا، لیکن اس نے اخبار میں اعلان کرا دیا کہ اب وہ کریم اللہ کی بجائے الحسنین ہے) یہ خالو اگلے دن پانچ سال کے عرصے کے بعد جب مجھے مال روڈ پر ملا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ جبہ اور رنگین رسیوں والی ٹوپی سب غائب تھے، اور ڈاڑھی بھی۔ وہ لیٹسٹ ٹیڈی فیشن کے نیلے سوٹ میں دس سال چھوٹ لگتا تھا۔ اس کے پتلون کے پائنچے کی موری تیرہ انچ سے زیادہ نہ ہوگی اور پتلون کولہوں کی ہڈیوں سے شروع ہو تی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی ابھی ''ٹوسٹ'' کے نئے اسٹائل کے سبق لے کر آیا ہے۔ اور اگر میرے پاس وقت ہو تو وہ مجھے نیا سٹائل دکھانا چاہے گا۔ مال روڈ کے فٹ پاتھ کو اس کام کے لیے ناموزوں خیال کرتے ہوئے میں نے مصروفیات کا بہانہ کیا (میرا خالو اب ایس خاں واپڈا اینڈ ڈبلیو۔ ڈی کنٹریکٹر ہے اور شیروں کی بجائے واٹر کلوزٹوں اور ٹرانسفارمروں کی باتیں کرتا ہے)

دراصل بچو! وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے میں عقلمندی ہے۔ میں ان لو گوں کو نہیں سمجھ سکا جو ہمیں ایک ہزار سال یا دو ہزار سال پیچھے لے جانے کے جتن کر رہے ہیں۔ وہ کیوں کرنا چاہتے اور اس سے کیا فائدہ پہنچے گا، میں کبھی نہیں سمجھ سکا اس لیے میں خود ٹیڈی ہو گیا ہوں۔ میرے کولے اور ٹانگیں اگرچہ بالکل نا قابلِ وقعت ہیں اور درزی جب میری کمر کا ناپ لیتے ہیں تو چپکے سے ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے چند ماہ پہلے میری پتلون کے پائینچے اکیس انچ ہوتے تھے اور میں نے ان کی بابت بہت مطمئن تھا، پھر یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میرے دوست مجھے رحم اور ہمدردی کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں اور اس کی وجہ میری پتلون کا گھیرا ہے۔ میں نے فوراً اپنے دوستوں کے خدشات رفع کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی سب پتلو نیں اور چند وہ بھی جو میرے بہنوئی نے عاریتاً دی تھیں تمیز دین درزی کے پاس لے گیا۔ میں نے تمیز دین سے پوچھا کہ آیا وہ پتلونوں کی موری تیرہ انچ تک تنگ کرسکتا ہے (میں جانتا تھا کہ چند ماہ بعد لوگ پندرہ سولہ انچ موری کا بھی مذاق اڑائیں گے) تمیز دین نے میری بات پر آنکھ تک نہ جھپکی اور دو روپے فی پتلون پر آمادگی ظاہر کردی۔

اب میری پتلونوں کی موری تیرہ انچ ہے، میرے دوست جن کی پتلونوں کی مو ریاں پندرہ سولہ انچ ہیں مجھ پر ہنستے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ چند ماہ تک میں ان پر ہنس سکوں گا۔ میں نے وقت سے آگے رہنے کا تہیہ کرلیا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ٹیڈی ازم سے آگے ہم کہاں جائیں گے؟ غالباً نیوڈزم کی طرف! کیا ہم گھوم پھر کر اہیں جا رہے ہیں جہاں سے ہم پانچ لاکھ سال پہلے چلے تھے۔۔۔؟!

کرسٹائن کیلر، جان پروفیومو، ڈاکٹر سٹیفن وارڈ

شیخ آف وارا ڈو فور وغیرہ

بچو! مجھے تمہیں کرسٹائن کیلر کے متعلق نہیں بتانا چاہئے، وہ ایک بڑی بری عورت ہے۔ اس طرح جان پروفیومو، ڈاکٹر سٹیفن بھی برے آدمی تھے۔ اشرف شیخ آف وارا ڈو فور اچھا آدمی تھا لیکن مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ تم کرسٹائن کیلر اور اس کے کارناموں کا حال مزے لے لے کر اپنے یہاں کے اخباروں میں پہلے ہی پڑھ لیا ہوگا اور شاید اس کہانی کی تفصیلات کو مجھ سے کہیں بہتر تم جانتے ہوں گے۔ یہ سب تنگِ اخلاق لوگ ہیں۔ ویسے یہ دوسری بات ہے کہ ہم سب کا اپنا اپنا ڈاکٹر سٹیفن وارڈ ہوتا ہے جو ہمارے اندر چھپا بیٹھا رہتا ہے۔

کرسٹائن کیلر اس کے لیے وہی کچھ ہے جو کچھ ہیلن آف ٹرائے، یا نیل کی قلو پطرہ اپنے اپنے وقتوں کے لیے تھیں۔ آٹھ سو سال قبل از مسیح پچاس ہزار یونانیوں نے ایتھن کے ساحل پر ٹرائے کی فصیل شہر کے باہر ہیلن کے لیے جان دے دی تھی اور مصر کی ملکہ قلوپطرہ کی سلگتی ہوئی محبت میں بھسم ہو کر مارک انتونی نے روما کی سلطنت گنوا دی۔ میں نہیں جانتا کہ کرسٹائن کیلر نے کس کس کی جان لی، غالباً اور شخص جو اس کی بدولت مرا بیچارہ سٹیفن وارڈ تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی شہرت خاک میں مل گئی اور جیل کی کوٹھڑی اسے سامنے دکھائی دینے لگی۔ جان پروفیومو سیاسی طور پر مرا اور اب برقع اوڑھے گھر کے اندر بیٹھنے پر مجبور ہے۔ یہ میں نہیں کہہ

سکتا کہ اسے اپنی وزارت کے چھن جانے اور سیاسی کیریئر ختم ہو جانے کا کتنا رنج ہوگا۔۔۔غالباً زیادہ نہیں!

مگر کرسٹائن کیلر نے برطانیہ کی کنزرویٹو حکومت کو ہلا کر رکھ دیا اور بالآخر ہمارے دوست ہیرلڈ میکملن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بوڑھا اور ضعیف ہو گیا ہو اور اس واقعہ سے اسے مستعفی ہونے کا بہانہ مل گیا ہو۔۔۔۔جو کچھ بھی ہو آج کل کی دنیا میں ایک خوبصورت عورت بڑی طاقتور چیز ہے۔عورت سے طاقتور صرف ایک اور چیز ہے، اور وہ ہے پریس!

تم پوچھوگے کہ پھر کیا ہوا۔ یہ شیخ آف وارڈن فورکون تھا اور اس کا کرسٹائن کیلر سے کیا تعلق تھا۔ کیا وہ مرحوم ڈاکٹر سٹیفن وارڈ کا کوئی رشتہ دار وغیرہ تھا؟۔۔۔شیخ آف وارڈوفور ایک خوش طبع نرم رہ اور ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی ہے۔اس کی بیس بیویاں ہیں اور اس کی اولاد کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا بعض کہتے ہیں کہ اس کی ستر بیٹے بیٹیاں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ دوسو، شیخ آف وارڈوفور کو خود بھی اس بارے میں کوئی یقینی علم نہیں، ویسے شیخ نہایت دیندار، پرہیز گار شخص ہے۔اس کی چار سو مربع میل پتھریلی سلطنت میں جواہرات کی دکانیں ہیں اور ان کی بدولت وہ دنیا کا چوتھا امیر آدمی ہے (کیا تم یقین کروگے کہ وہ ایک سیکنڈ میں دو ہزار ڈالر کماتا ہے۔چند ماہ پہلے یہ سادہ دیندار آدمی لندن میں اپنی گرتی ہوئی قوتوں کی بحالی کی خاطر علاج کرانے آیا، اس کی بیویاں شکایت کرنے لگ گئی تھیں اور بوڑھا شیخ بہت متفکر تھا۔ یہاں وارڈوفور کے انگلستان میں مقیم قونصل نے (جو شیخ کے خسروں میں سے ایک تھا) اس کا تعارف ڈاکٹر اسٹیفن وارڈ سے

کرایا۔ شیخ اور ڈاکٹر وارڈ پکے دوست بن گئے اور شیخ ہفتہ میں ایک ایک دو بار ڈاکٹر کے فلیٹ میں دو رخے آئینے میں سے دیکھنے جایا کرتا تھا۔ یہ اس کے علاج کا ایک حصہ تھا۔ ڈاکٹر وارڈ اسے کئی بار سوہو کے ایک نائٹ کلب میں بلیو فلم دکھانے بھی لے گیا، تم جانتے ہو بلیو فلم کیا ہوتی ہے؟ وہ نا پختہ بچوں کے لیے نہیں ہوتی۔ صرف چالیس پچاس سال کے پختہ بچے انہیں ٹپکتی رال سے دیکھتے ہیں۔ عملی طور پر شیخ کو اس علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن ڈاکٹر وارڈ کو اس علاج سے بہت فائدہ ہوا۔ اس نے بوڑھے شیخ سے دس ہزار پونڈ کمائے۔ شیخ البتہ کرسٹاین کیلر سے بہت متاثر ہوا، جسے ڈاکٹر وارڈ کے دو رخے آئینے میں سے دو تین مرتبہ بغیر کپڑوں کے دیکھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر وارڈ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مس کیلر کو اپنے حرم میں لانا چاہتا ہے اور اسے وارڈوفور کہ چیف ملکہ بنانے کے لیے تیار ہے۔ شیخ نے اپنے قونصل کو بھی وارڈ کو راہ پر لانے کو حکم دیا۔ خود بھی وارڈ کو دس لاکھ پاؤنڈ کی پیش کش کی اور اس پر واضح کیا کہ اگر وہ چاہے تو وہ بھی وارڈ افور میں پانچ ہزار پاؤنڈ پر بطور وزیر امور خصوصی آ سکتا ہے، کسی وجہ سے ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔ شیخ آف وارڈوفور کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ اسے اپنے عزیز دوست سٹیفن وارڈ سے امید نہ تھی اور نہ اسے یہ علم تھا کہ اس کا خسر قونصل ایسا نالائق آدمی ہے۔ اس نے اپنی جواہرات بھری پتھریلی سلطنت میں لوٹتے ہی اپنے خسر و قونصل کو نااہلی کی بنا پر سبک دوش کر دیا۔ اس کی بیٹی کو جو حرم میں تھی طلاق دے دی اور چار پانچ معصوم لوگوں کو محض اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے عبرتناک سزائیں دیں۔

تم کہو گے کہ اس واقعے کا نتیجہ کیا ہے اور شیخ آف وارڈوفور کا کرسٹائن کیلر سے

کیا تعلق ہے! بچوں اس واقعے سے یہ سبق اخذ ہوتا کہ شیخ آف وارڈ وفور بڑا نیک اور اچھا آدمی ہے اور اس نے صرف عقد کی پیش کش کی اور یوں اپنی پاکبازی کو بچا لے گیا۔ اور کرسٹائن کیلر جان پروفیمو، سٹیفن وارڈ، اور روسی آوانوف ۔۔۔ یہ سب برے لوگ اور بد کردار لوگ ہیں۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں!

رائٹر گلڈ

ر، سے روٹی بنتی ہے جو اس ملک میں خوش نصیب لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی لال رنگ کی ر، راجوں مہاراجوں کے لیے ہے جو عموماً ہندوستان میں رہتے ہیں اور تھوڑے بہت یہاں بھی پائے جاتے ہیں، اور ر، سے راولپنڈی بھی ہے، جہاں ہمارے صدر رہتے ہیں۔ پھر ر، ردیف کے لیے بھی ہے جس ک خلاف جدید شعراء نے علم بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ الغرض ر، بہت سی چیزوں کے لیے ہے مگر سب سے زیادہ ر، رائٹر گلڈ کے لیے ہے۔

تم پوچھو گے کہ یہ رائٹر کیا چیز ہے، ممکن ہے تمہیں پہلے ہی معلوم ہو، کیونکہ آج کل کے بچے سب کچھ جانتے ہیں۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو سنو! رائٹر انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے لکھنے والا یعنی ادیب۔ گلڈ کا مطلب ہے، جماعت یا سبھا۔ رائٹر گلڈ کا مطلب ادیبوں کی جماعت ہے۔ ان لکھنے والوں میں سے بیشتر اردو یا بنگالی، پنجابی یا پشتو، سندھی یا بلوچی میں لکھتے ہیں یا کسی زمانے میں لکھا کرتے تھے۔ نام دیسی بھی ہو سکتا تھا، مگر رائٹر گلڈ میں جو آن بان ہے وہ کسی اور نام میں کہاں۔ خصوصاً گلڈ کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لیے کافی ہے

چار پانچ سال پہلے رائٹرز گلڈ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ادیب بال بڑھائے کھلے بچھڑوں کی طرح سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے، کسی کو خیال آیا کہ جب شہر میں پرچون فروشوں، تانگہ ڈرائیوروں، نجومیوں اور حجاموں وغیرہ نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں تو ادیبوں کو کیوں کھلے بندوں میں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ کراچی میں ایک بڑی کنونشن ہوئی۔ جس میں دور دراز سے رائٹرز مانگے ہوئے کپڑے پہن کر پہنچے۔ پریذیڈنٹ نے کنونشن سے خطاب کیا اور اشیر واردی ادیب پھولے نہ سمائے۔ رائٹرز کو اس سے پہلے معاشرے میں بینڈ باجوں والوں اور حجاموں سے کچھ ہی اونچا مقام حاصل تھا (اگرچہ بینڈ باجے والے اور حجاموں کی مالی حالت ادیبوں سے کہیں اچھی تھیں) پریذیڈنٹ کی تقریر سے ادیبوں کی ڈھارس بندھی کہ حکومت نے ان کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ گلڈ نے کام خوب زور وشور سے شروع کیا۔ لکھنے والوں کو رکنیت کت فارم بھجوائے گئے، ہر شخص جس نے تین کہانیاں دو مقلے یا پانچ غزلیں لکھیں تھیں ممبر بن گیا۔ پہلے دس روپے ہر رکن نے بڑے شوق سے دیے۔ اب ہر ممبر کو گلڈ کی طرف سے چھٹیاں موصول ہو رہی ہیں کہ آپ نے پچھلے تین یا چار سالوں سے رکنیت کا چندہ جمع نہیں کرایا اور آپ کے نام پچاس یا ساٹھ روپے کی رقم واجب الادا ہے۔ یوں ممبر لوگ اب ممبر بن کے پچھتا رہے ہیں۔

گلڈ نے رائٹرز کو نہ صرف ایک ڈھرے پر لگا دیا ہے بلکہ ان کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے، بہت سے لوگ جو صرف خطوط لکھتے ہیں۔ گلڈ کے رکن بن کر سند یافتہ ادیب بن گئے۔ گلڈ نے ادیب سازی کے علاوہ ادیبوں کو فیض پہچانے

کے بہت سے کام کیے۔ ملتان کے گلڈ ہوٹل میں ادیبوں سے ابلے انڈے کے دو آنے لیے جاتے ہیں، جبکہ عام لوگوں سے ساڑھے چار آنے فی انڈا چارج کیا جاتا ہے۔۔۔ رکنیت کا ٹکٹ کاؤنٹر پر دکھلانا ضروری ہے۔ لاہور میں منٹگمری روڈ پر پرنسز ہوٹل کی عمارت بھی اب گلڈ نے اپنے دفاتر کے لیے حاصل کر لی ہے۔ صحرا نورد کے خطوط کا شہرہ آفاق مصنف میرزا ادیب یہاں ٹیلی فون ی دیک بھال کرتے ہیں، جب کوئی لکھنے والا مر جاتا ہے (یہ لوگ اکثر مرتے رہتے ہیں اور کوئی پونجی چھوڑ کر جانے پر یقین نہیں کرتے) تو گلڈ حرکت میں آجاتا ہے۔ گلڈ کے ایک سرکاری گزٹ ''ہم قلم'' میں جو ماہ بہ ماہ کراچی سے چھپتا ہے اور جسے بعض لوگ غلطی سے ادبی مجلّہ سمجھ کر خرید بیٹھتے ہیں۔ ''آہ فلاں بھی چل بسے'' کی قسم کے عنوان سے لکھنے والے کی وفات کی خبر شائع ہوتی ہے اور اردو ادب کے ناقابلِ تلافی نقصان کا اظہار کرنے کے بعد مرحوم کے پسماندگان کی تعداد اردو میں بتائی جاتی ہے۔ گلڈ کے کارپردایہ تصدیق کرتے ہیں کہ مرحوم گلڈ کے رکن تھے یا نہیں ،رکن ثابت ہونے پر عموماً پانچ سے یا ہزار کی رقم کا چیک مرحوم کی بیوہ کے نام ارسال کیا جاتا ہے۔ گلڈ نے دو تین وفد بھی مشرقی پاکستان اور بیرونی ممالک میں خیر سگالی کے لیے بھیجے ہیں۔ وفد کا ہر رکن دوسرے اراکین کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کس بنا پر منتخب کیا گیا ہے۔ وہ ادیب جو وفد میں نہیں جا سکتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں گلڈ کو ریکٹ کہتے ہیں اور استعفے کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ استعفے، انہوں نے کبھی نہیں دیا) وفد میں جانے والے قدرتاً گلڈ کو اچھا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گلڈ اس قسم کے وفد بھیج کر ادب کی بڑی گراں قدر خدمات سرانجام

دے رہا ہے۔ پھر جس طرح باہر ادب کا نوبل پرائز یا پولٹزر پرائز (ایک سٹالن پرائز بھی ہوتا ہے جو بدقسمت مارشل کے ساتھ ہی دفن ہو گیا) سال بہ سال بہترین مصنف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح گلڈ نے یہاں آدم جی پرائز اور داؤد پرائز کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ سب لکھنے والے اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں اور ادیبوں کی ایک کمیٹی سال کی بہترین اور انعامات کی مستحق کتابوں کا فیصلہ کرتی ہے۔ ان انعاموں نے ملکی ادب کی رفتار تیز کر دی ہے۔ بہت سے ادیبوں نے ضغیم ناول لکھ کر اردو ادب کا دامن مالا مال کر دیا۔ اگرچہ ان کا اپنا دامن خالی رہ گیا۔ آدم جی پرائز ان کو نہ ملا اور اب وہ اور ان کے ناز برسر بازار گلڈ اور انتخابی کمیٹی کے ممبران کو جلی کٹی سناتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ ہے بھی ظلم۔ ایک بے چارے ادیب نے دس سال کی محنت شاقہ سے ایک ضخیم ترین ناول لکھا۔ نام مجھے یاد نہیں۔ غالباً ''چھانگا مانگا کا پھجا'' میں نے ایک دفعہ ایک خضاب لگی چھدری ڈاڑھی والے چھوٹے آدمی کو اس ناول کو قلی کے سر پر اٹھوا کر پلیٹ فارم پر جاتے دیکھا تھا۔ اس شخص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ غالباً وہ واحد شخص ہے جس نے اسے پڑھا ہو گا۔ ایک باہمت ناشر نے اسے چھاپا اور اس کی طباعت کی لاگت نے اسے تباہ کر دیا، مگر مصنف اور ناشر دونوں کو یقین تھا کہ چھانگا مانگا کے پھجے کو پانچ ہزار روپے کا آدم جی پرائز مل کر رہے گا۔ آخر ناول دو ہزار صفحے کا تھا۔ ان بے چاروں کی قسمت! کمیٹی نے ایک اور ناول کو جو ایک ہزار صفحے کا تھا انعام کا مستحق قرار دے دیا۔ بات یہ تھی کہ کمیٹی کے ججوں میں وہ خضاب لگا۔ ڈاڑھی والا آدمی نہ تھا جو اسے پڑھتا اور ان میں سے کسی کو اتنے بڑے انسائیکلو پیڈیا کو پڑھنے

کی ہمت نہ ہوئی۔ان میں سے چند ایک نے اس آدھی ضخامت کا ناول پڑھنے کو ترجیح دی اگرچہ وہ چین کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں تھا اور اس کی کہانی ان کے خاص پلے نہ پڑی لیکن انہوں نے متفقہ طور پر اسے سال کا بہترین ناول ٹھہرایا ،دراصل یہ انعامات کا چکر ہے ہی ٹیڑھا۔رائٹر حضرات میں خوامخواہ کی چخ چل گئی ۔پہلے شعراء اور ادبا کی سرپرستی بادشاہ کیا کرتے تھے ،اب آدم جی ادبی انعام کر تے ہیں

بچو! نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا ادب سرپرستی کے بغیر نہیں پنپ سکتا۔لوگوں کا خیال تھا کہ گلڈ کے قائم ہو جانے سے ادیب دھڑا دھڑ شاہکار لکھنے شروع کریں گے ،مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔یہاں نہ کسی کو لکھنے کا شوق ہے اور نہ پڑھنے کا، لکھنے والے کا معاشرے میں مقام کبھی نہیں بڑھے گا۔جب تک اس کی کتابیں نہیں بکیں گی۔گلڈ کو بنے ہوئے چار سال ہو گئے اور رائٹر کا مقام اب بینڈ باجے والوں اور حجاموں سے کسی قدر کم ہے اور مالی حالت ان سے بہت ہی خستہ!میرا خیال ہمیں اس **ملک** میں ادب یا ادیبوں کی حالت کے متعلق زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔اب نہ ادیب رہیں ہیں نہ ادب ،صرف گلڈ کی چکاچوند باقی ہے،اور وہ بھی اس وقت تک جب تک اس **ملک** کے دوران مہاپرش اس پر اپنا دستِ شفقت رکھتے ہیں

سوالات

۱۔ستائیسویں صدی میں کسی ازم کا بول بالا ہوگا؟اگر تمہارا جواب نیوڈرم ہے تو کیا ہم اپنے پہلے موروثوں کی طرح درختوں پر رہ رہے ہوں گے؟

۲۔شیخ آف وارڈ کیوں اچھا آدمی ہے؟اور جان پروفیومو،ڈاکٹر سٹیفن وارڈ کیوں برے ہیں؟روشنی ڈالو۔

۳۔رائٹر گلڈ کا انجام کیا ہوگا؟پرنسز ہوٹل کی گیارہویں منزل کس صدی میں تعمیر ہوگی،اوراس وقت اس پر چڑھنے کے لیے بجلی کے متحرک زینے استعمال ہوں گے یا ہیلی کاپٹر؟قیاس آرائی کرو!

سندباد جہازی

جدید جغرافیہ پنجاب (تیسرا باب)

پہاڑ۔ دریا۔ نہریں وغیرہ

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے سدِ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جہاں آج کل سدِ سکندری واقع ہے وہاں زمانہ قبل از تاریخ میں ہر طرف بنجر میدان اور ریگستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میل تک روئیدگی کا نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ پھر زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اس کی جگہ لے لی۔ ماہرین طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کفِ دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا، لیکن بعض اتحادی محقق اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی تغیرات لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ سدِ سکندری کی سب سے اونچی چوٹی مونٹ ہے جو اس سلسلہ کوہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ سپید برف جمی رہتی ہے جو دور دور دے

نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چوٹیاں ہیں جن کے برفانی عمامے دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ان چوٹیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خدانخواستہ ان پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے ویران ہو جائیں۔

ہر مذہب وملت کے لوگ سکندر مونٹ پر اپنا حق جتاتے ہیں، چنانچہ ساہوکار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہیں کیونکہ یہاں مدت تک شری ساورکر نے کٹیا ڈال رکھی تھی اور شری گاندھی جی مہاراج اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ملیچھوں نے اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔

منوہر پربت

یہ چوٹ اتحادی سطح مرتفع کے حصہ میں ہندو سبھا کی ترائی کے پاس واقع ہے۔ یہ بالکل چٹیل پہاڑ ہیں اور اس کے صرف بعض حصوں میں تھوڑی زیر درختی پائی جاتی ہے۔ اسے لاکھی پربت بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں اگلے وقتوں کے خزانے دفن ہیں۔ بنیے ساہوکار کہتے ہیں کہ بوہنی کے وقت منوہر پربت کا نام لیا جائے تو بنج بیوپار میں بڑا نفع ہوتا ہے۔

کوہ خضر

کسی وقت جب آسمان صاف ہو سکندر مونٹ پر نظر ڈالو۔ تمہیں اس سے کسی

قدر یورپ کی طرف ہٹ کے ایک اور چوٹی نظر آئے گی جس کے برفانی عمامہ کے ساتھ ساتھ سیاہی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس برفانی چوٹی کو کوہ خضر کہتے ہیں اور اس کے پاس جو سیاہی نظر آتی ہے وہ اصل میں جنگلات ہیں۔ اگرچہ اونچائی میں یہ سکندر مونٹ سے چھوٹی ہے مگر اس کا راستہ بہت دشوار گزار ہے اور بڑے بڑے کوہ پیما اس کا بھید نہیں پا سکے۔

مجیٹھ پہاڑ

سدِ سکندری کی یہ اونچی چوٹی اکالی جنگلات کے سر پر کھڑی سنتری کی طرح پہرہ دے رہی ہے۔ سندر بن کا مشہور جنگل اس چوٹی پر واقع ہے۔ اس پر برف بھی پڑتی ہے، مگر زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اس کے ڈھلوانوں پر کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے۔

میاں کا ٹیلہ

یہ چوٹی بہت نیچی ہے۔ اس لیے اس تک پہنچنا آسان ہے، چنانچہ کالجوں اور اسکولوں کے کھلنڈرے کئی مرتبہ اس تک پہنچ چکے ہیں، پھر بھی ہر انسان کا کام نہیں کہ اس پر قدم رکھ سکے کیونکہ جو لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں وہ لوٹتے وقت راستہ بھول جاتے ہیں۔ اس پر برف کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خشک گھاس اور خوفناک چٹانیں بڑے غرور سے سر اٹھائیں کھڑی ہیں، جنھیں دیکھ کر انسان کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی، پھر بھی جن لوگوں کو معلومات بڑھانے

اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کا شوق ہے وہ جوں توں کر کے یہاں جا ہی پہنچتے ہیں ۔

کوہ چھوٹو رام

یہ پہاڑ اگرچہ سدِ سکندری سے بہت دور مشرق کی طرف ہٹ کے واقع ہے اور بظاہر اتحادی سلسلہ کوہ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے تاہم جغرافیہ کے عالموں کا خیال ہے کہ کوہ چھوٹو رام اصل میں سدِ سکندری کی ہی شاخ ہے کیونکہ بناتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے یہ اتحادی سلسلہ کوہ سے بہت ملتا جلتا ہے، کہتے ہیں کہ اس چوٹ پر کھڑے ہو کر ایک کے دو نظر آتے ہیں ۔

اتحادی سلسلہ کوہ کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے پہاڑ ہیں ۔ ذیل میں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

کوہ شہاب الدین

سدِ سکندری کی مشرق کی جانب یہ عظیم الشان پہاڑ کھڑا ہے ۔ اس میں گندھک کی کانیں کثرت سے ہیں ۔ اس لیے اس کی رنگت سیاہی مائل ہے ۔ اس کے بعض حصوں میں تھوڑی سی زیر درختی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اکثر حصے بالکل لنڈ منڈ نظر آتے ہیں ۔ پرانے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ سے کبھی لاوے کا سیلاب بہہ نکلے گا جو اتحادی سطح مرتفع کو جلا کر بھسم کر دے گا، لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کی اندرونی حرارت ختم ہو چکی ہے اور اب اتحادی سطح مرتفع کو اس

سے کوئی خطرہ نہیں۔

کوہِ ممدوٹ

مشہور پہاڑ ہے جو اتحادی سطح مرتفع سے وادی لیگ تک پھیلتا چلا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں، چنانچہ جو برساتی نالے اس سے بہہ نکلے ہیں ان کے ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادی لیگ دونوں کے باشندے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مظفر کوہ

یہ بھی مشہور برفانی پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سدِ سکندری سے ملا ہوا تھا، لیکن بعض کوہستانی ندیوں نے سدِ سکندری میں کئی دریا اور وادیاں حائل ہیں اور یہ سدِ سکندری سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

اشترا کی جوالا مکھی

آتش فشاں پہاڑوں کا مشہور سلسلہ ہے۔ کبھی اس سے برابر کئی مہینے آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مدت تک افسردگی سی چھائی رہتی ہے۔

کانگریسی سلسلہ کوہ

اس کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔ست پڑا اور بھار گو پربت ۔ان دونوں کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں

درے

درہ دولتانہ

سدِ سکندری کا مشہور درہ ہے۔جھیل دولتانہ جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔اسی درہ میں واقع ہے۔ بہت کشادہ درہ ہے ۔اس لیے اسے اتحادی سطح مرتفع اور دوسرے علاقوں کے درمیان آمدورفت اور رسل و رسائل کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔اس درہ سے ہرموسم میں بکثرت قافلے، اخباروں کے انبار اور سینما کے فلم گزرتے نظر آتے ہیں۔سدِ سکندری اور کوہ شہاب الدین کے درمیان بھی یہی درہ واسطہ بنا ہوا ہے ۔ پرانے زمانے میں کے اکثر محققوں کا خیال تھا کہ درہ دولتانہ دراصل کوہ شہاب الدین میں واقع ہے،لیکن جدید تحقیق سے اس بات کی تردید ہوگئی ہے۔مسلم لیگ کی وادی اس درے کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔

درہ میر

یہ بھی سدِ سکندری کا مقبول عام درہ ہے۔بہت سا مال تجارت جودساور کو جاتا ہے اسی درہ کے راستے سے ہوکر گزرتا ہے۔پنجاب کی ریاستوں کے جوکاروں جاتے ہیں ان کا راستہ بھی یہی ہے۔

درہ جہان یا درہ شاہنواز

سدِ سکندری کا مشہور درہ ہے جو میاں کے ٹیلے میں درہ میر کے عین بالمقابل واقع ہے۔

درہ غفنغر

ایک تنگ درہ ہے جس کے دونوں طرف پرہیب اور سنگلاخ چٹانیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ یہ درہ بہت پر پیچ ہے اور دور دور سے وادی لیگ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے، لیکن قریب جاؤ تو وادی لیگ سے بہت دور سدِ سکندری کی چٹانوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اجلِ ڈنڈی

یہ درہ مجیٹھ پہاڑ پر واقع ہے۔ اکالی جنگلات اور سندر بن کی بہت سی پیداوار اسی درہ کے راستے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ یہ درہ اونچے اونچے اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے درے ہیں جن کا حال بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔ بھار گو پربت اور ست پڑا میں بھی بہت سے چھوٹے بڑے درے ہیں جن میں زیادہ آمدورفت تو نہیں ہوتی البتہ وہ تجارتی مقاصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جھیلیں

جھیلِ دولتانہ

یہ میٹھے پانی کی بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ کوہ شہاب الدین اور سدِ سکندری کے درمیان واقع ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ اب آہستہ آہستہ اس کا پانی کھارا ہوتا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی سطح بالکل ساکن نظر آتی ہے اور اس کے نیلگوں پانی پر مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے تیرتے پھرتے ہیں، لیکن یہ جھیل بہت گہری ہے اور جھیل ولر کی طرح اس میں کشتی رانی بہت خطرناک ہے چنانچہ ہر سال اس میں بہت سی کشتیاں اور ڈونگے غرق ہو جاتے ہیں۔

دریا

دریائے ظفر علی خان

پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس کی ہولناک موجیں ایک طرف سدِ سکندری سے جا ٹکرائی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں اور جب اس میں طغیانی آتی تھی تو اتحادی سطح مرتفع کے باشندے الامان و الحفیظ پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے تھے، لیکن اب اتحادی انجنیروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے اور اس پر واہ کے سیمنٹ سے ایک عظیم الشان پل تعمیر کر دیا ہے جسے عہدِ جدید کی انجنیری کا عظیم الشان کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ پہلے اس سے آبپاشی بالکل نہیں ہو سکتی تھی لیکن اب اس سے اتحادی سطح مرتفع کی اراضی کو سیراب کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر خطرناک چٹانیں۔ کئی آبشار بھی ہیں اس لیے اس میں زیادہ دور تک جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔

کسی کو یقین نہیں کہ دریائے ظفر علی خان ہمیشہ اس حالت میں رہے گا۔ کیا عجب اس میں پھر کبھی بڑے زور کی طغیانی آئے اور اس کی موجیں بند اور پل کو بہا کر لے جائیں۔ ابھی چند سال ہوئے اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے احراری کاہستان کو زیرِ آب کر دیا تھا۔ دریائے ظفر علی خان پہلے سدِ سکندری سے ٹکراتا، وادی لیگ سے پہلو بچاتا بحیرہ کانگریس میں ڈیلٹا بنا کر گرتا تھا

۔اب اتحادی سطح مرتفع اور وادی لیگ کو سیراب کرتا ہوا خلیج لیگ میں گرتا ہے۔

دریائے ظفر علی خان میں بہت سے چھوٹ چھوٹے دریا اور ندی نالے آ ملتے ہیں جن میں دریا ظفر علی خان بہت مشہور ہے۔ یہ دریا اصل میں دریائے ظفر علی خان کی ہی ایک شاخ ہے جو کرم آباد سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان سے الگ ہو جاتا ہے اور میدانی علاقے میں بڑے زور سے بہتا ہوا سکندر مونٹ کے مقام پر پھر دریائے ظفر علی خان سے آ ملتا ہے۔ یہ دریا اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہالاتا ہے یہی وجہ ہے کہ سکندر مونٹ سے آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان کا پانی بہت گدلا نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے مٹی بہا کر لاتے ہیں اوظفر علی خان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو دریائے ظفر علی خان ایک دن ایک وسیع دلدل بن کے رہ جائے گا۔ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اسے دوآبہ زمیندار کہتے ہیں۔

دریائے سالک و دریائے مہر

یہ دونوں دریا پہلے دریائے ظفر علی خان کے معاون تھے لیکن ۱۹۲۷ میں ایک زلزلہ آیا تھا جس نے ان کی گزرگاہ تبدیل کر دی۔ دریائے سالک کا پاٹ زیادہ ہے اور دریائے مہر اگرچہ عرض میں اس سے کم ہے، لیکن زیادہ گہرا ہے۔اس کے علاوہ لمبائی میں بھی اس سے زیادہ ہے۔ان دونوں دریاؤں میں نہ کہیں چٹانیں ہیں نہ آبشار، دونوں خاموشی سے اپنے مقررہ راست پر بہتے چلے جاتے ہیں اور

ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ دریائے سالک میں سارا سال کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور لوگ غوطے لگاتے اور موتی نکال لاتے ہیں، لیکن اکثر غوطہ خوروں اور شناوروں کو دریائے مہر کی طرف رخ کرنے کی جرات بھی نہیں ہوتی۔ یہ دونوں دریاء بہتے ہوئی سکندر مونٹ کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور دریائے انقلاب کہلاتے ہیں۔اس کے درمیان جو سرسبز زرخیز علاقہ ہے اسے دوآبہ مہریا دو آبہ مہر سالک کہتے ہیں اکثر لوگ اس دوآبہ کو دوآبہ' کہتے ہیں

فردوسی نے محمود غزنوی کے متعلق کہا تھا

جحتہ درگہ محمود زابلی ریاست چہ گونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست

چھ غوطہ یازوم واندرون ندیم درگناہِ قسمت ما بد گناہِ دریا نیست

بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

انقلاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا اتحادی سطح مرتفع کے شمالی حصہ سے ہیں اور خلیج لیگ کے قریب جا گرتے ہیں۔

دریائے نورا

چشمہ لوب نور جو کشمیری بازار سے شمال کی جانب اقع ہے، نکلتا ہے۔ میاں کے ٹیلے کے پاس سے گزرتا ہوا مٹی کے ساتھ ساتھ پکی روٹی، نورمہ کلاں، قصہ شاہ مہرام اور بہت سی چھوٹی بڑی درسی کتابیں بہالاتا ہے۔ کہتے ہیں سکندر کا یہ کتب خانہ اسی دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہ دریا کچھ ایسا گہرا تو نہیں، لیکن کتابوں کی گھلی ہوئی سیاہی کے باعث اس کا پانی بہت تاریک نظر آتا ہے اور اکثر لوگ غلطی

ہے اسے بہت گہرا سمجھ لیتے ہیں، پہلے اس میں جہاز چلا کرتے تھے، لیکن اب صرف اسکولوں کے طالب علم اور مدرس کبھی کبھی کتابوں کی تلاش میں اس کے تاریک سینہ پر کشتیوں اور ڈونگے دوڑاتے نظر آتے ہیں۔ اس دریا میں مچھلیاں نہیں ہوتی ہیں صرف کتابیں ملتی ہیں اس لیے بے چارے مدرس اسے اللہ کا بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں اور اس کے طاس کو احسان کہتے ہیں۔ بہت چھوٹا دریا ہے۔ جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ پہلے خلیج میں گرتا تھا، اب خلیج سے کچھ دور شمال کی جانب صحرائے کالاہاری کے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ علمائے جغرافیہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ اسے دریا کہنا چاہیے یا جھیل۔

دریائے کرشنا

ہندو سبھا کی ترائی سے عین شمال کی طرف آریہ سماج کی گھاٹیاں ہیں جن سے دریائے کرشنا نکلتا ہے۔ یہ دریا کچھ دور تک بھارگر پربت اور ست پڑا کے درمیان میں سے ہو کر پتھروں سے ٹکراتا شور مچاتا گذرتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ بہت کم اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ اس کوہستانی علاقے سے نکل کر جب یہ میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کا پاٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا بہت بڑا دریا ہے اور ان پانچ دریاؤں میں سے ہے جن کی وجہ سے اس صوبے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو سبھا کی ترائی کے ساتھ ساتھ کانگریس کے کوہستانی علاقوں کو بھی سیراب کرتا ہے لیکن اس کے بالائی حصے میں چٹانیں کثرت سے ہیں اس لیے یہاں جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کا زیریں حصہ جہاز رانی کے لیے بہت موزوں ہے۔

دریائے کرشنا کا طاس بہت زرخیز ہے۔ اس کے بالائی حصہ کو پرکاش اور زیریں حصہ کو پرتاب کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ دریا بہت مقدس ہے چنانچہ دور دور سے لوگ اس میں اشنان کرنے آتے ہیں اور اس کا پانی بوتلوں میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ اس میں بہت چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں آ ملتی ہیں۔

ویرندرندی اس دریا کی ایک مشہور شاخ کا نام ہے۔ یہ ندی بہت سبک خرام ہے اور سرخ و سپید سنگریزوں پر اونچے سروں پر بہتی گیت چلی جاتی ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں اور مصفےٰ ہے اور اس کے کنارے کافی دور تک سبزہ زار پھیلتا چلا گیا ہے۔ پہلے اکثر شوقین لوگ صبح شام ویرندرندی کے کنارے آ کر اس سبزہ زار اور آب رواں کا لطف اٹھاتے، چھینٹے اڑاتے اور ڈبکیاں لگاتے تھے، لیکن اس اس کے کنارے خاردار جنگلے بنوا دیے گئے ہیں اور خاص خاص لوگوں کے سوا کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ دریائے کرشنا جنوب کی طرف بہ کر خلیج مہا سبھا میں گرتا ہے۔

دریائے خورسند

یہ دریا آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر کچھ دور دریائے کرشنا کے متوازی بہتا ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ کے قریب پہنچ کر یہ بھارگو پربت اور ست پڑا دونوں سے پہلو بچاتا ہوا دریائے پرمانند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی ترائی کو زرخیز بنانے میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے۔ سول نافرمانی کے موسم میں جب اونچے پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور کوہستانی نالے بہ نکلتے ہیں تو اس دریا میں طغیانی آ جا

تی ہے اور اس کی موجیں کانگری کوہستان کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہیں ۔اس کا پاٹ اچھا خاصا ہے، لیکن زیادہ گہرا نہیں، ہندویوں کے نزدیک اس دریا کو بھی تقدس حاصل ہے ۔اس دریا کے طاس کے بھی دو حصے ہیں ۔ بالائی حصے کو آریہ گرزٹ اور زیریں حصے کو ملاپ کہتے ہیں ۔اس میں ہمیشہ جہاز رانی ہوتی رہتی ہے ۔یہ دریا جنوب کی طرف بہتا ہوا خلیج مہا سبھا میں جا گرتا ہے ۔

دریائے پر مانند

آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر اکالی جنگلات کے پاس سے بہتا ہوا مغرب کی طرف ہو لیتا ہے اور دریائے خورد سند کے متوازی بہنے لگتا ہے ۔ ہندو سبھا کی ترائی میں یہ دریا کچھ ایسے زور سے بہتا ہے کہ آس پاس کی زمین کو زیر آب کر دیتا ہے ۔ چنانچہ اس عمل کی وجہ سے اس علاقے میں جا بجا وسیع دلدلیں پیدا ہو گئیں ہیں جہاں مچھر بڑی کثرت سے پرورش پاتے ہیں اور ہندو فیور پھیلاتے ہیں ۔ یہ بہت ہی خطرناک قسم کا بخار ہے، جس نے پنجاب میں تباہی پھیلا رکھی ہے ۔

دریائے مانند کے دونوں کناروں پر بہت دور دور چٹیل پہاڑیوں اور وحشت ناک بیابانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ان پہاڑیوں پر جو تھوڑی بہت زراعت ہوتی ہے حقوق کی برسات میں مینا سے بہا لے جاتا ہے ۔اس عمل کو آبِ بری یا پن کٹ (EROSION) کہتے ہیں ۔ پنجاب کی زرخیزی کو پن کٹ نے بہت نقصان پہنچایا ہے ۔نارنگ سرا اور زیندرناگ جو مشہور گرم چشمے ہیں اسی دریا کے

کنارے واقع ہیں۔

کہتے ہیں کہ زمانہ قبل تاریخ میں دریائے مانند کانگرسی سلسلہ کوہ میں سے بہتا ہوا کالے پانی میں جا گرتا تھا۔ پھر کچھ ایسے انقلابات ہوئے کہ یہ ہندو سبھا کی ترائی میں سے بہتا ہوا خلیج سرکار کے ''گورے پانی'' میں جا گرنے لگا۔ اس دریا کے طاس کو ہندو کہتے ہیں۔

دریائے حبیب

اس دریا کا منبع ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جغرافیہ والوں کا خیال ہے کہ سدِ سکندری اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے بعض نامعلوم حصوں کی تحقیق کے لیے جو مہمیں بھیجی جارہی ہیں انہیں اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو دریائے حبیب کا منبع بھی معلوم ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں یہ دریا مسلم لیگ کی وادی کو سیراب کرتا تھا ق، لیکن اب اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور احراری کاہستان اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے درمیان بہتا ہے۔ بڑا تیز دریا ہے۔ خصوصاً جب یہ سکندر مونٹ کی مہیب چٹانوں سے گزرتا ہے اور آبشار بناتا ہوا بہتا ہے تو بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے، یہاں اس میں جگہ جگہ گرداب پڑتے ہیں۔ اس کی موجیں کف آلود نظر آتی ہیں۔ میدانی علاقے میں بھی پہنچ کر اس کی تیزی میں فرق نہیں آتا اور یہ اپنے زور کے کنارے کے علاقے سے بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ اس کے دہانے کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ بحیرۂ کانگرس میں یا اس کے قریب کے کسی سمندر میں گرتا ہے، لیکن ابھی تک یہ بات حقیقت طلب ہے۔

۔سلیمان ساوجی نے دجلہ کی روانی کو دیکھ کر کہا تھا

دجلہ را امسال رفتار عجب مستانہ ایست پائے ور زنجیر کف بر لب مگر دیوانہ ایست

یہ شعر دریائے حبیب پر بھی صادق آتا ہے۔

۔دریائے ویرا

روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھرمی نر ناری کا لابھ پہنچاتا ہے۔اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔کسی زمانے میں ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔اب بھارگو پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے اور چاندی کے ذرات ملتے ہیں۔ہندوؤں کے دوسرے مقدس دریاؤں کی طرح یہ بھی غیر زراعت پیشہ دریا ہے یعنی اس کے کنارے زراعت کی بجائے بنج بیوپار ہوتا ہے۔

دریائے مرتضیٰ

پہلے ترکی میں بہتا تھا، پھر افغانستان میں بہنے لگا۔اب مستقل طور پر ہندوستان آ گیا ہے۔اس دریا اور اس کے معاون دریاؤں نے کسی زمانے میں وہ زرخیز علاقہ بنایا تھا جسے احسان کہتے ہیں۔اب اس دریا کا طاس شاہباز کہلاتا ہے ۔چڑیمار اس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔دریائے مرتضیٰ خلیج لیگ میں گرتا ہے۔

کانگرسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں ۔اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگرس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانے میں بہ نکلی تھی ۔ یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سے ندی نالوں اور موریوں کا پانی بھی آ ملتا تھا۔بہر حال یہ صرف برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

پارس ندی بھی ست پڑا سے نکلتی ہے۔اگر چہ یہ چھوٹی سی ندی ہے،لیکن اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف وشفاف ہوتا ہے۔

دریائے مرتضی ترکی کا مشہور دریا ہے۔اس کے کنارے ترکوں نے یونانیوں کو زبردست شکست دی تھی۔

دریائے سول

جسے دریائے ابیض اور عام لوگوں کی بولی میں گورا دریا بھی کہتے ہیں ۔شمال کے ایک نامعلوم خط سے نکلتا ہے اور جنوب کی طرف تیزی سے بہتا ہوا خلیج سرکار میں جا گرتا ہے۔اس کی سطح بظاہر ہموار معلوم ہوتی ہے،لیکن اس کے اندر بہت سی خوفناک چٹانیں ہیں ۔پہلے تو اس کا پانی بہت سپید معلوم ہوتا تھا،لیکن اب اس کی رنگت کسی قدر تیرگی مائل ہوتی جاتی ہے۔سرکار نے اس کے بالائی حصہ سے ایک نہر نکالی ہے جسے جوئے نوریا ''نہر اپر سول'' کہتے ہیں ۔اس نہر کے پانی کی کثیر

مقدار کا ذخائرِ آب میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔نور دریا نور ہیڈ بھی اصل میں اسی نہر کی فیاضی کا کرشمہ ہے جس کے پانی سے پنجاب کا بہت علاقہ سیراب ہوتا ہے جو دریا خشک ہونے لگتے ہیں انہیں بھی اس ذخیرہ آب سے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔یہ نہر اصل میں پانی کے لیے صرف سول کی ہی مرہونِ منت نہیں، بلکہ جھیل دولتانہ سے جو سرکاری ندی نالے بہ نکلتے ہیں ان کا پانی بھی اسی میں آ ملتا ہے اور سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوتا۔

دریائے سول بدیسی دھن میں بدیسی گیت گاتا ہوا بہتا ہے اور دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔اس دریا کو بہار دیکھنا ہو تو سکندر مونٹ پر کھڑے ہو کر دیکھیے۔

دریائے کالی

ہندمہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے ''کالی ناگ'' کہتے ہیں۔یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا ہے۔ہندوسبھا کی ترائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے۔یہ دریا نہ بہت تیز رفتار ہیں اور نہ ہی زیادہ آہستہ خرام، نہ اتنا وسیع ہے کہ اور چھور معلوم ہو، اور نہ اس کا پاٹ اتنا چھوٹا ہے کہ تھوڑے سے خرچے میں پل بن سکے۔نہ اتنا دہ گہرا ہے کہ نہ کا کچھ حال معلوم نہ ہو، نہ اتنا گہرا کہ جہاز بھی نہ چل سکے۔طغیانی کے زمانے میں آس پاس کے علاقہ کو اس طرح زیرِ آب نہیں کرتا کہ بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہو اور جاڑے میں سمٹ کر اتنا چھوٹا بھی نہیں رہ جاتا کہ پایاب نظر آئے۔غرض یہ دریا اپنی

میانہ روی اور اعتدال پسندی کے لیے مشہور ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندوسبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جماتے ہیں، مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ دریا کس علاقے کے زیادہ رقبے کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دھن بدیسی۔ اس کا طاس جسے ''ٹریبیون) کہتے ہیں بہت زرخیز ہے۔

دریاؤں کے سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنجاب کے دریاؤں سے کام لینے کے لیے ان میں جگہ جگہ بندھ باندھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بندھ دریائے ظفر علی خان میں باندھے گئے ہیں کیونکہ طغیانی کے زمانہ میں یہ دریا بہت خطرناک ثابت ہوتا تھا، لیکن جب سے اس دریا کے بندوں میں سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے اس سے خطرہ نہیں رہا۔

سوالات

۱۔ بتاؤ کہ شہاب الدین کی اندرونی حرارت کیوں ختم ہو چکی ہے؟

۲۔ سکندر مونٹ اور مظفر کوہ کا مقابلہ کرو۔

۳۔ بتاؤ کہ چھوٹو رام پر کھڑے ہو کر ایک کے دو کیوں نظر آتے ہیں؟

۴۔ حاتم طائی کے قصے میں اگر تم نے کوہِ ندا کا حال پڑھا ہے تو بتاؤ کہ کیا یہاں کے ٹیلے کو کوہ ندا کہنا صحیح ہے؟

۵۔ بتاؤں دریائے ظفر علی خان آج کل کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں گرتا ہے؟

۶۔ بتاؤ وہ کون سے آلات ہیں جن سے دریا مہر کی گہرائی ناپی جا سکتی ہے۔ کیا تم بانس سے اس دریا کی گہرائی معلوم کر سکتے ہو؟

۷۔ دریائے نورا کون کون سی کتابیں بہالاتا ہے؟

۸۔ کیا تم نے کبھی دیر ندی دیکھی ہے؟ اگر دیکھی ہے تو اس کے متعلق اپنے تجربات بیان کرو؟

۹۔ ہندو فیور کہاں کہاں ہوتا ہے اور گورا پانی کسے کہتے ہیں؟

عبدالمجید سالک

منکہ ایک۔۔۔۔

خاندانی معتبر نائی ہوں

ججمانو! میں ایک معتبر نائی ہوں، میرے دادا بادشاہی نائی تھے۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں میرے دادا نے ہی کرائی تھی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ سنا ہے کہ جب میرے دادا اٹاری سے شاد بامراد ہو کر واپس لوٹے تو مہاراج ان کی پیشوائی کے لیے قلعہ کے حضوری دروازے تک چلے آئے تھے اور دادا پر انعام و کرام کا وہ مینہ برسایا تھا کہ کھاتے کھاتے تین پشتیں گزر گئیں، اور اب بھی مولا کی مہربانی سے بیس بیگھ زمین کا ملک ہوں۔ کھانے پینے کی کمی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے گذران اچھی ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرے بعد یہ خاندانی معتبری چلتی نظر نہیں آتی۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا، طور طریقے بدل گئے۔ پرانے زمانے کے ججمانوں کی یاد آتی ہے تو کلیجے پر استرا چل جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ یار دوست سمجھاتے ہیں میاں ہوش کے ناخن لواؤ، تم کس چکر میں پڑ گئے جس زمانے نے پرانے طریقوں کو مونڈ کے صفاچٹ کر دیا۔ اسی طرح آج کل کے فیشن بھی صاف ہو جائیں گے۔ لیکن ججمانو! ذرا یہ اندھیرا تو دیکھو کہ ہم لوگوں کا کوئی کام بھی ہمارے ہاتھ نہ رہا۔ ہمارے زمانے میں حجامت بناتے تھے تو نائی

ختنہ کرتے تھے، تو نائی زخموں پر مرہم لگاتے تھے، تو نائی پچھنے اور سینگی لگاتے تھے، تو نائی شادی بیاہ میں کھانا پکاتے تھے، تو نائی بر کے لیے کنیا اور کنیا کے لیے بر ڈھونڈھتے تھے، تو نائی، لیکن آج کل یہ کیا قیامت آئی کہ ہم لوگوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں اور کل کے لونڈے چھاؤنیوں میں گوروں کی ڈاڑھیاں مونڈ مونڈ کر اپنے آپ کو نائی کہتے ہیں اور چار چار آنے بٹور لیتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ ہم لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ فتو موچی سے، اللہ بخشے بڑا کاریگر تھا۔ خاص کر کسوت بنانے میں تو سنا ہے ولایت تک مشہور تھا۔ اس سے کسوت سلوائی اور جب وہ لایا تو اللہ دین تیلی کے ہاں دے آئے۔ اس نے پندرہ پندرہ دن کڑوے تیل میں ڈبو کر رکھی۔ اس کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے، پونچھ پونچھ کے صاف کیا۔ چار استرے دو قینچیاں، ایک نہرنا، ایک مہندی وسمہ لگانے کی کھرپی اور ایک کٹوری۔ یہ سب چیزیں اس میں رکھیں اور سالہا سال کے لیے بےفکر ہو گئے۔ اب جو تم دیکھو تو آج کے نائی کمینے آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ ماں بیٹی باپ کلنگ ولایت کے چار چار روپے کے استرے اور صابن اور پھٹکری اور وہ آٹا سا جسے پوڈر کہتے ہیں، لیے پھرتے ہیں، جیسے کوئی نسخہ تیار کریں گے، اور پھر ایک حجامت میں پورا ایک گھنٹہ غارت کر دیتے ہیں۔ ہاتھ کی صفائی کا نام ونشان نہیں، بزرگوں کا ذکر تو کیا کیجیے مجھ روسیاہ کا ایک واقعہ سنیے:

لالہ بھبوتی سرن کے پتا سرگباش ہو گئے، بیٹوں، پوتوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا۔ لالہ جی مجھے بلا کر کہا ''علیا، جو پرتما کی اچھا تھی وہ پوری ہو گئی، ذرا جلدی سے بھدرن کر دو، اس سے فارغ ہو جاؤں تو بیسیوں کام اور پڑے ہیں۔

بس میاں اللہ دے اور بندہ لے، میں نے کورا استرا جو ہاتھ میں لیا تو پچیس آدمیوں کو آدھ گھنٹے میں مونڈ کر رکھ دیا قدر دان جمان نے پانچ روپے چہرہ شاہی میری ہتھیلی پر رکھ دیے اور کہا ''علیا ہم جیسے ساہوکار تو ہزاروں ہوں گے پر تجھ جیسا نائی چار کھونٹ میں نہ ملے گا۔

اب حالت یہ ہے کہ نہ کوئی سر گھٹاتا ہے نہ پٹے رکھتا ہے نہ ڈاڑھی کا خط بنواتا ہے جسے دیکھو ماتھے پر بالوں کا ایک مٹھا سا لیے پھرتا ہے اور سر کے پچھلے حصے میں صفاچٹ میدان، بال ہیں کہ گاؤدم۔ آگے زیادہ پیچھے کم۔ پہلے خال خال لڑکے بالے ڈاڑھی منڈاتے تھے، اب جسے دیکھو جوان ہو یا بوڑھا، مونچھیں تک چٹ کرائے بیٹھا ہے جیسے ابھی باپ مرا ہے۔ نا صاحب ہم سے تو ایسی حجامتیں نہ ہوتی نہیں مولا آباد رکھے اپنے مولویوں اور چودھریوں کو جو پرانی وضع بناہے جارہے ہیں اور ان کے ساتھ ہماری بھی نبھتی جاتی ہے۔ ہم لوگ بچوں کا ختنہ کیا کرتے تھے۔ ذرا سی فلک سیر کھلا دی بچہ اتنا غصیل ہو گیا، بگھیاڑی چڑھائی اور ایک اشارے میں ختنہ کر، چولہے کی جلی ہوئی مٹی سے خون بند کر، راکھ کی پوٹلی لپیٹ، لنگوٹا بندھوا دیا اور بچہ ہے کہ کھیلتا پھر رہا ہے۔ اب یہ کام ڈاکٹروں کے سپرد ہو گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم ختنہ کسے کہتے ہیں۔ نہ باپ نے کیا نہ دادا نے انگریزوں کے پڑھائے ہوئے، اور انگریزوں میں ختنہ کا رواج نہیں جبھی تو ہم نے دیکھا کہ ان سے ختنہ کروا کر بچہ مہینوں بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہے اور ڈاکٹر مارے دواؤں کے بے چارے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کنوؤں میں ڈالنے کی دوا سے دھوؤ، یہ یہ چیز چھڑکو وہ چیز لگاؤ۔ دس روپے روئی اور مرہم پٹی میں غارت ہو جاتے ہیں اور اکثر

ایسا ہوتا ہے کہ بچے کا زخم اچھا نہیں ہوتا اور پھر ہمیں کو بلانا پڑتا ہے۔

ہم لوگ زہری سے زہری پھوڑوں کا علاج دم کے دم میں کر لیا کرتے تھے۔ رنگاری مرہم کا پھاہا چپکا دیا چلو چھٹی۔ اب وہ جبھی اترے گا جب پھوڑا اچھا ہو جائے گا، نہ روزانہ دھونے کا کھڑاگ نہ باندھنے کا قضیہ۔ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اچھے اچھے عقل شناس والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈاکٹروں کے جال میں ایسے پھنسے ہیں کہ دھڑا دھڑ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ روزانہ درد سے چیختے چلاتے بھی ہیں، چیرے بھی دلواتے ہیں۔ مدت تک پھوڑا بھی اچھا نہیں ہوتا، لیکن ڈاکٹر کا جادو ایسا سر پر سوار ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑتے پر نہیں چھوڑتے۔

ججمانو! یہ تو عام نائیوں کے کام تھے۔ اب بھی نائی یہی کچھ کر رہے ہیں، لیکن ہم خاندانی معتبر نائی ان ٹکے ٹکے کے نائیوں سے بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ غریب آدمی تو شادی بیاہ میں کیا خرچ کرے گا اور مہمانوں کو کیا کھلائے گا۔ ہم کھاتے پیتے ججمانوں کی شادی پر کھانا پکاتے تھے۔ بس چار گھڑی پہلے کہہ دیجئے اور پانسو آدمیوں کا کھانا تیار لیجئے پھر ہم خودغرض بھی نہ تھے۔ دوسرے کا گھر پھونک کر تماشا نہ دیکھتے تھے۔ آج کل کے نمک حرام نائیوں کی طرح چاول اور گھی اور پستہ بادام اور گوشت چرا کے چپکے سے اپنے گھروں کو نہیں بھجواتے تھے۔ بلکہ اپنے ججمانوں کی بھی کنایت اور پردہ داری کرتے تھے۔ پلاؤ پکایا اس کی بوٹیاں الگ سے نکال لیں، کچھ گھی بھی نچوڑ لیا اور وہی، بوٹیاں اور گھی قلئے اور ساگ میں ڈال کر دوسالن مہمانوں کے آگے رکھ دیے۔ بس پھر کیا تھا ججمان غش غش کر گیا۔

اب پچھلے دنوں کا ایک قصہ سنئے ۔ ایک نئے فیشن کے گھر شادی ہوئی تھی ۔ میں تو اپنے ججمانوں کے سوا کسی دوسرے کے جاتا نہیں ، لیکن ایک ججمان نے ہی سفارش ، میں چلا گیا ۔ بابو صاحب نے حکم دے دیا کہ نائی جو سامان اور مصالحہ مانگے ، اسے دے دیا ۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق مالک کی خیر خواہی اور بچت کے خیال سے وہی ہیر پھیر یہاں بھی کیا ۔ پھر کیا ہوا ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ بابو صاحب غصے میں بھرے ہوئے چولہوں کے پاس آئے اور مجھے ہزار ہا بے نقط سنا ڈالیں ۔ کم بخت ، خاندانی نائی بنا پھرتا ہے ۔ پورا سامان لے لیا ، پورا مصالحہ لے لیا اور پلاؤ میں گھی نہیں ، سالن میں لذت نہیں ، برادری کے لوگ کیا کہیں گے کہ کس فاقوں مرے گھر میں دعوت کھانے گئے ۔ کم بخت تو نے تو میری ناک کٹوا دی ‘‘ ۔ اب میں ہوں کہ ششدر کھڑا ہوں ۔ یا الٰہی نیکی برباد گنہ لازم سامان اور مسالہ میں خود نہیں کھا گیا ۔ گھر نہیں لے گیا ، بچا ہو یہیں رکھا ہے اور یہ بابو صاحب ہیں کہ شکر گزار ہونے کی جگہ الٹی میری جان کو آ رہیں ہیں ۔ اس دن سے کانوں کو لگایا کہ فیشن کے گھرانوں میں جا کر جھانکوں گا بھی نہیں ۔ مجھے اپنے ڈھنگ کے ججمان ہی کافی ہیں ۔ اس سے نہ سمجھ لیجئے کہ میں دولت مندوں کے ہاں کھانا پکانے سے عاجز ہوں ۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خاندانی نائی ہوں ۔ میرے بزرگ بادشاہوں کی نائی تھے ۔ اب نہ بادشاہی رہی نہ نائی رہ گئے ۔ آج کل جو شادی بیاہوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں ، ان کی حیثیت مجھے خوب معلوم ہے ۔ میرے گاؤں کے سارے ہی چودھری لالہ پکوڑی شاہ کے قرض دار ہیں ۔ چودھری اپنے گھر کو آگ لگا کرتا پیں تو تاپیں ، مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا کہ قرض لیے

ہوئے روپے کو بے دردی سے خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک مجھ سے کفایت ہو سکتی پوچھے گچھے بغیر کر دیتا ہوں۔ باقی پکانے کو پلاؤ، بریانی متنجن، مزعفر، قورمہ، روغنجوش، ہر قسم کا سلن، مچھلی، مرغ فیرنی ہر چیز پکا سکتا ہوں۔ البتہ انگریزی شوربا نہیں پکا سکتا، میٹھے ٹکڑے پکا سکتا، پڈین بنانی نہیں آتی۔ یہ چیزیں نہ ہمارے دادا کے وقت میں تھیں نہ کسی ہمیں سکھائیں نہ خدا ایسا موقع لائے۔

ایک زمانے تھا بڑے امیر لوگ اپنے خاندانی معتبر نائیوں کو اپنا رازدار سمجھتے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے سے نازک معاملہ اور کیا ہوگا اور کیا ہوگا۔ لڑکے کے لیے لڑکی والوں ہاں پیغام لے کر جانا اور لڑکی کے لیے لڑکا تلاش کرنا، پھر لڑکے لڑکی کی شکل صورت مزاج سبھاؤ، ماں باپ اور طبیعت کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کرنا اور بہم پہنچانا، پسند کی صورت میں شادی کی شرطوں کا فیصلہ کرنا، تاریخ مقرر کرنا، غرض یہ کہ سارے کام خاندان کے معتبر نائی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ ہزاروں کا زیور، کپڑا صندوق میں بند کر کے نائی کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور کیا مجال کہ ایک سوئی بھی ادھر سے ادھر ہو جائے۔ اسی لیے تو معتبر کا لفظ نائی کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ چسپاں ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کل ٹٹ پونجیے نائی بھی ہیں جن کا سارا نائی پن صابن لگا کر ڈاڑھیاں مونڈنے ہی تک محدود ہے۔ ذرا کسی ایسے نائی کے ہاتھ کسی دوست کے پاس دیا سلائی کی ایک ہی ڈبیہ ہی بھیج کر دیکھئے۔ رستے میں بیچ کر اس پیسے کا پان نہ کھا جائیں تو میرا نام علیاء نہیں کچھ اور رکھ دیجیے۔

صرف شادی بیاہ پر ہی موقوف نہیں، عام پیغام رسانی بھی ہمارے سپرد ہوتی تھی۔ بڑے بڑے معزز آدمی اپنی بیٹیوں کو سسرال سے بلانا چاہتے تھے اور گھر کا کوئی آدمی فارغ نہ ہوتا تو یہ کام بھی معتبر نائی سپرد کیا جاتا تھا۔ اسی اعتبار کی وجہ سے ہم لوگوں کی عزت کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہندو ہمیں راجہ اور مسلمان ہمیں خلیفہ کہتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک راجہ کے بیٹے اور ایک نائی کے لڑکے میں بحث ہوگئی۔ راجہ کا بیٹا کہتا تھا کہ میرا باپ بڑا ہے، نا ءی کا لڑکا دعوی کرتا تھا کہ میرے باپ کا مرتبہ تیرے باپ سے بھی اونچا ہے۔ راجہ کا بیٹا نے کہا تو نے دیکھا نہیں ساری دنیا میرے باپ کے آگے سر جھکاتی ہے، نائی کے بیٹے نے برجستہ جواب دیا کہ تو نے دیکھا نہیں کہ تیرا باپ جب حجامت بنواتا ہے، تو میرے باپ کے آگے سر جھکاتا ہے، لیکن زمانے کا الٹ پھیر تو دیکھو، اب یہ بات بھی جاتی رہی۔ حجامت بنوانے والا کرسی پر بیٹھتا ہے، سامنے طباق سا آئینہ دیوار سے لگا ہے اور نائی اس کے دائیں بائیں بلائیں لیتا پھرتا ہے۔ اب تو وہ سر جھکانے کا معاملہ بھی نہیں رہا۔ غرض یہ کہ کس چیز کو روؤں جھما نو! دل اپکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ تم کو اپنے حال کی طرف متوجہ دیکھا تو دو باتیں کر لیں۔ پرانی شان نہ رہی، پرانی آن نہ رہی۔ پرانی باتیں نہ رہیں، اگلے دن نہ رہے، اگلی راتیں نہ رہیں، لیکن آج کل کے زمانے کے اناڑی پن کو دیکھتا ہوں۔ آج کل کے نائیوں کا ناکارگی اور بددیانتی کو دیکھتا ہوں تو دل فخر سے بھر جاتا ہے اور گردن اونچی کر کے کہتا ہوں کہ آخر میں ایک معتبر نائی ہوں، نائی تو اور بھی ہوں گے، لیکن میرے خاندانی اور معتبر میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

نیاز فتح پوری

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

دنیا میں سانپ اور مولوی دو ایسی چیزیں ہیں جن کی قسموں کی کوئی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخر الذکر کا یہ حال ہے کہ

ہرا	کر	جامہ	مولوی	ببینی
درو	مش	صد	ہزار	مارا	نگار

مسجد کے ملا سے لے کر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس مولانا تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے۔ایک چیز الا ماشاء اللہ سب میں مشترک پائی جاتی ہیں اور ان کے ظاہر و باطن کا تضاد ہے یعنی جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا باطن مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی ''ہیئت وضع'' جس میں اس کا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف وگا ہے بگاہے تانبا گوش، لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بر دتر سیاہ، داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب و رومال اور ''ناسدانی'' کے سب کچھ شامل ہے ایک ایسی پیٹنٹ وضع ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا منجانب اللہ اس پر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور پلاؤ مہیا ہوسکتا

ہے، وہاں اپنا سلسلہ ارشاد ہدایت دراز کردے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

مولوی کی اولین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کی بوریوں پر نظر آتی تھی۔ اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے ''موجودہ مولوی'' اسی ''گزشتہ مولوی'' کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو ''نفسیات مولویت'' سے بحث کرنا چاہے گا اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کے ابتداء ظہور سے آغاز کرے۔ علمی و اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کرنے کی اہمیت کا اندازہ یوں کرسکتے ہیں۔

مثلاً میرے محلّہ میں بہت زمانہ ہوا کہ ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلّہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بن جاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا، لیکن ان کی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقر عید، شبرات میں عیدیاں، بقر عیدیاں وغیرہ بپاس خاطر عزیز سلمہ لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے اوپر نیچے تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں۔ کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد تھی کوئی سفید تھیں اور کوئی سبزی مائل۔ ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر

سے آئے تو کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے۔ پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ رنگ کی جیب میں ڈال دی، کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لے آیا اور انہوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں انڈیل لیا۔ الغرض شام کو وہ جب گھر جاتے تو مولویائن اور ملازادوں کے لیے بقال کی اچھی خاصی دکان بن کر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لیے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ایم ماہر نفسیات غور کرے گا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور وہ آگے چل کر کس قسم کے ''افرادِ قومی'' بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود ہو گئی ہے، لیکن اس کی اولاد یا تلامذہ کے سلسلے میں جو مولوی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تین بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ دسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاست میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قائد و رہنما بن گئے ہیں۔

اول الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامہ محفل ہوتی ہے جس میں یہ ایک مغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور طلبہ مغبچوں کی، رہی بے ضرری سو اس کا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلّہ والوں کی خیرات اور

سویم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علو حوصلگی معلوم، اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جس میں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب وہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے دھکیلتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد وہ سوائے اذان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اول الذکر قسم کے مولویوں میں جو افراد ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے ''مشایخانہ'' حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی ''مشقِ سخن'' شروع کرتا ہے۔ اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں گھڑے ہوئے کاذب افسانے مزہب و بانیٔ مزہب کے متعلق سنا کر اول اول علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کی طرح قائم کرتا ہے تو سراً و علانیہ مرشد ہادی بن کر اپنے ارادات مندوں اور مریدوں کے رجسٹر کھول لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۷۳۰ مرید اس کو حاصل ہو جائیں تا کہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی ہر ایک مرید سے وصول کرے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کی اوسط پڑ جائے۔ یہ طبقہ نہایت ''خوش خور'' خوش پوشاک'' ہوتا ہے، اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اس کے ذوقِ شکم'' کو پورا کرنے والی مل سکتی ہے تو پھر اس کے دستر خوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے۔

صبح کا ناشتہ:۔ نماز کے بعد کشمیری چائے، سیر بھر دودھ اوٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین ابلے ہوئے انڈے

،چار کباب۔

دوپہر کا کھانا:۔مرغ کا قورمہ،مرغ پلاؤ،بریانی،پسندے،باقر خانی،مزعفر، اور بالائی۔

سہ پہر کا کھانا: سادہ چائے اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا: وہی جو دوپہر کو،مگر شامی کباب کے ساتھ اور بھنی ہوئی مچھلی کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام میں پہنچ گئے ہیں جہاں یہ اشیا فراہم نہیں کرسکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ آج کل جلالی عمل کا چلہ کھینچ رکھا ہے اس لیے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورری کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ زرِنقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے(جو بعد کو گھر پہنچ کر مولویائن کے دوپٹے اور ملازادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے،لیکن قمیض،اچکن،تہمد اور رازار بند کے لیے طرح طرح کے موتی اور ریشمی کپڑے تحفتہً آتے رہتے ہیں اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کی تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔خدا ایسا قہار ہے،ایسا جبار ہے،اس نے جہنم اتنا وسیع بنایا ہے وہ یوں اژدہوں سے ڈسواتا ہے،اس طرح آگ میں جلاتا ہے،مگر ہاں وہ جس کی

شفاعت رسولؐ اللہ کردیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا قہر مانی وجعہ اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولانا اس کے وزیر باتدبیر، ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود ہی اپنی ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا۔ امسال باراں میں یوں پانی برسا دیا۔ فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا۔ جنات کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کیسر سے آسیب کو یوں دور کرا دیا، وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوق موسیقی بھی ہے تو شب کے اول حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ورنہ شام ہوتے ہی مولانا کا جائے قیام مردوں کے لیے ''ممنوع الدخل'' ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لیے وقف سمجھا جاتا ہے۔ پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ڈری ہوئی سہمی ہوئی آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پر گوشت بنا ہوا ہے اسے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو تعلیم و تلقین خصوصی کے لیے طلب فرماتے ہیں، پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں ''قاب قوسین اوادنی'' سے کم نہیں اس لیے یہاں کے راز اول تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً ''کل یوم ہو فی شان'' اور ''اللہ جمیل و یحب الجمال'' کا وعظ شروع ہو جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو آلہ تفریح بنانے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی کا رگاہ قائم کرتا ہے تا کہ ملک کا سیاسی قاید و رہنما تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک اصلاح ملک وقوم کا تعلق ہے ان کا کارنامہ بالکل صفحہ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب وفساد کا تعلق ہے اس طبقہ کا وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہم اُفعی کہہ کر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا کی کھدر پوش ہوتا، دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی واستبداد کا عدو، ترقی کا حامل، تنزل کا دشمن، ''اور یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا'' سبھی کچھ اپنے آپ کا ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعوں کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام مقالات حریت، اس کی تمام شعلہ بیاناں اس کی جملہ سورج پرستیاں صرف حبِ جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اس کا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کیا اونچے اونچے درجوں میں سفر کرے۔ وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہنچانے جائے۔ جہاں پہنچے وہاں رسمِ مشایعت کے لیے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جا ئیں، اس کی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لے جائیں۔ جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کی طرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کے سلام قبول کرتا جائے اور جائے قیام پر ہر طرگ زائرین کی آمد و شد سے میلہ سا لگا رہے۔

یہ اپنے آپ کو سیاست کا ماہر، نظام عالم کا ''استن حنانہ'' اور گردشِ ارضی کا محور

سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولانا بہت کم خطرے میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ بھی جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آئندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفہ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلوسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہنچتا ہے تا کہ جس وقت وہ پہنچے تو سارا مجمع جو اس کا منتظر ہے گردن اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھنے لگے وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسندوں اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامن دراز کرتا ہے۔ وہ دورانِ جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے، گویا وہ اس ساری جماعت کا قائدِ اعظم ہے، اس مشین کا گورنر اسپرنگ ہے۔ جس پر پرزوں کی باضابطہ گردش قائم ہے۔ مولانا، مولانا کی آوازوں سے اس کا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ دستِ بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جا کر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے۔ صرف اسی کی ذات سے یہ حال ہے اس کی پبلک زندگی کا۔ لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے! اپنے متعلقین کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہے، لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے۔ اس کا حال اس کی غریب بیوی سے پوچھئے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے، بچوں، خادموں اور ازراہ سے دریافت کیجئے کہ یہ اپنے آپ کو ''خدا کا بیٹا'' کہتا ہے کہنے والا کس طرح کا باپ، کس قسم کا آقا اور کس انداز انسان ہے۔ اس کا مذہب یکسر خود پرستی،

اس کا دین وایمان سراسر کبرہ غرور اور اس کی ذات از سرتا پا یادگار ہے ان فراعنہ کی جن کا حال تو کتابوں میں ہم کو نظر آ جاتا ہے، لیکن صورت ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

اس قدر تمہید کے بعد مجھ کو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ میرے تجربات مولویوں کے متعلق اس قدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ادبی حیثیت سے کم پر لطف نہیں ہے۔

۲۵ جولائی کو میں ہندوستانی اکاڈیمی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہنچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب، اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خدوخال کی کشمیریت اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچکیلی نزاکت، یہ سب باتیں اس کی خوش سلیقگی، متانت وسنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھی کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور صبر کر لیتا ہوں۔ میرے لیے

موقع تھا۔ کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور بہت قریب ہو کر بیٹھ جا تا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترامِ نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی سے گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لیے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں بستر اجام بدستے وسلبوئے بدست اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لے کر بلا پس وپیش اپنا محاذ انہوں نے اسی جگہ قائم کرلیا جس کو میں نے قصداً چھوڑا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع وصورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین آ گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے۔ لیکن اتفاق سے ایک وکیل صاحب بھی اسی درجہ میں ان کے شناسا مل گئے اور انہوں نے مولونا کے لفظ سے خطاب کر کے اور مہر توثیق ثبت کردی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی، لیکن صحت ماشاللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی تاب اور داڑھی کے خضاب جو ہر چند طاؤسی ہو گیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح وسالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج تھا۔ غالباً عملِ جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اس کا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اس قدر اپنے سے قریب دیکھ کر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت مخفی تبسم کے ساتھ اس نے اپنے شوہر کو دیکھا اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا اندازہ اس طرح قائم کیا کہ چہرہ اسی کی طرف رہے اور اس کے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح چمک رہی تھی ،نگاہ او جھل نہ ہو، جب وہ اپنے نشانہ ہدف سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے اپنے آپ پر گلچینی جمال کو حلال کریں، لیکن بد قسمتی سے ایک صاحب جوان کے شناسا تھے۔ الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انہوں نے اور مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہر چند مولانا کی چین پیشانی کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لے کر اس کا مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور ان کی توجہ مراقبہ کو صدمہ پہنچ رہا ہے، لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابو الہول کی لحد معلوم ہو تے تھے، اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر کی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے، لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ عزیز کو انہوں نے بیکار نہیں جانے دیا۔ وہ باتیں کر تے تھے، مگر نگاہ کا سمت نہیں بدلتا تھا، وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب بھی دیتے تھے، مگر ہر جواب کے دوران میں اس ''سرمایہ جان'' کو بھی ضرور دیکھ لیتے تھے ۔وہ کوشش کر کے اپنے ہاتھ کی معیوب و کج انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا خاتون اس عجیب کو دیکھ لے۔ وہ آواز میں ایک خاص قسم کا لوچ پیدا کر کے گفتگو کر تے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں جھنکاری پیدا کرنے کی سعی فرماتے تھے۔ وہ اپنی خوش دلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امرت کا ثبوت دینے کے لیے کبھی کبھی لطائف

بھی کہتے، فارسی کے اشعار بھی پڑھتے، بڑے بڑے لوگوں کے نام اوران سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں اور بھائی میرا مسلک تو یہ ہے کہ ''با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام''۔رام رام کہہ کر جس وقت مولانا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے کو دیکھ رہا تھا، آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکزِ اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کے تینوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا، مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے بھی مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب، الغرض مولانا کے تمام تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انہی لوگوں میں سے ہیں جو

ایں کار را بہ شیوہ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح اس بات کا یقین ہو گیا کہ مولانا کی خوش طبعی اب کافی طور پر بڑھ گئی ہے اور انہیں وثوق کامل ہو گیا ہے کہ سارے درجہ میں صرف انہی کی ذات ایسی ہے جس پر پردہ دار خاتون مائل ہو سکتی ہے (ہو سکتی ہے کیا ہو گئی ہے) تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر بہ ادب عرض کیا کہ ''اگر جناب اجازت دیں تو چند مسائل حضور سے دریافت کروں جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں''۔

وہ یہ سن کر دفعتہً چونک پڑے اور بولے۔۔۔''ہاں ہاں کہیے ہم لوگ اسی لیے ہیں''۔اور یہ کہہ کر خاص پندار کے ساتھ اس کی طرف دیکھ لیا۔

میں عرض کیا کہ ''مجھے معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب صرف عالم ہی نہیں بلکہ شاعر اور ادیب بھی ہیں جیسا کہ آپ کی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے اور

اسی بناء پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرات ہوتی ہے کہ کیا ''غنا خانہ'' اور ''حسن رہگذرے'' سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے؟''

یہ سن کر ان کے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی سرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدل کر بولے کہ ''آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا کیا حق حاصل ہے''؟

میں نے کہا کہ ''بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں؟ میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھا ہوں کہ کہیں آخرت میں باز پرس نہ ہو''۔

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ ''یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی''۔

میں نے کہا۔ ''بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صور کیسی ہوتی ہے، سامنے ہی موجود ہے، صراحت کی ضرورت نہیں، لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں اور آپ کو اس کا جواب عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے دینا چاہئے۔ عام اس سے کہ میری ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی

ہے یا شوہر بننے کی۔۔۔''

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہو گیا اور وہ آستین چڑھا کر بولے کہ ''تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھیں میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں''۔

میں نے عرض کیا کہ ''میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں''۔

اس تنقید کی وہ تاب نہ لا سکتے تھے، بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ'' جانے دیجئے آپ بزرگ ہیں، اپنی طرف خیال کیجئے''۔ اور ''چھن چنا''۔ میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور جب چند منٹ بعد سکون ہوا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ ''مولانا اگر غصہ فرد ہو گیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو''۔

یہ سن کر سارے درجے والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے۔ وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کی ''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑیے، میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا''۔

میں نے کہا کہ۔۔ ''یہ بات شرعی مسئلہ ہے اور آپ کو بتانا پڑے گا''۔

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انہوں نے کہا کہ ''مولانا کیا حرج ہے، آپ کیوں نہیں بتا دیتے''؟

مولانا بولے کہ ''آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بے وقوف بناتے ہیں، ورنہ کیا یہ خود

نہیں سمجھتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرح ۔۔۔۔"

میں نے کہا "نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تو صرف گمان ہی تھا، لیکن آج یقین ہو گیا کہ غنائے خانہ، ہمسایہ جائز ہو یا نا جائز لیکن "حسن رہگذرے" سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے"۔

مولانا بولے "یہ کیونکر آپ کو یقین ہو گیا"؟

یہ سن کر میں ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

مولانا غصے میں اٹھے اور لوٹا لے کر منہ بناتے ہوئے بیت الخلاء چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے اس لیے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی سرخ بندی کا استعمال کرے تو وہ ہندو ہو جائیں گی، آپ کا کیا خیال ہے"؟

مولانا نے فرمایا "بے شک بیندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہئے"۔

میں نے عرض کیا "لیکن مولانا! یہ تو آپ نے بھی دیکھا کہ ہے بڑی چیز اور خاص کر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے"۔

مولانا نے کہا "حقیقت ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش"۔

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آ گیا جہاں مجھے اترنا تھا۔ مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا، لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جا کر میں نے کہا کہ "مولانا خدا کے لیے صرف ایک بات کان میں سن لیجئے" مجھے بڑے حیرت ہے کہ انہوں نے کہنا مان لیا اور جب انہوں نے کھڑکی کے پاس آ کر اپنے کان قریب کیے تو میں نے عرض کیا

کہ ''مولانا اس میں شک نہیں کہ چیز اچھی ہے کیا رائے ہے''؟

یہ سن کر انہوں نے میری گوشمالی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

اکاڈمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور اس دس منٹ کے راستے میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا وہ مولانا کا واقعہ تھا، بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا:

اگر بہ دل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

مشتاق احمد یوسفی

پڑیے گر بیمار

تو کوئی نہ ہو تیماردار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہو تو بیمار پڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہوں تو بہ کیجئے! مرنے کا یہ اکل کھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ تو کچھ مشرق کا ہی حصہ ہے۔ اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسرِ شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشن گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے، اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ بھی نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان اس کے فنی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں خواہ وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی اکڑا کر کے مر جائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرا لے تو وہ لوگ سال نہ سہی، ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھوم سے اس کا عرس منایا کرے۔ البتہ دقت یہ ہے کہ اس قسم

کی سعادت دوسرے کے زورِ بازو پر منحصر ہے اور سعدی کہہ گئے کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبت دوزخ کے برابر ہے، پھر اس کا علاج کیا کہ انسان کی موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ورنہ سر دست مجھے ان خوش نصیب جواں مرگوں سے کوئی سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف ہیں۔ میرا تعلق تو اس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر

جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

چنانچہ اس وقت میں اس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے جو موت اور زندگی دونوں سے تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔۔۔ یعنی بیماری! میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف ہے جسے

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا

میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمہ علالت ہے۔ اسپرین صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے، لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس دردِ لا دوا کی لذت سے آشنا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کی بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائیں جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آ جائے گا۔

اردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی نمایت ’’تقریب بہر ملاقات‘‘ کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا

تھا، اور ہر سمجھدار آدمی اسی امید پر بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آ نکلے۔

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اس زمانے کے اندازِ عیادت میں کوئی دل نوازی ہو تو ہو، میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المرض کے لیے ''مزاج اچھا ہے؟'' ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی جملہ ہے جو ہر بار اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسشِ حال سے اس قدر بیزار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر چکا ہوں کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ میں آج اچھا ہوں، مجھے حسبِ معمول بیمار ہی سمجھئے اور مزاج پرسی کر کے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیجئے۔

سنا ہے کہ شائستہ آدمی کی پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوائی نہ بتائیں۔ شائستگی کا یہ سخت معیار تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجئے کہ مجھے زکام ہو گیا ہے، پھر دیکھئے، کیسے کیسے مجرب نسخے، خاندانی چٹکلے، اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی اصل وجہ طبّی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاقِ سلیم کی کمی۔ بہر حال، بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح و مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا ہے۔ اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مدعا صرف اپنے علل پر غور کرتے ہیں اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں، اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے، آپ خود لائق ہیں۔۔۔۔ سرفہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں، نہ دوا تجویز کرتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر المزاج ہیں دراصل ان کا تعلق اس مدرسہ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ و موید ہیں کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ جس طرح بعض اعتقد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے، اسی طرح طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفی خون تصور کیا جاتا ہے چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدے اسی امید میں نوش جان کیے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردان صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذ

ار سیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکل تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے:

''فمِ معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھایئے۔ دافع نفع ومحلل ورم ہے''۔

میں نے پوچھا۔۔۔''آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟

فرمایا ''کیا مطلب؟''

عرض کیا۔''دو چار دن مونگ کی دال کھالیتا ہوں تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کر کیا کروں گا؟

بولے ''آپ تجارت اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں ترازو تھی''۔

گزارش کی۔۔۔''اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی!''

بات انہیں بہت بری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف، میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے، اسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں، سچ

پوچھئے تو عمدہ غذا کے بعد مجھے تو کم از کم بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کر ہر راہ گیر کو سینے سے لگالوں۔

دوسرا گروہ قوتِ ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت ان سترے بہترے بزرگوں کی ہے جو گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں۔ اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج تعویز گنڈوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عبادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرستش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے نمو جب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی تھی اور میں بھی صاحبِ فراموش ہو گیا تھا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرہ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لاکر رازدانہ انداز میں کچھ ایسے منجی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گھگھتے ہوئے

رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے بلبلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے۔ کپکپا کر وہ کہنے لگے ۔۔۔۔ ''بیماری آزادی میں بڑی غیریت برتتے ہو، برخوردار! گھٹنے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہوا اور مجھے خبر تک نہ کی''۔

بہتیرا چاہا کہ اس دفعہ ان سے پوچھ ہی لوں کہ ''قبلہ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کر دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے''؟

ان کی زبان اس قینچی کی طرح چلتی تھی جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہے۔ مجھے ان کی ڈانٹ پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ کیونکہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ اور رڈاڑھی کو علیحدہ کر دیا جائے، یا بصورتِ نقصِ امن، ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغو معلوم ہو گی۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انہیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا تھا اور خسرہ میں ٹائیفائڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے، وہاں بے دھڑک بگل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے انا للہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ ان کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

''میاں یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح
نبض پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو۔

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''بیمار مباش کچھ کیا کر''

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

کمزور میری صحت بھی ، کمزور مری بیماری بھی
اچھا ہوا جو ہوا کچھ نہ کر سکا ، بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو در کنار، مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال جواب کے لیے اٹھ بیٹھتے ہیں۔تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔میں انہیں یقین دلا تا ہوں کہ اگر خودکشی میرا منشا ہوتی تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا، بلکہ آنکھ بند کر کے ان کی تجویز کردہ دوائیں کھالیتا۔

آیئے، ایک اور مہربان سے آپ کو ملاؤں۔ان کی تکنیک قدرے مختلف ہے ۔میری صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ان کا معمول ہے کہ کمرے میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہو جاتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیے بغیر تیمارداروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔پھر کھسر پھسر ہو تی ہے البتہ کبھی کبھی کوئی اچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا۔مثلاً:

''صدقہ دیجیے۔جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے''۔

''پانی حلق سے اتر جاتا''؟

''آدمی پہچان لیتے ہیں''؟

یقین جانیے۔ یہ سن کر پانی سر سے گزر جاتا ہے اور میں تو رہا ایک طرف خود تیما
ردار میری صورنہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران ایک دو دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضلِ تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں، مگر وہ اس مسئلہ کو قابلِ دست اندازی مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلانِ صحت اور ان کی پرزور تردید سے تیمارداروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا۔ یوں بھی اگر بخار سو ڈگری سے اوپر ہو جائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں جسے بیگم، اقبالِ گناہ اور رشتے دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ حضرات مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پرسا دینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ اب بس چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آ جائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال آ جاتا کہ شاید آخری پسینہ ہے اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں اس کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے، بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسلِ صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں، جن سے غالب کو فکرِ وصال میں دوچار ہونا پڑا۔

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ، ہو تو کیوں کر ہو

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقہ جاریہ ہو کر رہ گئی۔ارشاد ہوتا ہے خالی بیمار پڑ جانے سے کام نہیں چلتا۔اس لیے کہ پسماندہ ممالک ہیں۔

فیضانِ علالت عام سہی ، عرفانِ علالت عام نہیں

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آ نکلے۔اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے فیوض و برکات پر ایسی موثر تقریر کی بے اختیار جی چاہا کہ انہی کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ان کے دیکھے سے میرے تیمار داروں کے منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے ،مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں ، کیونکہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لیے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں ہوتی ،لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیئے ۔۔۔۔چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار کا نہیں۔اس لیے میں مرزا کے انداز عیادت کی طرف لوٹتا ہوں ۔وہ جب تندرستی کو ام الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ملکوں میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔میں کان کے درد سے نڈھال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ بیان کر کے میری ڈھارس بندھائی:

"میاں ہمت سے کام لو، بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے"۔

میں درد سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے، میں بغیر دعویٰ نبوت یہ عذاب جھیلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ علاوہ ازیں قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یاد نہیں آرہا تھا کہ کون سے پیغمبر بے کان کے درد کے باوجود فرائض نبوی انجام دیتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہ تفنن مرزا سے کہا۔ "فرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحب استطاعت مرد اس وقت تک "جنٹلمین" ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ بہ جنسی امراض میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے"۔

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے ۔۔۔ "خیر! یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے"۔

وہ ٹھہرے ایک جھکی۔ اس لیے میں نے فوراً یہ اقرار کر کے اپنا پنڈ چھڑایا کہ مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اٹھ رہا ہو"۔

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے، میں گرم پانی کی بوتل سینک رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تا کہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لیے زندہ ہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گور غریباں کا

گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکنے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور عشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں مبتلا تھا) یاد کر کے کچھ اس طرح آب دیدہ ہو گئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی، میرے لیے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انہیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیب القلب واقع ہوا اور طبیعت میں باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد ''جب لاد چلے گا بنجارا'' والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا کوئی ''کامک'' یا با تصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہولہان ہو رہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفارم سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یاسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگو دانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں ہیں، سنا کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحدِ نظر کافور میں لبسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ جابجا لوبان سلگ رہا ہے اور میرا سر سنگِ مرمر کی لوحِ مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جا رہی ہے

۔میرے منہ میں سگریٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرمامیٹر ہے۔آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے۔میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا ہے۔

لگے ہاتھوں، عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرادوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالمِ نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے RUNNING COMMENTARY کرتا رہے گا۔ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی کسی طرح مریض پر ثابت کردیں کہ وہ محض احتیاطاً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ان کی مثال اس روزخور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ملاقاتی: ماشاللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں بھی بڑا کرارہ پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کردیا ہے۔

ملاقاتی: (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگما! یہ صحت یاب ہو جائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے (مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی

شہتیر معلوم ہوتا ہے، مگر یقین جانیے، آپ کا شگاف تو بس دو تین انگلیاں لمبا ہوگا، میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کھنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض: (کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی: (ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض: یہ پاس والی چارپائی، جو اب خالی پڑی ہے۔ اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا۔

ملاقاتی: ارے صاحب! مانیے تو (آپ بالکل ٹھیک ہیں)۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی: (روہانسی ہوکر) دو دفعہ دھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔

اس وقت ایک دیرینہ کرم فرما یاد آرہے ہیں۔ جن کا طرز عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بنا کر آتے ہیں کہ خود ان کی عیادت فرض ہو جاتی ہے۔ "مزاج شریف"! کو وہ رسمی فقرہ نہیں، بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دن منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں "مزاج"! کے بجائے "سب خیریت ہے"؟ سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے "اس جہان شریت میں خیریت کہاں"؟ اس مابعد الطبیعاتی تمہید کے بعد کراچی کے خراب موسم کا ذکر آنکھوں میں آنسو بھر کر ایسے انداز میں کیا کہ گویا ان پر اسرار ذاتی ظلم ہو رہا ہے۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی یادگار زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکورہ الصدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی عمر وہ اپنے دمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سویز سے انگریزوں کے نہر بدر کیے جانے کی تاریخ وہی ہے جو ان کا پتا نکالے جانے کی! میرا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اٹھنے لگتے ہیں تو اطلاعاً اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں، مگر ایک فائدہ بھی ہے وہ یہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہا جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں سے لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے ''خوفِ فسادِ خلق'' سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں ''ہوالشافی'' کہہ کر بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہیں۔ میری عقل داڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپیہ سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

''ہیں آپ بھی ضدی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی''۔

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آ گئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''بھائی میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا! آپ ہی بتایئے، کیا یہ

تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے''؟

ہنس کر فرمایا۔۔۔''بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔کرائے کے مکان میں تندرستی کیونکر ٹھیک رہ سکتی ہے''۔

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سن لیجئے۔جھوٹ سچ کا حال خدا جانے،لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو ماہ قبل ان کے گلے میں خراش پیدا ہو گئی،جو ان کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھر والوں کے نزدیک سگریٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔شروع میں تو انہیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہو تی؟ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی (HUSKY) آواز میں بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔خدا کی دین تھی کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی۔ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں جب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔لہٰذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں گڑگڑا گڑگڑا کر،بلکہ خنخنا خنخنا کر دعائیں مانگیں:

''بارِ الٰہی! تیری شانِ کریمی کے صدقے،یہ سوزش بھلے ہی کم ہو جائے،مگر بھراہٹ یونہی قائم رہ رہے''!

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی نل کی طرح بھق بھق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی،کسی نے کہا کہ''لقمان کا قول ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کر لینے سے گلا خراب نہیں ہوتا''۔

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا ''سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہار منہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں '' اور ثبوت انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اور خیر خواہ نے اطلاع دی کہ زکام ایک زہریلے وائرس سے ہوتا ہے جو کسی دوا سے نہیں مرتا۔ لہذا جوشاندہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بقیہ روداد انہی کی زبان سے سنئے:

''اور جن کرم فرماؤں نے ازراہ کسرِ نفسی دوائیں تجویز کی ہیں۔ وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ کسی نے اصرار کیا کہ آیورویدک علاج کراؤں، بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ''حکیم نباض ملت سے رجوع کیجئے'' نبض پر انگلی رکھتے ہی مریض کا شجرہ نصب بتا دیتے ہیں (اسی وجہ سے کراچی میں ان کی طبابت ٹھپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ کر لیتے ہیں، آواز اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہئے۔

''غرضیکہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں! اور تو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینو گرافر (جو چست سویٹر اور جینز پہن کر، بقول مرزا عبدالودود بیگ کے، انگریزی کا S معلوم ہوتی ہیں) بھی مزاج پرسی کو آئی اور کہنے لگیں، حکیموں کے چکر میں نہ پڑیے۔ آنکھ بند کر کے ڈاکٹر دلاور کے پاس جائیے۔ تین مہینے ہو

ئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے املی کھا کھا کر گلے کا ناس مار لیا تھا۔ میری خوش نصیبی دیکھئے کہ ایک سہیلی نے ان کا پتہ بتا دیا۔ اب بہت افاقہ ہے؛

''اس کے بیان کی تائید کچھ دن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کیس کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں، چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اتروا کر انہوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا علاج سے کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرنے جاتی ہے''۔

مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ علاج سے ڈاکٹر موصوف کا کافی افاقہ ہوا ہوگا!

کرنل محمد خان

یوسف ثانی

یہ قصہ ہے میرا اور میرے دوست یوسف کا۔ واقعہ سنانے سے پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام مسعود ہے اور میں ایک چھوٹا سا زمیندار ہوں۔ میرے دوست کا پیشہ مجھ سے مختلف ہے۔ کتنا مختلف؟ آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔

یہ آج سے کئی سال قبل کا واقعہ ہے جب ہم دونوں لاہور کے کالج میں پڑھتے تھے۔ یوسف میرے ہم جماعت تھے، لیکن آپ کی یوسفیت فقط آپ کے نام ہی تک محدود تھی۔ آپ کی شکل وصورت اس کے اثر سے یکسر محفوظ تھی۔ آپ کی ولدیت کی ترکیب میں بھی کوئی پیغمبرانہ عنصر نہ تھا۔ مشہور تھا کہ آپ کے والد ذرا بہتر قسم کے میراثی ہیں اور وہ فرزندِ لبند کو بھی اس نظریے سے ایسا شدید اختلاف نہ تھا، بلکہ وہ اپنی ذاتی کردار سے بھی پدری شہرت کو کمک پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی کام کو انجام دیتے ہوئے آپ نے اس خاکسار کو بھی تقریباً انجام تک پہنچا ہی دیا۔ تفصیل ذرا بعد میں۔

یوسف حسنِ صورت میں اور نجابت میں اپنے گراں قدر ہم نام سے بے شک ایک قطب کے فاصلے پر کھڑا تھا، تاہم رونق آفرینی میں ایک پیغمبرانہ شان رکھتا تھا اور میراثی ہونے کے باوجود ۔۔۔ شاید میراثی ہونے کی وجہ سے ۔۔۔ ہم جماعتوں میں مقبول ومحبوب تھا ۔۔۔۔ شریر تھا، وہاں ہنسی تھی، ہنگامہ تھا، قہقہے تھے

، پیچھے تھے ۔۔۔ اور ہاں یوسف میں ایک اور کمال بھی تھا: وہ پیدائشی موسیقار تھا ۔جب کبھی اتوار کی رات کو ہوسٹل کی چھت پر پر ستار بجاتا یا گانا گاتا، تو چلتے آدمی اور ٹوٹتے تارے رک جاتے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور سے پنڈی آنے والی گاڑی میں یوسف میرا ہم سفر تھا، لیکن آج خلافِ معمول خاموش، بلکہ فکر مند سا تھا۔وجہ پوچھی تو بولا:

''ایک مشکل آپڑی ہے۔کاش تم مدد کر سکو''۔

میں نے کہا:''یقیناً بشرطیکہ تم مدد جائز قسم کی مانگو''۔

بولا''جائز ناجائز کی پہچان تو شرعی مسئلہ ہے اور کسی مفتی کا سرٹیفکیٹ ساتھ نہیں لایا''۔

میں نے کہا:''تم بات تو کرو میں خود سرٹیفکیٹ دے دوں گا، بشرطیکہ ۔۔۔۔''

بولا: جس شخص کے منہ سے دو جملوں میں دو بشرطیکہ نکلیں، وہ وکیل ہو سکتا ہے، دوست نہیں ہو سکتا۔ مروت نام تھا جس کا گئی مسعود کے گھر سے''۔

اور یہ کہہ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

میں نے کہا۔۔''ارے ناراض ہونے لگے۔چلو مانگو کیا مانگتے ہو۔تمہاری خاطر تو ہم جان بھی دے دیں گے''۔

بولا:''ہوا وعدہ؟''

کہا:''ہوا وعدہ، مگر اب جلد بتاؤ، معاملہ کیا ہے''؟

بولا:''معاملہ ہماری شادی کا ہے''۔

''مبارک باد۔۔اور ہمارے ذمے کیا فرض ہے''؟

’’تمھیں دولہا بننا ہے‘‘!

’’تمہارا مطلب ہے شہ بالا؟‘‘

’’نہیں جناب! میرا مطلب ہے دولہا۔ مجھے دولہے اور شہ بالے میں تمیز ہے‘‘۔

’’یعنی شادی تمہاری ہوگی، دولہا ہم بنیں گے۔ اس مفلس کی بات بھی سمجھتے ہو‘‘؟

’’جی ہاں، آپ صرف دو گھنٹے کے لیے دولہا بنیں گے، عارضی دولہا‘‘۔

’’عارضی دولہا کیا شے ہوتی ہے؟ تاریخ میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے‘‘؟

’’تم ہاں کرو تو مل جائے گی‘‘۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے واقعی کوئی غیر شرعی وعدہ کرلیا ہے۔۔۔۔بہر حال اب فرار خارج از بحث تھا: کہا:

’’بہت اچھا۔ بتاؤ ہمیں کب اور کہاں اور کیوں عارضی دولہا بننا ہے‘‘؟

یوسف بولا: ’’آپ بے تاب نہ ہوں۔ ایسے نیک کاموں میں تعجیل مستحسن نہیں، ہاں تو عارضی دولہا آپ آج ہی بنیں گے (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی پنتالیس منٹ کے بعد یعنی گوجرانوالہ میں۔ یہ تو ہو گیا کب اور کہاں کا جواب۔ جہاں تک کیوں کا تعلق ہے، ذرا توجہ سے سنیئے‘‘۔

میں نے اپنا ہاتھ زانو سے اٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور اپنی تمام تر توجہ یوسف کے چہرے پر گاڑ دی، یوسف نے کیوں کی تشریح شروع کی:

تو صاحب مہربان! عرصہ دہ ماہ کا ہوا، اس حقیر فقیر نے حال سے مایوس ہو کر

اور مستقبل سے امید باندھ کر قصد شادی کا کیا اور ایک اخبار میں اشتہار ضرورتِ رشتہ کا بدیں مضمون دیا کہ ضرورت ہے خوش وضع و خوش اطوار نجیب الطرفین کنوارے رئیس زادے کے لیے، ایک زہرہ جمال، خوش اوقات، پابندِ صوم وصلوٰۃ، میٹرک پاس حسینہ کی اور سنہری موقع ہے نکتہ شناس والدین کے لیے جو صیغہ راز خط و کتابت کر سکتے ہیں''۔

پوچھا: یہ نجیب الطرفین رئیس زادے تم ہی تھے''؟

بولا: ''بے شک، یہ اسی خاکسار کا اشتہاری روپ تھا''۔

''پھر''

''پھر بیسیوں خط آئے۔ بیسیوں جواب گئے، لیکن ایک کے سوا جملہ والدین مع دختران عزیز، یکے بعد دیگے میدان چھوڑ گئے اور جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار، لیکن ان کا نام قیس نہیں، خان کرامت علی خان ہے۔ گوجرنوالے میں بستے ہیں اور عین اسی لمحے پھولوں کے ہار لیے سٹیشن پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم دن کا کھانا انہی کے ہاں کھائیں گے۔ دیکھیں گے، دکھائیں گے اور پھر دو گھنٹے بعد اگلی گاڑی سے سفر جاری رکھیں گے''۔

یہ فریب کاری ہے''۔

مگر بے ضرر ہے اور آخری مقصد نیک ہے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اور اچھے دوست بھی ایسا ہی کرتے ہیں''۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں''۔

''وہی جو میں کہوں، تم نے وعدہ کر رکھا ہے''۔

''اچھا اب بتاؤں مجھے دولہا کب بننا ہے''؟

''گاڑی سے اترتے ہی، پلیٹ فارم پاؤں رکھتے ہی تم یوسف ہو گے اور یہ خاکسار مسعود''۔۔۔

''آخر اس حرکت کی کیا ضرورت''؟

''تم نے اس خاکسار کا شجرہ نسب تو نہیں دیکھا،لیکن چہرہ تو ایک مدت سے دیکھ رہے ہو۔کیا کسی زاویے سے اس روسیاہ میں رئیس زادگی کے آثار نظر آتے ہیں؟ ذرا ایمان سے کہنا''۔

ایمان کی رو سے جواب نفی میں تھا۔میں نے کہا:

''ایسے آثار تو ناپید ہو چکے ہیں، لیکن ہمارے چہرے سے بھی کسی ریاست کا پتہ نہیں چلتا''۔

''آپ کتنے ہی بے توفیقے کیوں نہ ہوں، اس ناچیز کے مقابلے میں پرنس علی خان لگتے ہیں''۔

''یعنی تم ہماری شکل کا استعمال محض شہزادی کے محل میں داخلے کے لیے کر رہے ہو''؟

''بجا فرمایا حضور نے ،ورنہ اس رنگ ورخ کے ساتھ اس خاکسار کو سٹیشن سے ہی رخصت کر دیا جائے گا''۔

بھئی تم صاحب کمال آدمی ہو۔ہم تو محض نمائشی کھلونے ہیں''۔

''ابتدائی تعارف کے لیے شکل بڑی اکسیر شے ہے۔ کمالات بعد میں آتے ہیں''۔

''لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ پرنس علی خاں نے اگر سوئمبر جیت بھی لیا تو پرنس یوسف کو کیا ثواب ملے گا''؟

''پرنس علی خاں اس کارِ خیر کے بعد کنارہ کش ہو جائیں گے اور شہزادی کا ثواب اس غلام کے حصے میں آئے گا''۔

''اگر شہزادی نے ایصالِ ثواب سے انکار کر دیا تو؟ آخر وہ بھی منہ میں زبان رکھتی ہے''۔

''اللہ کا شکر ہے کہ زبان رکھتی ہے، ورنہ گونگی جورو بڑی نا قابلِ فہم مصیبت ہوتی ہے''۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ اس لڑکی میں کوئی خاص خوبی ہے جو اس قدر دیوانے ہو رہے ہو''؟

''کئی خاص خوبیاں ہیں، لیکن ایک عارضی دولہے کو اس میں دلچسپی لینی نہیں چاہیے''۔

میں نے ہار کر کہا:

''اچھا، کوئی آخری ہدایت میرے لیے؟ یا کوئی خاص حرکت جو مجھے کرنا یا نہ کرنا ہو''؟

''تمہارے ساتھ رہوں گا اور حسبِ موقع ہدایت جاری کرتا رہوں گا۔ تم بے فکر رہو''۔

''ٹھیک ہے، بے فکر رہوں گا''۔

بولا: ''بولا اب جاؤ، غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھو لو۔ سسرال قریب ہے

''۔

میں غسل خانے میں سے نکلا، تو گاڑی آہستہ آہستہ گوجرانوالہ کے اسٹیشن پر رک رہی تھی۔

خدا جانے یوسف اپنی اشتہاری سسرال کو کیا نشانی بتا رکھی تھی۔ میں گاڑی سے اترا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے معزز سے بزرگ، چند کم بزرگ ساتھیوں کے ساتھ میری طرف بڑھے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''میرا خیال ہے کہ محمد یوسف آپ ہی ہیں''؟

میں نے اصلی یوسف کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک مثبت مسکراہٹ کے ساتھ نگاہیں نیچی کرلیں اور میں نے اشارہ پا کر کہا:

''جی قبلہ، میرا نام ہی محمد یوسف ہے''۔

جیتے رہو، جیتے رہو۔ اچھا مجھے تو تم جانتے ہو ہی، میں کرامت علی خاں ہو۔ یہ سلامت علی خاں ہیں، حمیدہ کے ماموں۔ یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں فراست علی خاں۔ یہ انور ہیں، یہ ارشد، حمیدہ کے چھوٹے بھائی''۔

میں نے نقلی مسعود یعنی یوسف کا تعارف کرایا:

''یہ ہیں میرے عزیز دوست اور باکمال ہم جماعت، مسعود''۔

سب نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ یوسف نے جوابی گرمجوشی میں حسب عادت کچھ لطیفے بھی شامل کر دیے اور سب لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ انور اور ارشد کے ہاتھوں میں ہار تھے، ایک نے میرے گلے میں ڈال دیا۔ دوسرے نے یوسف کے گلے میں، سٹیشن سے نکلے تو ہمیں کار میں بٹھا دیا گیا، خان صاحب

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور ہم دونوں پچھلی نشست پر کار چلی تو خاں صاحب بولے:

عزیز، تمہارے خطوں سے ہم تمہارے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔صرف دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ماشاءاللہ،تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی''۔

میں نے برخوردارانہ لہجے میں آہستہ سے کہا:

''آپ کی عنایت ہے''۔

''اچھا بتاؤ۔خاں بہادر صاحب کا کیا حال ہے''؟

میرے منہ سے جھٹ نکلا:

''کون سے خان بہادر صاحب''؟

یوسف نے مجھے کھینچ کر کہنی ماری اور خان صاحب کو سنا کر مجھ سے کہا:

''خان صاحب آپ کے ابا کے متعلق پوچھ رہے ہیں''۔

میں نے یوسف کو قہر بھری نگاہ سے دیکھا اور دل میں کہا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو کسی فرضی خان بہادر کی فرزندی میں دے دیا تھا،تو مجھے معاف ہی رکھتے جی میں آیا، کہہ دوں کہ خان صاحب بہادر سارنگی بجا رہے ہیں، لیکن خاں صاحب سے بے تکلفی نہ تھی۔عرض کیا:

''اچھا آپ ابا جان متعلق پوچھ رہے ہیں؟ اچھے ہیں آپ کو سلام کہتے تھے''۔

''تو کیا وہ وطن لوٹ آئے ہیں؟ تم نے تو لکھا تھا وہ دو ماہ سے انگلستان میں علاج کرا رہے ہیں''۔

اب میرے ابا جان بخیریت تمام اپنے گاؤں میں چودھراہٹ کر رہے تھے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ فوراً یوسف نے کان میں سرگوشی کی۔

''خط خط خط''۔

چنانچہ میں نے کہا:

ابا جان نے آپ کو خط میں سلام لکھا ہے''۔

خان صاحب بولے: ''تو کیا وہ ہوش میں آ گئے ہیں؟ ان کے دماغ میں تو رسولی تھی نا؟''۔

یہ میرے صبر کی آخری حد تھی۔ میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا:

''قبلہ، وہ رسولی کا ذکر تو میں نے ان کے والد کی علالت کے ضمن میں کیا تھا اور وہ بے چارے اللہ کو پیارے بھی ہو چکے ہیں''۔

خان صاحب نے جھٹ انا اللہ پڑھی۔ یوسف سے اظہارِ تعزیت کی جو اسے قبول کرنا پڑی، پھر یوسف نے پورے زور سے مجھے کہنی ماری اور یہ اس کا حق تھا، اگرچہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔

اتنے میں خان صاحب کا گھر آ گیا۔ خان صاحب کھاتے پیتے اور بظاہر خوش ذوق آدمی تھے۔ ان کے دیوان خانے کی آرائش مشرقی انداز کی تھی۔ چاندنی، گاؤ تکیے، شمع دان وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز صاف شفاف چم چم کرتی ہوئی۔ ایک طرف چوبی تخت پر چند موسیقی کے آلات رکھے تھے: ستار، طبلہ ہارمونیم جیسے ابھی ابھی کوئی ریاض کرنے والا ہو یا کر کے اٹھا ہوا۔ یوسف کو اور مجھے ایک خاص مسند پر بٹھا دیا گیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ یوسف نے چھوٹتے ہی مجلس کو زعفران زار بنا دیا اور تمام حاضرین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہمارے چہرے سے بمشکل وہ خفگی کی تہہ

اتر ی تھی جو ابا جان کی فرضی رسولی سے پیدا ہوئی تھی۔

اتنے میں ایک خادمہ آئی اور حمیدہ کی والدہ کا پیغام لائی کہ لڑکے کو زنانے میں بھیجا جائے۔ خان صاحب نے ساتھ کے کمرے کی چق اٹھائی اور میرا بازو پکڑ کر اندر قدم رکھنے کو کہا۔ اندر قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔ کمرہ لڑکیوں سے بھر پڑا تھا، لیکن یہ بتانا مشکل تھا کہ حمیدہ کون ہے۔ اس کا حسن ایک علامتی گھونگھٹ سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا، کہ میں ہوں مہر عالمتاب میں ہوں، حقیقت منتظر، اور عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔ حمیدہ نے مجھے فقط ایک نظر سے دیکھا اور اک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ اس قتالہ کے قابل تو شاید اصلی پرنس علی خان بھی نہ تھے۔ بہر حال پرنس علی خان کی عدم موجودگی میں سر دست دو بامیدوار تھے: یوسف اور ہم! ہمارے نزدیک ایک میراثی زادہ یقیناً اس درشہوار کا سزاوار نہ تھا۔ یوسف بے شک ہمارا دوست تھا اور باہمی معاہدہ کی رو سے ہم محض عارضی دولہے تھے، تاہم اب وہ حالات نہ تھے جو چق اٹھنے سے پیشتر تھے۔ ہمیں کئی مقولے یاد آئے جن کی رہ سے ہم وعدے سے پھر سکتے تھے، مثلاً یہ کہ جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہے، چنانچہ ہم نے طے کر لیا کہ حمیدہ اب ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔ باقی رہے یوسف، تو ان کی شادی کسی معقول سی میراثن سے کرادی جائے گی۔

حمیدہ کی ماں نے بڑی شفقت سے ہمارا مزاج پوچھا۔ چند خواتین اور حمیدہ کی سہیلیوں سے ہمارا تعارف کرایا گیا، لیکن ہمیں عشق کے اس ناگہانی حملے میں لڑکیوں کے نام یاد رکھنے کا مزاج نہ تھا۔ اتنے میں حمیدہ کی ایک سہیلی نے، سالیوں

کے انداز میں ایک سوال کیا:

"چشمِ بددور، آپ کس جماعت میں پڑھتے ہیں"؟

میں نے کہا: "فورتھ ائیر میں"۔

دوسری بولی: ماشاللہ آپ کتنے سالوں سے فورتھ ائیر میں ہیں؟ دو سال سے؟ یا چار سال سے؟"

میں نے کہا: "ابھی تو ایک سال بھی نہیں ہوا"۔

تیسری بولی: "اری تم بے تاب کیوں ہوتی ہو۔ ابھی بچے ہی تو ہیں۔ وقت آیا تو دو چار سال فورتھ ائیر میں دم لے لیں گے"۔

حمیدہ کی ماں نے انہیں ڈانٹا:

تم بہت شریر ہوگئی ہوں نجمہ۔ یہ انشاءاللہ اسی سال پاس ہوں گے"۔

ایک بولی: "پاس نہ ہوئے تو فیل ہو جائیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے"؟

میں نے اس مذاق کے جواب میں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا اور سر اٹھایا، تو ایک اور سنگ آیا:

"سنا ہے آپ گاتے بھی ہے"؟

دوسری بولی: "اور ستار بھی بجاتے ہیں"؟

میں نے برخورداری اور اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا:

"جی نہیں"۔

تیسری جھٹ بولی: چپ رہو جی۔ "انہیں موسیقی سے پرہیز ہے۔ حکیم نابینا نے منع کیا ہے"۔

چوتھی بولی: ''اور ٹھیک بھی تو ہے۔کل گونگے پہلوان نے ایک فلمی گانا سن لیا اور اسے خسر نکل آیا''۔

میں نے آہستہ سے کہا: ''نہیں، نہیں، مجھے موسیقی سے پرہیز نہیں۔سن لیتا ہوں''۔

اس پر نجمہ چلائی: لانا لانا مٹھائی لانا بانٹنی ہے''۔

کسی نے پوچھا: ''کس خوشی میں''؟

نجمہ بولی: ''اس خوشی میں کہ بھائی جان موسیقی سن لیتے ہیں۔ ہے نا خدا کی قدرت''؟

ایک اور بولی: ''اللہ کا شکر ہے موسیقی سے ٹکر نہیں لے لیتے''۔

اس پر قہقہہ پڑا اور ایک طنازسی لڑکی بولی:

''بھئی، انہیں تنگ نہ کریں۔آخر گانا سننا کون سا کارِ ثواب ہے''؟

یہ سن کر خدا جانے میرے منہ سے کیوں نکل گیا تھا''۔

''جی ہاں، شہنشاہ اورنگ زیب تو گانا سننا گناہ سمجھتا تھا''۔

کہیں سے آواز آئی۔۔۔''آپ کو معلوم ہے، ان کے عہد میں موسیقی کا جنازہ نکلا تھا''؟

یہ سنتے ہی میرے قریب بیٹھی لڑکی بلا تامل بولی:

''کیوں نہیں بھائی جان خود اس جنازے میں شامل تھے''۔

اس پر طنازسی لڑکی نے اصلاح دی:

''یہ کیوں موسیقی کے سوگواروں میں شامل ہوتے، یہ تو جہاں پناہ کے ساتھ

بیٹھ کر ٹوپیاں کاڑھتے تھے''۔

اس نوک جھونک کے دوران حمیدہ خاموش بیٹھی رہی، میں سمجھا مشرقی شرم و حیا کا تقاضا ہے اور کھل جائیں گے۔ دو چار ملاقاتوں میں، لیکن اتنے میں ناگہاں، دیوان خانے سے ستار کی نشیلی جھنکار کا ایک مدھم، مگر دل آویز جھونکا آیا۔ معاً حمیدہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے چشم و گوش کا رخ چق کی طرف موڑ دیا۔ اگلے لمحے ستار کے پردوں سے نغمات کا ایک رنگا رنگ دریا بہنے لگا اور حمیدہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چق سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ حمیدہ کے پیچھے تمام لڑکیاں چق سے چمٹ گئیں۔ میں نے چق کے ایک گوشے سے دیکھنا چاہا کہ اس فردوسِ گوش کا خالق کون ہو سکتا ہے؟ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ستار کو گلے لگائے یوسف تخت پر بیٹھا ہے۔ جی ہاں، وہی میرا کم ذات اور کم شکل دوست یوسف، مگر بخدا یوسف اور ستار باہم مل کر مجسم حسن و جمال بن گئے تھے۔ کچھ اس قسم کا حسن جو ستارہ صبح کی لاٹ میں ہوتا ہے، جو شبنم سے لدے ہوئے پھول میں ہوتا ہے، جو معصوم بچے کے دلگداز تبسم میں ہوتا ہے۔ الغرض وہی حسن جو چند لمحے پہلے مجھے حمیدہ کے گلگوں لب و عارض میں دکھائی دیا تھا۔۔ اور ہاں، حمیدہ چق سے لگی بے خود کھڑی تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ حمیدہ کی سہیلیوں کی کھسر پھسر جاری تھی:

''یہ ستار نواز کون ہے''؟

''یہ بھائی جان کا دوست ہے۔ ان کے ساتھ آیا ہے''۔

''کیا خوبصورت ستار بجاتا ہے''!

''کس قدر حسین لگ رہا ہے''!

مجھے شک ہوا کہ یہ آخری جملہ حمیدہ کے منہ سے نکلا تھا۔

آواز آئی: ''حمیدہ ذرا دیکھو تم بھی ستار بجاتی ہو''۔

''اری یہ تو ستار بھی میدہ کا ہے''۔

''یہ ستار ایسے ہی ستار نواز کے قابل ہے''۔

''اللہ قسم حمیدہ، تمہاری ستار ہی نہیں تم خود بھی۔۔۔۔۔''

یہ کہہ کر لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ہم نے با دل نخواستہ جملہ مکمل کر لیا۔۔۔ اور پھر دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے، ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔

جتنی دیر یوسف ستار بجاتا رہا حمیدہ کی محویت کا یہ عالم تھا کہ کسی چکور نے چاند کو اس وارفتگی سے نہ دیکھا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یوسف ستار کے تاروں کی بجائے حمیدہ کے دل کے تار چھیڑ رہا ہے۔ موسیقی ختم ہوئی تو تالیوں کی گونج میں لڑکیوں نے مطالبہ کیا کہ یوسف کو زنانے میں بھیجا جائے۔ یوسف آیا اور اپنے ساتھ اپنی گفتگو کا زعفران بھی لایا۔ ادھر سب سے پہلے حمیدہ نے یوسف کو سلام کیا۔ یہ منظر دل مخزوں سے برداشت نہ ہو سکا اور اپنے روئے زیبا کی روشنی میں چق اٹھاتے ہوئے دیوان خانے میں آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد خان صاحب کھانے کا واسطہ دے کر بمشکل یوسف کو باہر لائے لیکن کھانے پر بھی سب کی نظریں یوسف پر ہی مرکوز تھیں۔ گویا یوسف نوالے نہیں چبا رہا، ستار چبا رہا ہے جو کچھ دستر خوان پر آیا۔ یوسف کے آگے ڈھیر لگا دیا گیا۔ کیا مجال جو کوئی سبزی، کوئی ترکاری یوسف کو اخراج ادا کیے بغیر ہم تک پہنچے، بلکہ ایک ایک چپاتی کے لیے جانا پڑا رقیب کے گھر ہزار بار۔ ویسے یوسف ہمارے لیے بے

شک سراپا تشکر تھا، لیکن اسے کیا معلوم کہ اب ہم تشکر کے تشنہ نہ تھے بلکہ حمیدہ کے حاجتمند تھے۔

کانے کے بعد کی کہانی مختصر ہے۔ رخصت ہونے لگے، تو خان صاحب نے یوسف کا ہاتھ پکڑ مجھ سے کہا:

''یہ ابھی چند روز یہیں ٹھہریں گے آیئے آپ کو اسٹیشن چھوڑ آؤں''۔

پلیٹ فارم پر خان صاحب مجھے خدا حافظ کہنے ہی والے تھے میرے ڈبے کے ایک اور مسافر نے انہیں دیکھ لیا اور گاڑی سے اتر کر ان سے تپاک سے مصافحہ کیا، جب گاڑی چلی، تو میں نے ہم سفر سے پوچھا:

''آپ خان صاحب کو جانتے ہیں''؟

بولا: ''انہیں کون نہیں جانتا؟ مہاراجہ بانڈی پور کے درباری گویا ہے''!

سجاد حیدر یلدرم

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گذر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں کو بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ دردسے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا اور جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت تھا، مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے، چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہیے یہ تھی

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ہر ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤ، مگر کوئی خدا کا پیارہ مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانوں! میں غریب الوطن

ہوں، میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندوں! میری سنو، میں غریب الوطن ہوں''۔

فقیر یہ کہتا ہوا اور جن پر ان کے قصے کا اثر ہوا اس کی خیرات لیتا ہو آگے بڑھ گیا، لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا ۔یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے اور وہ جاہل ہے۔میں اچھے لباس میں رہتا ہوں اور وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدر کہاں اچھی ہے۔اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ میں رات دن اسی فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ با وجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نما یاں تھی، بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے ؟اور آخر کار میں بظاہر اس نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔وہ حسرت سے کہتا ہے کہ ''میرا کوئی دوست نہیں''۔ میں حسرت سے کہتا ہوں ''میرے اتنے دوست ہیں۔اس کا کوئی دوست نہیں''۔اگر یہ سچ ہے تو اسے مبارکباد دینی چاہیے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں۔اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا، لیکن کیا اس کا قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں

جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان اپنے ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں، مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمنیان سے قلمبند کر سکوں یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اسے سوچ سکوں، کیا فقیر دن دھاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:

''بھائی جان دیکھو پرانی دوستی وسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیہ قرض دے دو''۔ کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ لطیفہ پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خوامخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہوحق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے نہیں جانا پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ! کیا اس بات پر بھی شکر یہ ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ کونسی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے آتے ہیں اور میری خیر طلب کرتے ہیں، مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے

فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے۔ مجھے نقصان چاہے مجھ پر نفرین کی جائے، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ احباب کا جمِ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی تو بعض نہایت عزیز دوستوں کا چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو"۔

مثلاً میرے ایک دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں یہ نہایت معقول آدمی ہیں، اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے، مگر حضرت کی خلقت میں یہ دخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا، جب آئیں گے تو شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان ک آنا بھونچال سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں "کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں۔ ان کے آنے کی خبر مجھے دور سے ہو جاتی ہے باوجود یہ کہ میرے پڑھنے لکھنے کا کمرہ چھت پر ہے، اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں" تو چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) "خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے! توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا"۔

یہ کہتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا (آج تک انہوں نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا) آندھی

کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

''اہاہاہاہا! آخر میں نے تمہیں پکڑ لیا، مگر دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا مت بند کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک ایسا شخص ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب میں جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں، ایک منٹ ٹھہرنے کا، تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ ''خدا حافظ'' یہ کہہ کر وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کل خیالات بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم انہیں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑ جائے۔

اور لیجئے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں، لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں، مگر تحسین آئے

ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے سوا اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں، میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر ہی نہیں نکلتے، اگر موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں۔ ''ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا، منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے'' اگر پالٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کر تے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ ''مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں''۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں، تو اپنے لڑکوں کو ساتھ ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے کہ ''طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی''؟ کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ذکر ہی کرتے ہیں۔ اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریقِ مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں شاکر صاحب کا ذکر خصوصیات سے کروں گا۔ کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضوع سلیم پورہ کے رئیس اور ضلع بھر کے نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے کا اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امراء کے شایانِ شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کر ''شہر میں رات دن شورو

شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصے رہنے سے تبدیل آب وہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمر خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے۔ جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کر چلے آنا دیکھو، میری خوشی کرو''۔

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر کیسے انکار کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہولیا۔ ایڈیٹر ''معارف'' سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ ہیں ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی کام شروع کر دو اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے پھر وہاں سے دو میل احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ احمد طالب سے ملائیں گے''۔

میرا ماتھا وہیں ٹھکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں

تھا، وہ مجھے یہاں بھی نہیں ملے گی۔

میں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لیے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر سیاہی کا ایک قطرہ بھی گناہِ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد۔ جاذب کاغذ کا ایک مخمل جلد کی کتاب، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی۔ میرے پر اں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفسِ کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کر دیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میری بیت کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لیے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن تن تن تننتا، تھن، تا تن، تن تن تن میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و ما فیہا کی خبر نہ تھی۔ یکا یک اس تن تن نے چونکا دیا۔ ہیں! یہ کا ہے ہے؟ افوہ! اب میں سمجھا۔ میرے کمرے کے قریب شاکر خان صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے اس وقت ستار سے شوق فرما رہے تھے۔ بہت خوب

بجا رہے ہیں۔

''اس کی گلی سے آئے کیوں''؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید آہا مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض''؟

واہ وا! سبحان اللہ! کیا غزل چھیڑی ہے! ''اے ترک سوار نواح عرب یثرب نگری پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے۔ وہ حبیب مرا مجھے وا کی کھبر یا لا دینا''۔ بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محفوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہوگئی تو مجھے اپنے کام کا خیال آیا۔

''اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو، میرے دماغ میں پھر آؤ''۔ یہ کہہ کر میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا ہی تھا ''ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور وفکر کرتے ہیں، اتنا ہی اس کی مشکلات کی مثل۔۔۔''

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا''۔۔۔ ریگ دریا کے اندازہ نہیں کرسکتے ''؟

ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی۔ اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہیں تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتا بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ۔

اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید
مجھ سے صبا کو کیا غرض''؟

مگر میرا تو صبا کے نام نے ہی دماغ خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہتِ زلف لاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہر حال مجھے وہ فقرہ از سرِ نو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کی بجائے کچھ اور ہونا چاہیے۔

ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں۔ اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پر کرنے کے لیے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں سے کہاں رہے''۔ یہ کیا؟

''جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے''؟ یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے''؟ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے آیا ہے۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنے چاہیئے۔ اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوتی اور بظاہر۔۔۔'' کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

''کون ہے''؟

''میں ہوں شبن، سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لیے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار آپ کو ان سے ملانا چاہتے ہیں''۔

بادل نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی

صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ شبن صاحب نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ پھر میری یاد ہوئی ہے۔ ہمارے، میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا، جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل میں منگا کر دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔ بہر اروقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع ہو گیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا کہ کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:

''ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے **ملک** کہ قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئ معلومات اور نئ دنیا (گو وہ علمی ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں۔۔۔۔''

دروازے پر پھر دستک۔۔۔۔''کیا ہے''؟۔۔۔۔۔''اچھا''

دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں خطرے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں کے باوجود۔۔۔''

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

''ہاں''

''حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے''۔

''افوہ مجھے خیال نہیں رہا۔سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں ۔میں پھر کھالوں گا اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں''۔

''آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے ۔یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسا کر کے خطرات سے بچانے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں ۔زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ۔۔۔''

دستک ۔''کیا ہے''؟

''سرکار کہتے ہیں، اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا''۔

اچھا بھئی ۔لو ابھی آیا''۔

یہ کہہ کر میں کھانے کے لیے جاتا ، سب سے معذرت کرتا ہوں ۔میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ''چہرے پر تھکن محسوس ہوتی ہے ۔کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو؟ میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں''؟

سوائے اس کے آمنا وصدقنا کہوں اور کیا سکتا تھا۔اب کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں'': سہ پہر کو تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو''۔

واپس کمرے میں کر تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کرلوں اور پھر لکھنا شروع کردوں، مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں:

زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ''۔

اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں

تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہیں۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں دماغ نہایت صحیح ''زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں۔ تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ ''آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے''۔ میں سچی بات کہوں گا کہ کچھ بھی نہیں لکھا''۔ تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ ''آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیں قسمیں

مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا ،

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ غصے اور رنج میں آ کر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکر اور احسان فراموش کہا جاؤں گا، مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے، مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں ان احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی

بہت سے باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں۔ میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے آتے ہیں۔ ایک صاحب جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے ملتے ہی کہتے ہیں ''میاں عرصے سے میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری دعوت کروں'' مگر اپنی خواہش کو کبھی پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست آتے ہیں وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں۔ وہ جب آتے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما ہیں اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں

''مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا''

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات کا اظہار کروں۔ دروازے پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے لگا۔ کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لیے اس کے شکریے میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں جب آتے ہیں مجھ پر ناراض ہو

تے ہیں کہ ''تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے'' میں جانتا ہوں کہ اس وقت میں بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لیے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

''آیئے آیئے، مزاج۔ عالی بہت دن بعد تشریف لائے''۔

احمد جمال پاشا

ٹائم ٹیبل

جب اسکول کھل گئے، پڑھائی شروع ہوگئی اور سبق یاد کرنے کا زمانہ آ گیا تو رفتہ رفتہ ہم نے بھی طے کیا کہ اب تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ پروگرام سے میرا مطلب ہر سال یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک ایسا نظامِ حیات جو عملی جدو جہد کا ایک ایسا زندہ جاوید نمونہ ہو جس سے طالبِ علموں کی آنے والی نسلیں ابد الا آباد تک فیض یاب ہوتی رہے اور جس میں اگر مناسب حد تک تبدیلیاں گوارا کرلی جائیں تو وہ ہر قسم کے پیشہ ور اور پرائیویٹ حضرات وخواتین کے لیے قابل قبول ہو سکے جو عملی زندگی میں قدم قدم ٹھوکریں کھاتے رہنے کے باعث کچھ اس قسم کی کتابیں ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو''۔ کامیابی آپ کے قدم چومنے کے لیے بیقرار ہے''۔ معرفت چھنتا مل بکسیلرز اینڈ پبلیشرز ''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں''۔ ''رہنمائے روزگار باتصویر'' ''مکمل مرغی خانہ'' ''رضیہ کا شاہی دستر خوان'' کراماتِ الوعرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی' 'پڑھنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور خالی وقت میں دریا میں چھلانگ لگانے اور خودکشی کرنے کے تازہ ترین طریقوں پرغور کرتے رہتے ہیں۔

اس پروگرام میں اتنی رعایت ضرور کی جاتی ہے کہ یہ گزشتہ سال سے ذرا مختلف ہو ورنہ یہ بالکل اسکولی بن کر نہ رہ جائے۔'' اسکولی سے میری مراد یہ

میرے اپنے اسکول سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پرانا چپڑاسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی گھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں اور وہ دن دھاڑے اونگھا کرتا ہے۔اسی سبب اکثر گھنٹا بھی اونگھ جاتا ہےاور اس کی چونکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پیشتر اور کبھی بعد میں بجتا ہے جس سے اسکول کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔اگر لڑکے یا اساتذہ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ جائے مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا ہے ۔گھنٹہ تو اسکول کے سب سے زمہ دار افراد کو بجانا چاہیے جو اسکول کے اعمال و افعال کا جوابدہ ہو اور وہ فرد واحد سوائے ہیڈ ماسٹر صاحب کے اور کون ہوسکتا ہے ۔ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر یہ خوشگوار فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹس اور وائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے اور ہونے والے بے شمار فائدہ کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اس طرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچالیں گے جس کو آج کل فیشن کی اصطلاح میں ’’چھوٹی بچت‘‘ کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہےاور شہرت کا باعث ہوسکتا ہے۔’’اسکولی ‘‘میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن کا یادداشت سے براہ راست تعلق ہو کرتا ہے ۔مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے۔ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے۔جس کے سامنے ’’بمبا‘‘ لگا ہوا ہے اور انٹرول میں وہاں دو چار خوانچے والے بھی اپنا سودا کے سر پر وہ کمرہ جسے عام میں ’’اردو کلاس‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس کی پہچان اس کے واحد مولوی صاحب ہیں جو صبح سے آکر پڑھنا، اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی گوشے پر ہماری یادداشت کی تہمت ہے کہ یہاں پر ہمارے بچپن سے اردو

پڑھائی جا رہی ہے، مگر مسلسل دیکھنے کے بعد بھی آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کون پڑھا رہا اور کون پڑھ رہا ہے۔ تقریباً اسی قسم کی مثالیں ہمیں دوسرے گوشوں سے دوسرے مضامین کے بارے میں آسانی سے مل جاتی ہیں، مگر اس پر کچھ کہہ اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ اسی اسکول نے بڑے بڑے نامور پیدا کیے اور پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔

میرا یہ خود کاشت پروگرام ایک باضابطہ ٹائم ٹیبل کی صورت میں اختیار کر سکتا ہے اور ٹائم ٹیبل سے مختلف ہو سکتا ہے جو عموماً اسکول والے زبردستی طلبا کے اوپر لاد دیا کرتے ہیں۔ اسکول والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نہایت انسان کامل، قسم کا ٹائم ٹیبل پیش کر کے کچھ فاضل ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت مقرر کر دیا گیا اس کے آس پاس گھنٹہ ضرور بجے گا۔ اندازے سے تھوڑی دیر سویر میں لڑکے ضرور آئیں گے۔ اگر ماسٹر صاحبان غیر ارادی طور پر آ گئے ہیں تو وہ وقت گزاری کے طور پر ادھر ادھر کے بے ربط سوالات، سیاست حاضرہ پر تبصرے، موسم پر رننگ کمنٹری، ہیڈ ماسٹر وغیرہ کے اعمال و افعال پر بہت سخت نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ (جو اگر ہم لوگ کریں تو ضرور حرام خور کہلائیں گے) بار بار بے اختیار اپنے معصوم ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کریں گے۔ ایسے موقعوں پر تجربہ ہے کہ اگر تھوڑا بہت شور ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اس قسم کی "لتری" کارروائیوں میں اگر تھوڑی سی تبدیلی محسوس بھی ہوتی ہے تو وہ فن کے اعتبار سے ورنہ تکنیک تو بالکل وہی رہتی ہے۔ مثلاً بڑی جماعتوں میں غیبت کرنے والے کے منہ سے جماعت کے اندر خاص طور پر اور جماعت کے باہر عام طور پر منطق،

استدلال، ہیت، نقد، شعور، لاشعور اور بے شعور وغیرہ مبہم اصطلاحیں سنائیں دیتی ہیں اور عام طور اس کا اثر آنے والے امتحانوں پر بہ حیثیت مجموعی بہت برا اثر پڑتا ہے۔

یہ تو عمل ہوا اور اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پر عمل بھی کرنا چاہیں تو کبھی لڑکے غائب اور کبھی استاد، اجتماع ضدین کے اس عمل میں سارا سال گذرا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ اسی ٹائم ٹیبل کو نئے کاغذ پر ٹائپ کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا ہے، تاکہ تازہ واردانِ بساط بھی پچھلی بہاروں سے مفت میں فیض یاب ہو سکیں۔

اس قسم کے ٹائم ٹیبل سے ہم کیوں علاقہ رکھیں جس میں صبح شام تک ایک ہی استاد ایک ہی لڑکے اور ایک ہی قسم کے کمرے ہونے کے سبب ہم فلم کی اصطلاح میں نئے چہروں کو بالکل ترس جاتے ہیں۔ استاد لڑکوں کی نقل و حرکت سے نالاں، لڑکے استاد کی صوورت سے بیزار مگر دونوں ایک دوسرے سے رحم کے طالب، ایک دوسرے کے فعل پر رحم آ رہا ہے مگر فعل جاری ہے، کیونکہ ٹائم ٹیبل بتاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے بجھ دیے گئے ہو تو اب کم سے کم چراغ جلے تو گھر لوٹو۔ یہ ٹائم ٹیبل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہ عام طور پر ٹائم ٹیبل ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ریلوے کا ٹائم ٹیبل جسے خریدنے کے بعد آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مصرف کیا ہو، جس کی وجہ سے ہم ان لوگوں کو اکثر حسد کی نگاہ سے دیکھا ہے جو اس کو سونگھ کر سارے دن کی آنے اور جانے والی تمام گاڑیوں کا زائچہ زبانی کھینچ دیتے ہیں ۔اس قسم کے ٹائم ٹیبل پر سوائے عمل کے سب کچھ ہو سکتا ہے اور عمل اس وجہ سے

نہیں کہ یہ سفلی عمل کے مترادف سمجھا گیا ہے جس میں ناکامی کی صورت میں عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے نقل سے عمل کی نوبت آنے ہی نہیں پاتی۔

ہاں تو ایک تو ہوا یہ ٹائم ٹیبل جس کو ہم زیادہ زیادہ دیکھتے دیکھتے کسی نہ کسی دن پنسل سے نوٹ کر لیتے ہیں یا پھر کسی لڑکے سے نقل مل جاتی ہے، مگر اس کا احساس ہو جائے کہ ہم غلطی سے حساب کے بجائے جغرافیہ کے کلاس میں اپنے کو پا رہے ہیں یا ہیں۔ سیکنڈ ایئر میں اٹھائے فرسٹ ایئر سے جا رہے ہیں یا خالی گھنٹے میں تواریخ کی کلاس لگنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور تواریخ کے گھنٹے کو خالی سمجھ کر گھر کھانا کھانے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر ہنسی اڑائی جائے، سب کو ہنستا دیکھ کر ہم بھی ہنس دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج پھر گھر جا کر ہم کو ٹائم ٹیبل کی اصلاح کرنا ہے تاکہ اپنے ذات اور کامیاب قسم کے پروگرام بنانے میں حتی الا مکان مدد مل سکے۔ ایسے آزمائشی دور میں جبکہ ارادہ پکا، نیت صاف، دل حرکت و عمل پر آمادہ ہو، ترقی کرنے کی خواہش بیدار ہو کر انگڑائیاں لیتی ہو اور اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ نیچے نہ بیٹھنے دیتا ہو تو گھر پر سارا وقت ٹائم ٹیبل کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے جس کو ہم نے کبھی اسکول میں نقل کیا تھا اور جس کی ضد میں اب ہم کامیاب ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ مصیبت کے دن سدا نہیں رہتے اور کسی کی محنت اکارت نہیں جاتی اور آخر کار ہماری یہ سپاہیانہ جدوجہد رنگ لاتی ہے۔ وہ ٹائم ٹیبل کسی میز یا الماری یا کرسی کے نیچے کسی پرچے، کتاب کے ٹائٹل پیج، سینما کے اشتہار یا اقتصادیات کی کاپی کے اس مقام پر بالکل گچ پچ حالت میں جہاں پر

ہم نے حساب کے گھنٹے میں کاٹنا گولا کھیلا تھا اور پچھلی اتوار کو اسی صفحہ کے بائیں طرف دھوبن کے کپڑے لکھے تھے۔ ہم کو ہمارا گمشدہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے۔ جس پر مسلسل غور و فکر کے بعد اکثر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آخر یہ کیا کہا گیا ہے۔ خود اپنی عبارت ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ لکھا کچھ ہوتا ہے اور پڑھنے میں کچھ آتا ہے اس قسم کی مبہم عبارتوں کا پڑھنے لکھنے پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے ناشدنی موقعوں پر وہی حصہ سب سے بہتر ہے جو میں جلدی میں لکھنا بھول گیا تھا۔ مثلاً ایک بالکل موٹی سی بات ہے کہ اب رہ رہ کر یاد کیا جا رہا ہے کہ انٹرول کہاں ہے؟ باوجود اس کے کھو جانے کے ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ کہیں نہ کہیں پر انٹرول بھی ضرور تھا مگر جو شخص دن میں تین چار انٹرول منائے اس کے لیے یوں بھی اصل انٹرول کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصلی انٹرول اس کو کہتے ہیں جس کا وقفہ مختصر اور بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر کوئی روک تھام نہیں ہوتی، مگر اس وقت تو انٹرول کی تلاش خود ایک انٹرول ہے۔

غرض ایک تفصیلی چھان بین، تنقید و تحقیق، غور و فکر کے بعد ہمارے ذہن میں عین ہمارے تصورات کے مطابق ایک نہایت ہی واضح نقشہ اس پروگرام کا بن گیا جس کے نہ ہونے سے ہم کو اپنی زندگی عرصے سے نہایت فضول معلوم ہونے لگی تھی اور اکثر اس کے مصرف پر ہم اپنے دل میں غور کرتے ہیں اور دماغ سے سوالات کرتے اور جواب نفی میں آتا، تن بدن میں مایوسی کی ایک لہر کو دوڑنا پڑتا، بے اختیار اپنی بے بسی کا خیال آ دھمکتا ہے۔

اس پروگرام نے ہمارے خون کی روانی میں ایک تیزی پیدا کر دی۔ ایسی تیزی

جس نے نوجوانوں کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا لہذا بے اختیار اکڑ کر بیٹھ گئے۔ دو چار بار بے اختیار پہلو بدلے، عجب عجب منہ بنائے، لیکن اگر کوئی ہم کو اس وقت دیکھتا تو قطعی یہ اندازہ لگالیتا کہ اس وقت ہم بے حد خوش وخرم ہیں۔ ایسی فطری خوشی جو طبیعتوں کو موسیقی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ شگون کے طور پر ایک آدھ سیٹی بھی بجا ڈالی اور اس کی دھن پر ایک فلمی راگ بھی چھیڑ دیا، کیونکہ سر کے اوپر سے ایک بڑا بوجھ اتر چکا تھا اور اب جو کچھ رہ گیا تھا اس کی حیثیت دفتری خانہ پری سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے انجام دینے میں اب ہم قطعی جلد بازی سے کام لینا نہ چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے طبیعت کو لطیف بنانے کے لیے نہانے ہی میں اپنی بہتری سمجھی نہانے کے بعد بہترین کپڑے پہنے، اخبار دیکھا، کون سا فلم کہاں لگا ہے۔ ایک دیکھا ہوا فلم دیکھنے کی خواہش دوبارہ پیدا ہوئی۔ سائیکل اٹھائی سینما کا رخ کیا۔ موڈ اچھا اور طبیعت آمد پر تھی۔ اس لیے اکثر راستے میں سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیتے ہیں اور سائیکل بالکل ایسی چلنے لگتی جیسے "پاکستانی سیاست" پھر جلد ہی اس کی باگ قابو میں لانے کے لیے ہینڈل کو دوبارہ اپنی کمان میں لے لیا۔ راہ گیر مطمئن ہو گئے اور تماشائی بھی منتشر۔

فلم دیکھ کر لوٹے تو ایک قسم کی تکان سی محسوس ہوئی اس لیے پروگرام او نگھنے میں تیار کرنے کے ارادے سے سو گئے۔ شب و روز اسی طرح گذرتے رہے۔ ایک ماہ کی مسلسل محنت، لگاتا غور وفکر کے بعد ہم نے ایک پروگرام تیار کر لیا، اتنا مکمل "ٹائم ٹیبل" غلطیاں امتحان پاس کرنے کے سلسلے میں ہم سے سرزد ہو گئی تھی ان کے دوبارہ ہونے کا احتمال نہ رہے۔ غلطیاں ہونا برا نہیں، لیکن اگر غلطی نئی ہو کیا

مضائقہ ہے۔ اس میں شرمندگی کا موقع ذرا کم رہتا ہے ورنہ کچھ مناسب نہیں رہتا ۔

ہمارا ٹائم ٹیبل جنگی پیانے پر تیار گیا تھا اس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پروگرام کیا اچھا خاصا کرفیو آرڈر تھا جس کا نفاذ مثل مارشل لاء کیا گیا تھا۔ اس ٹائم ٹیبل میں جس قدر مفید مشورے ممکن ہو سکتے تھے ہم نے اپنے آپ کے دے ڈالے تھے۔ اپنی صحت اور اصلاح کا کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا تھا کہ یہ ٹائم ٹیبل ہے یا یا کسی لیڈر کی الیکشن سے قبل ہونے والی تقریر۔ یہ دراصل کچھ حسبِ ذیل سا تھا مثلاً روزانہ:

۴ بجے (صبح کاذب) زن سے اٹھ بیٹھنا (اگر ممکن ہو تو 3/1/2 ہی بجے سے) اگر بیدار ہونے کے روزمرہ میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو بیداری کے لیے احتیاطاً گھڑی کا الارم لگا دیا جائے (ہر طرح کی ناکامی کی صورت میں چوکیدار کو آواز لگانے کی ہدایت کر دی جائے)

۰۰ ـ ـ ـ ۴ تا ۵ ـ ـ ـ ۴ حوائج سے فراغت حاصل کرتے، غسل کرنا عبارت کرنا۔

۵ ـ ـ ـ ۴ تا ۱۵ ـ ـ ـ ۴ میل بھر کی دوڑ اور صبح کی سیر (واپسی پر چنے کا پانی پی کر پڑھنے بیٹھ جانا)

۱۵ ـ ـ ـ ۴ تا ۱۵ ـ ـ ـ ۷ دل لگا کر پڑھنا۔

۱۵ ـ ـ ـ ۷ تا ۴۵ ـ ـ ـ ۷ ناشتہ کرنا۔

۲۵۔۔۔۷ تا ۳۵۔۔۔۹ وہ تمام مضامین پڑھ ڈالنا جو آج اسکول میں پڑھائیں جائیں گے اور اسکول کا کام کرنا۔

۳۵۔۔۔۹ تا ۴۵۔۔۔۹ کھانا کھا کر کپڑے تبدیل کر کے کتابیں کاپیاں درست کر کے اسکول روانہ ہو جانا تا کہ ٹھیک ۱۰ بجے اسکول پہنچ جائیں۔

۰۰۔۔۔۱۰ تا ۰۰۔۔۔۴ اسکول میں، جس میں انٹرول میں کھیل اور خالی وقت میں مطالعہ فطرت میں دلچسپی لینا، اخبار پڑھنا، جن استادوں کے پاس امتحان کی کاپیاں جانے کا احتمال ہو اس سے تعلقات کرنا، ان کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ (مگر ایک مناسب حد تک)

۰۰۔۔۔۴ تا ۱۵۔۔۔۴ اسکول سے گھر واپس آنا، کپڑے تبدیل کر کے ناشتہ کرنا۔

۱۵۔۔۔۴ تا ۳۵۔۔۔۴ سیر و تفریح۔

۳۵۔۔۔۴ تا ۰۰۔۔۔۸ بجے شب: وہ سب پڑھ ڈالنا جو آج پڑھ ڈالنا جو آج پڑھایا گیا تھا۔

۰۰۔۔۔۸ تا ۵۔۔۔۸ بجے شب: رات کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنا۔

۵۔۔۔۸ تا ۵۔۔۔۱۲: مسلسل سبق یاد کرنا۔

۵۔۔۔۱۲ تا ۴ بجے صبح: سونا۔

ہفتہ کے دن اسکول سے واپسی پر اگر سینما یا میچ دیکھنے چلے جائیں یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے لیے کافی ہاؤس وغیرہ کا ایک آدھ چکر لگا لیا جائے تو مناسب نہ ہوگا، لیکن مناسب ہوگا کہ حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ اتوار اور

چھٹیوں میں درمیانی وقفہ (۱۰ تا ۴) میں امتحان کے پرچے تیار کرنا، گھڑی سامنے رکھ کر ان کی مشق کرنا۔ حل شدہ پرچے پڑھنا، گیس ورک تیار کرنا، ماسٹر صاحب سے اپارٹمنٹ پوچھنے جانا وغیرہ۔

☆

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک ایسا جامع پروگرام تھا کہ اس کو محض دیکھ کر ہی بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر اس ٹائم ٹیبل کے کچھ حصوں پر عمل کرنے کی بھی کوشش کی ہی نہ جانے کیسے کیا ہوا کچھ کہا نہیں جا سکتا، مگر اتنا ضرور علم ہے کہ اسی غور و فکر میں رفتہ رفتہ سال تمام ہوا اور جو کشھ نتیجہ بر آمد ہوا۔ اس نے دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اس ''ٹائم ٹیبل'' میں کیا ایسی چیز پھر بھی رہ گئی تھیں جن کو اگر شامل کر دیا جائے تو ایک کامیاب ''ٹائم ٹیبل'' تیار ہو جائے جس پر عمل کر کے میرا پہلا۔۔۔ ''دن ایر پلان'' کامیابی کا منہ دیکھ سکوں۔

☆

The End-------------------- ختم شد